عجائباتِ عالم
کا
انسائیکلوپیڈیا

تحقیق وتدوین: عبدالوحید

عجائبات عالم کا انسائیکلوپیڈیا

تحقیق و تدوین
عبدالوحید

نگارشات پبلشرز
حبیب ایجوکیشنل سنٹر 38-مین اردو بازار لاہور | 24- مزنگ روڈ' لاہور
فون 7240593 فیکس 042-7354205 | فون 7322892 فیکس 042-7354205
e-mail:nigarshat@yahoo.com

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: عجائبات عالم کا انسائیکلوپیڈیا

تحقیق وتدوین: عبدالوحید

ناشر: آصف جاوید

برائے نگارشات پبلشرز، 24- مزنگ روڈ، لاہور

PH:0092-42-7322892 FAX:7354205

مطبع: المطبعۃ العربیۃ، لاہور

سال اشاعت: 2006ء

قیمت: =/200 روپے

فہرست

قدیم وجدید عجائبات عالم	7
اہرام مصر	9
ابوالہول	15
قدیم مصر	19
بابل کے معلق باغات	21
ڈائنا کا مندر	24
سکندریہ کا روشن مینار	26
دیوار چین	29
زیوس دیوتا کا مجسمہ	34
مسولیس کا مقبرہ	37
جزیرہ رہوڈز پر سورج دیوتا کا بت	39
تاج محل	42
جامع الازہر	48
مسجد الحرام	52
الحمراء	59
ایفل ٹاور	62
پیسا مینار	67
ٹاور آف لندن	70
امریکہ کا مجسمہ آزادی	74
مادام تساؤ کا مومی عجائب گھر	77
حاجیہ صوفیہ	82
سیسٹائن چیپل	85
سینٹ پال کیتھڈرل	88

کرائسٹ دی ری ڈیمر	91
موہنجوڈرو	94
ممنوعہ شہر	97
کھیوڑہ ایک عجوبہ	100
کریملن	103
ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ	106
ماؤنٹ رشمور	109
بگ بن	112
سڈنی کا اوپیرا ہاؤس	114
وہائٹ ہاؤس	117
لینن گراڈ	120
پیٹرا	123
صحرائے اعظم	126
دریائے نیل	130
دریائے ایمیزون	134
انکا	137
اشکالون	139
جزیرہ ماؤ	144
پینٹاگون	146
ویٹی کن	148
لندن اور ڈاؤننگ سٹریٹ	152
ویسٹ منسٹر ایبے	155
بکنگھم پیلس	157
آستانہ نورالایمان	159
زم زم	161

مسجد نبویؐ	165
کوہِ نور ہیرا	168
وادیٔ کشمیر	172
فلسطین	175
نیو یارک	185
گولڈن گیٹ برج	188
سی این ٹاور	191
سائبیریا ریلوے لائن	193
بحرالکاہل	195
بحیرہ مردار	197
ماؤنٹ ایورسٹ	200
قطب جنوبی	203
قطب شمالی	206
نہر پانامہ	208
آئس لینڈ	215
گرین لینڈ	218
مالٹا	220
ہانگ کانگ	230
ناؤرو	226
مقدس جاپانی جزیرہ	229
استنبول	232
اینجل فالز	235
نیاگرا آبشار	237
اینگکر واٹ	239
کانگریس لائبریری	242

برموڈا ٹرائینگل	247
پیٹروناس ٹاورز	252
شاہ فیصل مسجد	255
اکاشی کیکیو برج	258
پتھر کے زمانے کا گاؤں	261
وینس۔دی گرینڈ کینال	263
دمشق	266
ریوڈی جنیرو	269
ماؤنٹ کلمنجارو	271
وکٹوریہ آبشار	273
جیجو آئی لینڈ	275
ہائیڈ پارک	277
چینل ٹنل	278
رانی کوٹ	281
نامبا	284
ڈزنی لینڈ	288
جزائر کک	293
بالی	296
تبت	298
بوڈاپسٹ	301
ایریزونا	303
تائی پیہ۔101	305
برج العرب	307
برج دبئی	309
کتابیات وحوالہ جات	312

قدیم و جدید عجائبات عالم

یہ دنیا بہت سی حیرت انگیز چیزوں، دلچسپ لوگوں اور عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔ یہ عجائبات تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو شمار کرنا بہت مشکل کام ہے۔ قدیم و جدید دنیا میں بعض عمارتیں ایسی موجود ہیں جنہیں عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ مثلاً اٹلی کا جھکتا ہوا مینار۔ برطانیہ کی مشہور عالم گھڑی بگ بین۔ انڈونیشیا میں واقع گوتم بدھ کا مندر باربوڈور۔ نیویارک کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ۔ بارسلونا (سپین) کا گائیڈس کیتھیڈرل۔ آگرہ کا تاج محل۔ سڈنی کا اوپیرا ہاؤس۔ عظیم دیوار چین۔ پیرس کا ایفل ٹاور۔ مصر کے حکمران فراعنہ کے مخروطی مقبرے جن میں غزہ کا مقبرہ شہرت رکھتا ہے۔

سینکڑوں سال پہلے زندگی بہت مشکل تھی۔ لوگوں کے پاس مشینی آلات کو چلانے کا علم نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے عظیم الشان عمارتیں، مجسمے اور یادگار مقبرے تعمیر کیے۔ جن کی جسامت دیوقامت اور ڈیزائن بہت انوکھے ہیں۔ یہ ایک حیران کن اور انوکھی بات ہے کہ انہوں نے یہ کیسے تیار کیے۔ اسی لیے ان میں سے چند دنیا کے اہم عجوبوں میں شمار ہوتے ہیں۔

جب انسان کے شعور نے آنکھیں کھولیں تو اس وقت کی مہذب اور ثقافتی دنیا میں دو ملک بڑی اہمیت رکھتے تھے یونان اور روم (سلطنت روما)۔ ان دونوں سلطنتوں نے اس وقت حسب ذیل عمارتوں کو دنیا کے سات عجائبات قرار دیا اور وہ انہیں بڑی اہمیت دیا کرتے تھے۔ ان میں (1) اہرام مصر۔ (2) بابل کے معلق باغات۔ (3) ڈائنا کا مندر جو ایشیائے کوچک کے مقام ایفی سس میں واقع تھا۔ (4) یونان کے مقام اولمپیا میں ایستادہ زیوس دیوتا کا مجسمہ۔

(5) شاہ ہیلی کارناسس کا شاندار مقبرہ جو ایشیائے کوچک میں واقع ہے۔ (6) سورج دیوتا کا دیو پیکر مجسمہ۔ (7) اسکندریہ میں فراعنہ مصر کا تعمیر کردہ لائٹ ہاؤس (روشنی کا مینار)

یہ تمام عجوبے اپنے اپنے دور کی داستانیں سناتے ہیں۔ اہرام مصر کی تعمیر دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ جنوری 2006ء میں دنیا بھر کے لوگوں کو مدعو کیا گیا کہ وہ دنیا کے سات نئے عجائبات کے انتخاب کے لیے رائے دہی میں حصہ لیں۔ یہ رائے دہی سوئٹزرلینڈ کی ایک نجی تنظیم ''دی نیوسیون ونڈرز فاؤنڈیشن'' نے کروائی۔ سات عجائبات کے انتخاب کے لیے دنیا کی 21 اہم تنصیبات کو منتخب کیا گیا۔ ان 21 عمارات میں قدیم رومی اکھاڑا، اردن کا قدیم شہر پیٹرا۔ برطانیہ کا سٹون ہیچ اور دیوار چین شامل ہیں۔

عجائبات کی فہرست میں کچھ جدید عمارتیں بھی شامل ہیں۔ مثلاً پیرس کا ایفل ٹاور۔ امریکہ کا مجسمہ آزادی۔ سڈنی کا اوپیرا ہاؤس۔ مصر کا اہرام وہ واحد عجوبہ ہے جو پرانے سات عجائبات میں سے ایک ہے جو اس نئی فہرست میں بھی شامل کیا گیا۔ اب تک جو سات عجائبات قدیم جانے جاتے ہیں ان کا انتخاب قریباً دو ہزار سال قبل ایک یونانی فلسفی فلون (Floon) نے کیا تھا۔

❁ ❁ ❁

اہرام مصر

(The Great Pyramid of Giza)

ایک اہم اور قدیم ترین عجوبہ

دنیا کے سات مشہور اور قدیم ترین عجائبات میں ''اہرام مصر'' (Pyramids) ایک اہم اور قدیم ترین عجوبہ ہے جو ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی آج تک تقریباً صحیح سلامت موجود ہے۔ زمانہ قدیم کے اس عجوبے نے آج کے ترقی یافتہ دور کو بھی شکست دے دی ہے۔ ان اہرام کی تعمیر میں استعمال کیے گئے سامان، پیمائش کی درستی اور ان پر درج پیش گوئیوں نے ساری دنیا کے سائنسدانوں، اہل علم اور ماہرین کو حیران کر رکھا ہے۔ ان اہرام کو تعمیر ہوئے تقریباً 3 ہزار سال گزر چکے ہیں اور ان کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس سے یہ امر بھی پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ خود زمین کے محل وقوع میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہوا۔

اہرام مصر کی عمارتیں مربع بنیادوں پر قائم ہیں مگر ان کے پہلو تکونے ہیں۔ یہ تکونیں اوپر جا کر ایک نقطے پر مل جاتی ہیں۔ اہرام مصر کی ان عمارتوں کی عظمت اور کاریگری پر دنیا کے مختلف ماہرین ہزار ہا سال سے غور و فکر کر رہے ہیں۔ ابھی تک حتمی طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اہرام مصر کے اصل معمار کون تھے؟ ان کے بنانے کا مقصد کیا تھا؟ یہ کس دور میں تعمیر ہوئے؟ اور یہ بنائے کس طرح گئے؟ تاہم اس بات پر سب ہی کا اتفاق ہے کہ اہرام مصر شاید زمانہ قبل از تاریخ کے ترقی یافتہ علوم سائنس کا ایک نادر کرشمہ ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت

سے کم از کم دو ہزار برس قبل وجود میں آیا۔ یہ سب کے سب مینار قدیم مصری شہر ممفس کے قریب ہی صحرائی چٹانوں میں واقع ہیں۔ سب سے بڑا مینار بھی باقیوں کی طرح ایک چٹانی مربع چبوترے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ جس پر باہر کی طرف سیڑھیاں کھدی ہوئی ہیں جو بتدریج چھوٹی ہوتی چلی گئی ہیں یا یوں سمجھئے کہ بے شمار چبوترے ایک دوسرے پر اوپر نیچے بنے ہوئے ہیں اور ہر اوپر کا چبوترا نچلے سے بتدریج چھوٹا ہوتا چلا گیا ہے اور اس طرح سے چاروں طرف سیڑھیوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ ان پتھروں پر مصور تحریریں کندہ ہیں۔

تاریخ دانوں کے مطابق ہرم پہلی بار چوتھے خانوادے کے دور یعنی 2900 قبل مسیح کے دور میں تعمیر ہوا۔ ہر بادشاہ نے اپنی ممی (Mummy) کو ابد تک محفوظ رکھنے کے لیے اپنا علیحدہ ہرم بنوایا۔ اس کی تعمیر میں بے حساب محنت اور وقت صرف ہوا۔ اصل مدفن ہرم سے بہت نیچے اس چٹان میں کھود کر بنایا جاتا تھا جس پر ہرم کی تعمیر کی جاتی تھی۔ جیزہ (مصر) میں خوفو یا چیوپس کا ہرم جو سب سے بڑا ہے اور دنیا کے سات عجائبات میں شامل ہے تیرہ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ہرم ابتداء میں 768 فٹ مربع اور 482 فٹ بلند تھا۔ اس کی ایک منزل گر جانے کی وجہ سے اب اس کی بلندی 450 فٹ رہ گئی ہے۔ اس کی تعمیر میں پتھر کے 23 لاکھ بلاک استعمال کیے گئے۔ ان میں سے ہر پتھر کا وزن اڑھائی ٹن اور جسامت 40 مکعب فٹ ہے۔ اگر چہ اہرام عام طور پر لائم سٹون کے کھردرے قطعوں سے تعمیر ہوئے ہیں مگر ان میں کئی اہرام اینٹوں کے تھے جن کے اوپر پتھر لگایا گیا تھا۔

اہرام مصر کے بنانے والوں کو کائنات کے مختلف رازوں کا علم تھا۔ علوم جغرافیہ، علم ریاضی، جیومیٹری اور فلکیات پر انہیں پورا پورا عبور حاصل تھا۔ حال ہی میں ماہرین نے ایک ہرم کا جائزہ لیا جو کہ جیزہ کے مقام پر چیوپس فرعون کا ہرم ہے اور قاہرہ سے 10 میل جنوب میں واقع ہے۔ شاید پوری دنیا میں اس قدر پر اسرار اور تعجب خیز کوئی عمارت نہ ہو گی جو ایک ویران میدان میں کھڑی پوری دنیا کے دانشوروں کو اپنے وجود سے حیرت زدہ کر رہی ہے۔

ایک مصری پروفیسر جس نے اپنی پوری زندگی اہرام مصر پر مطالعے اور تحقیق میں گزار دی ہے کا کہنا ہے کہ یہ ہرم پہلے 85 فٹ بلند تھا۔ جب نپولین نے مصر کے دورے کے دوران اسے دیکھا تو اس کے ساتھ آئے ہوئے عالموں اور سائنسدانوں نے اندازہ لگایا کہ

صرف اس ہرم میں اتنا پتھر موجود ہے کہ اس سے فرانس کے گرد ایک دیوار تعمیر کی جا سکتی ہے جو 10 فٹ اونچی اور ایک فٹ موٹی ہو گی۔ مصری پروفیسر کا بھی یہی خیال ہے کہ اگر اہرام مصر کے گرد موجود پتھر کو ایک ایک فٹ کے مکعب (کیوبک) سائز میں کاٹ لیا جائے تو پھر آپ خط استواء کے ساتھ ساتھ پوری دنیا کے گرد ایک پتھر کی زنجیر بنا سکتے ہیں۔ خط استواء کی لمبائی کا اندازہ 25 ہزار میل لگایا گیا ہے۔

پوری دنیا میں اس طرح کی کوئی دوسری عمارت نہیں ہے جس میں اس قدر پتھر استعمال ہوا ہو یا تعمیر میں اس قدر انسانی محنت صرف ہوئی ہو۔ آج کی ترقی یافتہ دنیا میں کوئی بھی تعمیراتی کمپنی اس قدر حیران کن عمارت تعمیر کرنے سے قاصر ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس عمارت میں اتنی گنجائش ہے کہ روم، میلان اور فلورنس کے تمام گرجا گھر اس میں سما سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان شہروں میں واقع عبادت خانے اور خانقاہیں بھی اس میں سما سکتی ہیں۔ نیویارک کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ۔ برطانیہ کی ویسٹ منسٹر ایبے۔ سینٹ پال کیتھیڈرل اور انگلینڈ کی پارلیمنٹ ہاؤس کی بلڈنگ بھی اس میں سما سکتی ہے۔

اہرام مصر کا وزن تقریباً 65 لاکھ ٹن ہو گا۔ سوائے راہداریوں، گزرگاہوں، مدفن اور خفیہ کمروں کے یہ اہرام مکمل وطر پر مضبوط پتھروں (Solid Stones) سے بناہوا ہے۔ اس میں ایسی ایسی پتھروں کی سلیں ہیں جن کا انفرادی وزن سوسوٹن ہے۔ اتنا وزن ہونے کے باوجود ان کو آپس میں اتنی خوبصورتی اور مہارت سے جوڑا گیا ہے کہ اس کے درمیان معمولی سی درز بھی نہیں ہے۔ مینار کی عین بالائی چوٹی جو ایک تیز نوک معلوم ہوتی ہے۔ دراصل نوک نہیں بلکہ ایک وسیع چبوترا ہے جس کا ہر ضلع 18 فٹ لمبا ہے اور جو بارہ جیّد پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی تعمیر کے وقت ایک لاکھ آدمی کام کرتے تھے اور یہ ہر تین ماہ کے بعد تبدیل کر دیئے جاتے تھے۔

ایک مصری مورخ ابوزید کے مطابق ان پتھروں پر کندہ عبارت کے مطالعے اور تجزیے کے مطابق یہ اہرام 7300 سال قبل تعمیر ہوا۔ عام تصور یہ ہے کہ زمانہ قدیم کے کاریگروں، صناعوں اور غلاموں نے دستی اوزاروں سے کام لے کر پتھروں کے یہ عظیم ترین شہتیر، کانوں سے کھودنے، ان کی تراش خراش، لق و دق صحراؤں میں دھکیل کر اور کشتیوں میں

دریائے نیل کے بہاؤ کی سمت چلا کر ان مقامات تک پہنچایا جہاں یہ تعمیر ہوئے۔ ذرا اندازہ لگائیے کہ لاکھوں انسانوں کا لشکر جس میں اس وقت کے انجینئر، پلانرز، معمار، سپروائزر اور عام مزدور شامل ہوں گے۔ ان کے رہنے سہنے کا کیا بندوبست ہوگا۔ ان اہرام کی تعمیر میں اور بھی کئی لاتعداد مسائل اور نکات قابل غور ہیں۔ اندازاً 26 لاکھ عظیم ترین پتھروں کے شہتیروں کو کانوں میں سے کاٹ کر نکالنے اور تراشنے کے لیے غلاموں کی فوج موجود ہوگی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے ان کے پاس کون سے اوزار تھے؟ کیونکہ اس وقت ڈائنا مائیٹ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی کہ دھماکوں سے پتھروں کو نکالا جا سکے اور اگر اوزار تھے تو وہ کہاں سے آئے تھے۔ کئی عظیم الشان شہتیر تو ایک دوسرے سے اس طرح جوڑے گئے ہیں جیسے ویلڈ کر دیئے گئے ہوں اور جوڑ بھی بالکل نظر نہیں آتے۔ پھر یہ بات اور بھی حیران کن ہے کہ اتنے بڑے بڑے پتھر، کانوں سے ان مقامات تک پہنچائے کیسے گئے؟ اس وقت کا قدیم ملک مصر دس لاکھ مزدوروں کی اس فوج کے کھانے پینے کا بندوبست کیسے کر سکا۔ خوراک کی قیمت کی ادائیگی کس نے کی؟ مزدوروں کا کھانا کیونکر تیار ہوتا ہوگا؟ اناج کہاں سے حاصل کیا گیا اور جب تقریباً دس لاکھ کی فوج اہرام مصر کی تعمیر میں مصروف تھی تو ان دنوں کھیتی باڑی کون کرتا تھا؟۔ پورے دس سال صرف عرب اور حبشہ میں پتھر کھودنے پر اور ان کو مصرف میں لانے پر صرف ہو گئے۔ 20 سال خالص تعمیر میں صرف ہوئے۔

دورِ جدید کے ماہرین تعمیرات اپنی تکمیل شدہ عمارت کو اس وقت دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں جب ان کی تمام پیمائش 1/10 انچ حد تک درست اور صحیح ہو۔ لیکن اس عظیم اہرام مصر نے پیمائش کی صحت کا بھی ریکارڈ توڑ ڈالا ہے۔ حالانکہ اس اہرام کی اندرونی تعمیر کی ساخت شہد کی مکھیوں کے چھتے کی مانند پیچیدہ ہے۔ جس کی کئی سرنگیں، دریچے، پلیٹ فارم اور خفیہ زمین دوز تہہ خانے ہیں اور یہ عظیم الجثہ ناقابل یقین وزنی عمارت ہزار ہا سال گزرنے کے باوجود ایک انچ بھی زمین میں نہیں دھنسی۔ جبکہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی ایسا شخص یا تعمیراتی کمپنی موجود نہیں جو ایسی عمارت ان خوبیوں کے ساتھ تعمیر کر سکے۔ درحقیقت اس کمال کو دہرانا انسانی بس میں نہیں ہے۔

ان اہرام میں ایک کنگز چیمبر (Kings Chamber) ہے جو فن تعمیر کی اپنی مثال

آپ ہے۔ یہ اہرام کے انتہائی اندرونی گوشے میں ہے۔ اس میں بہت بڑے بڑے شہتیروں کی دو قطاروں کی مدد سے چھت تعمیر ہوئی ہے۔ شہتیر سرخ رنگ کے ہیں اور ہر شہتیر کا وزن 70 ٹن ہے۔ خیال ہے کہ یہ نایاب سرخ پتھر ان کانوں سے حاصل کیے گئے جو جیزہ سے 600 میل کے فاصلے پر ہیں۔ ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر روزن برگ کے بقول گھوڑے یا گھوڑا گاڑی کا مصر میں 17ویں صدی عیسوی تک وجود نہیں تھا تو پھر یہ عظیم ترین اور انتہائی وزنی شہتیر 600 میل کے فاصلے پر کس طرح لے جائے گئے؟۔ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ یہ بھاری درختوں کے تنوں پر رول کر کے (لڑھکا کر) منزل مقصود تک پہنچائے گئے۔ جبکہ ڈاکٹر روزن برگ کہتے ہیں کہ میں اس تھیوری کو مانتا ہوں۔ مگر مصر میں ایسے درخت نہیں پائے جاتے۔ وہاں صرف کھجور اور پام کے درخت ہیں جن کی پیداوار بطور خوراک استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ جب تنوں سے بنے رولرز پر پتھر لڑھکائے گئے تو وہ گھس کر ٹوٹ گئے ہوں گے۔ اس کام کے لیے دو کروڑ 60 لاکھ رولرز درکار ہوں گے۔ پھر درختوں کے تنے کہاں سے برآمد کیے گئے اور ان کے تنوں کے رولرز کس نے بنائے ہوں گے؟ کن ذرائع سے یہ رولرز کانوں تک پہنچائے گئے۔

دنیا بھر کے ماہرین آثار قدیمہ۔ سائنسدان، ریسرچ اسکالرز، انجینئرز، جغرافیہ دان اور تاریخ نویس ان اہرام سے متعلق نظریے اسی طرح پیش کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ایک ماہر تعمیرات ولیم ایس پیٹر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان اہرام میں لگے ہوئے بیرونی پتھر (کنگ اسٹون) جو 75 انچ کی لمبائی میں ہیں جب ایک دوسرے سے جوڑے گئے تو ان کا جوڑ 1/100 انچ کی پیمائش تک صحیح تھا۔ اس قدر باریکی اور صحت سے کاری گری کا کمال تو آج کل کی جدید ترین عینک سازی کی مشینیں بھی انجام نہیں دے سکیں۔ پتھروں کو جس مسالے (سیمنٹ) سے جوڑا گیا وہ ہزارہا سال گزر جانے کے بعد بھی جوں کا توں برقرار ہے۔ حالانکہ خود پتھر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ کئی ماہرین تعمیرات کہتے ہیں کہ اگر ہمیں اس سیمنٹ کا راز معلوم ہو جائے تو ہم اس سے ایسی سڑکیں بنا سکتے ہیں جو ہزاروں سال تک نہ ٹوٹ سکیں۔

یہ اہرام شمالی اور جنوبی زاویے پر رکھ کر اس قدر درستی سے بنایا گیا ہے کہ اس کی تعمیر تقریباً ساڑھے تیرہ ایکڑ رقبہ محیط ہے اور بال برابر بھی پیمائشوں میں فرق نہیں۔ یقیناً اس کے

معمار جیومیٹری اور ٹرگنومیٹری کے علوم سے واقف تھے اور ان کو ان علوم پر مکمل عبور حاصل تھا۔ جن لوگوں نے ان اہرام کو سب سے پہلے دریافت کیا تو انہیں پتہ چلا کہ یہ اہرام سرزمین مصر کے مرکز میں واقع ہے اور قدیم دنیا کے مرکز پر بھی۔ اب ایسے مقام کا انتخاب بغیر جغرافیہ کے علم کے کیسے ممکن ہے؟ اس کے علاوہ بھی ان اہرام میں ایسے سربستہ راز اور پیشین گوئیاں ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اہرام مصر حیرتوں کا سمندر ہیں۔ وہ آج کے جدید انسان کے علم کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک تحقیق کرنے والے نے کیا خوب لکھا ہے کہ

''وقت ہر چیز کا مذاق اڑاتا ہے مگر یہ اہرام وقت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔''

ابوالہول

مصر کے آثار قدیمہ میں اہم عجوبہ

مصر کے آثار قدیمہ میں ابولہول (Sphinx) بہت مشہور اور قدیم ہے۔ ابوالہول عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''خوف کا باپ'' ہیں۔ جیزہ (قاہرہ) کے عظیم الجثہ بت کا عربی نام، جس کا دھڑ شیر کا اور سر آدمی کا ہے۔ ابوالہول نام فاطمی دور میں رائج ہوا۔ اس سے قبل اس کا قبطی نام ''بلہیت'' مشہور تھا۔ عہد قدیم میں لفظ ''ابوالہول'' کا اطلاق اس مجسمے کے سر پر ہوتا تھا کیونکہ اس زمانے میں اس کا پورا دھڑ ریت میں دبا ہوا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بت ایک طلسم ہے جو وادی نیل کی حفاظت کرتا ہے۔

قدیم مصری دیو مالا میں اس قسم کے مجسمے فراعنہ کی الوہیت کی علامت سمجھے جاتے تھے اور بعض مجسموں میں مینڈھے یا عقاب کا سر بھی بنایا جاتا تھا۔ جیزہ کا ابوالہول (سفنکس) ایک ہی چٹان سے تراش کر بنایا گیا تھا جو خفرع کے ہرم کے نزدیک ہے۔ ابوالہول کا تصور دراصل یونانیوں نے مصر کے علم الاصنام یا دیومالا سے مستعار لیا۔ یونانیوں کے نزدیک ابوالہول ایک پردار مادہ ببر شیر تھا جس کا چہرہ نسوانی تھا۔ یونانیوں کا کہنا تھا کہ ابوالہول یونان کے شہر بیوٹیا کی ایک اونچی پہاڑی پر رہا کرتی تھی۔ جو لوگ بھی اس کے سامنے سے گزرتے وہ انہیں ایک معمہ حل کرنے کو دیتی۔ جو اس کا صحیح حل نہ بتا سکتا اس کو ہڑپ کر جاتی۔ بالآخر ایک تھیبس ہیرو اوڈی پس نے اس معمہ کا صحیح حل پیش کیا اور یوں اس کی موت کا سبب بنا۔ معمہ یہ تھا کہ وہ کون ہے جو صبح کو چار ٹانگوں پر چلتا ہے۔ دوپہر کو دو ٹانگوں پر اور شام کو تین ٹانگوں

پر۔ جو بھی اس معمہ کا حل نہ بوجھ سکتا اسے عفریت ہلاک کر ڈالتا۔ آخر اوڈی پس نے یہ معمہ حل کر لیا۔ اس پر سفنکس نے چٹان سے گر کر خودکشی کر لی اور اوڈی پس تھیبس شہر کا بادشاہ بن گیا۔

ابوالہول کی لمبائی 189 فٹ اور اونچائی 65 فٹ کے قریب ہے۔ دور سے دیکھیں تو پہاڑ سا نظر آتا ہے۔ یہ مجسمہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ ایک بڑی چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس کی انسانی شکل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فرعون **(Khafre)** کی شبیہ ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی شبیہ **(Khafre)** کے بجائے اس کے بھائی **(Rededef)** سے ملتی جلتی ہے۔ یہ مصر کے دارالحکومت قاہرہ سے 60 میل دور جیزہ (غزہ) کے ریگستان میں موجود چونے کے پتھر **(Lime Stone)** کی پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ جب یہ مجسمہ تیار ہوا ہوگا تو بہت ہی حسین نظر آتا ہوگا کیونکہ اس میں جابجا رنگ استعمال کیے گئے۔

ہزاروں سال گزرنے کے باوجود اس کی شکل میں یہ رنگ نظر آتے ہیں۔ اس کے سر پر اب بھی فرعون کے روایتی رومال اور اس کے درمیان پیشانی پر ناگ کی شبیہ صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ ناگ کی اس شبیہ کو قدیم مصری **(Wadjet)** کہتے تھے اور سر کے رومال کو اپنے دیوتا **(Horus)** کے پھیلے ہوئے دونوں پروں سے تشبیہ دیتے تھے۔ اس مجسمہ کی ناک اور داڑھی بھی ٹوٹی نظر آتی ہے۔ ان دونوں چیزوں کے ٹوٹنے کی وجہ یہ ہے کہ 820ء میں خلیفہ ہارون الرشید کے بیٹے عبداللہ مامون نے اہرام اعظم کے اندرونی حصے کی مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے کچھ ماہرین تعمیرات کے ساتھ مصر میں قدم رکھا۔ کافی عرصے تک جان توڑ کوشش کے باوجود بھی جب مسلمانوں کو کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تو غصے میں انہوں نے ابوالہول کے مجسمے کی ناک اور داڑھی کو توڑ ڈالا۔ یہ ٹوٹی ہوئی ناک قاہرہ کے عجائب گھر اور داڑھی برطانیہ کے مشہور زمانہ برٹش میوزیم میں نمائش کے لیے رکھی ہے۔

ابوالہول کے اگلے دونوں پنجوں کے درمیان سنگ خارا **(Granite)** کا ایک کتبہ موجود ہے جس کے مطابق فرعون **(Tothmusis iv)** جس نے 1420 قبل مسیح تک حکومت کی تھی۔ اس کی جوانی کا ایک واقعہ درج ہے کہ ابوالہول کے سامنے ریگستان میں شکار کھیلتے ہوئے ایک بار وہ تھکن سے چور ہو کر اس مجسمے کے سائے میں سو گیا۔ اس زمانے میں یہ مجسمہ ریگستان

کی ریت میں کندھے تک دھنس چکا تھا اور اگر کچھ عرصہ اور اسی طرح رہتا تو شاید یہ مکمل طور پر ریت میں دھنس جاتا۔ قدیم مصریوں کے مطابق ابوالہول ان کے سورج دیوتا ''راحوراختے'' (Rahor-Akhte) کا دنیاوی ظہور تھا۔ یہ دیوتا سوئے ہوئے شہزادے کے خواب میں آیا اور اسے مخاطب کر کے یہ ہدایت دی کہ اگر شہزادہ اسے ریت کے اندر سے پوری طرح باہر نکال دے تو جلد ہی شہزادہ تاج وتخت کا مالک ہو جائے گا۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی شہزادے نے ایسا ہی کیا اور واقعی کچھ عرصے کے بعد وہ مصر کا شہنشاہ بن گیا۔ اسی واقعہ کی یاد میں اس فرعون نے یہ کتبہ ابوالہول کے اگلے دونوں پنجوں میں نصب کرایا۔

ابوالہول کے مجسمہ کی عمر کے بارے میں آج تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا۔ فرعون خوفو کا دور تقریباً 2600ق م تھا۔ اس سے بھی پہلے یعنی تقریباً 3100ق م فرعون مینیس (Menes) کا زمانہ تھا۔ اس قدیم دور سے بھی پہلے موجود عراق (سمیری Sumer) کی انتہائی ترقی یافتہ تہذیب انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی قوم سمیرین (Sumeren) اپنی بہت ساری دستاویزات میں اہرام اور ابوالہول کی موجودگی کی شہادتیں چھوڑ گئے۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری ایسی شہادتیں موجود ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ ابوالہول انسانی تعمیرات کا ایک انتہائی قدیم شاہکار ہے اور اس کی عمر کے بارے میں کوئی آخری رائے قائم کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ کب، کس نے اور کیوں بنایا؟

سورج دیوتا کی حیثیت سے اس کی پوجا بھی کی جاتی ہے۔ امتدادِ زمانہ سے اس کی صورت کافی بگڑ گئی ہے اور اس کا وہ ''پروقار تبسم'' جس کا ذکر قدیم سیاحوں نے کیا ہے ناپید ہو چکا ہے۔ اب یہ ایک ہیبت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ اسی وجہ سے عربوں نے اس کا نام ''ابوالہول'' (خوف کا باپ) رکھ دیا ہے۔

حکومتِ مصر نے یہاں سیاحوں کے لیے موسیقی اور روشنی کے شو کا انتظام کیا ہے۔ صحرا کی بے پناہ پہنائی میں ابوالہول کی پرہیبت آواز ماضی کے مزاروں میں گونجتی سنائی دیتی ہے۔

''میں ابوالہول ہوں۔ گزشتہ 5ہزار برس کے دوران کوئی سورج ایسا طلوع نہیں ہوا جس کی پہلی کرن میری قدم بوسی کر کے نہ آگے بڑھی ہو اور آنے والے صدیوں کے مورخوں

کو بھی اپنی تمازت اور چکاچوند زمانے تک پہنچانے کے لیے میرے قدموں سے طلوع ہونا ہو گا۔ مقدونیہ کے سکندرِاعظم سے لے کر فرانس کے نپولین تک کتنے ہی فاتح آئے اور میری قدم بوسی کر کے واپس چلے گئے یا آگے بڑھ گئے۔ ان سب نے میری عظمت کو تسلیم کیا کہ میں عظیم ہوں۔ عظمت میری باندی ہے اور جلال میری نشانی ہے۔ کیا تم اس وقت موجود تھے جب فرعونوں کے لشکر جرار میرے اردگرد مارچ کیا کرتے اور میں انہیں دیکھ کر مسکراتا رہتا کہ میرے پاس سب کے لیے صرف مسکراہٹ ہے۔ کسی کے لیے محبت اور کسی کے لیے حقارت پر میری ایک مسکراہٹ ہی کافی ہے۔"

❀ ❀ ❀

قدیم مصر

مصر قدیم تہذیبوں کے آئینے میں

مصر کو قدیم تہذیب کا گہوارہ کہا جاتا ہے۔ مصر میں موجود تاریخی آثار جو پوری دنیا سے سیاحوں کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔ مصری حنوط شدہ لاشیں یعنی ''ممیاں'' پوری دنیا میں مصر کی پہچان ہیں۔ اس ملک کو فرعون اور حضرت موسیٰ ؑ کے حوالے سے انسانی تاریخ میں بھی خصوصی مقام حاصل ہے۔

آج سے پانچ ہزار سال بعد جب تاریخ کے طالب علم ہمارے بارے میں معلومات حاصل کریں گے تو وہ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ ہم مصریوں کو یعنی مصر کے رہنے والوں کو قدیم سمجھتے ہیں کیونکہ یہ لوگ اپنے زمانے کے مانے ہوئے نامور اور شہرت یافتہ تہذیب کے مالک تھے۔ تقریباً 8 ہزار سال پہلے مصری لوگ کسان تھے۔ پھر چند صدیوں میں ہی مصر دنیا کی طاقتور قوموں میں شمار ہونے لگا۔

مصری لوگ اپنے بادشاہوں (فرعونوں) کے لیے مقبرے تعمیر کرتے تھے جو دریائے نیل کے مغربی کنارے پر تھے جہاں سورج غروب ہوتا ہے۔ وہ اس عقیدے کے قائل تھے کہ ان کا بادشاہ مرا نہیں۔ فوت نہیں ہوا بلکہ سورج دیوتا سے ملنے گیا ہے۔ قدیم مصری لوگ دریائے نیل کے کنارے آباد تھے۔ جہاں پانی کی بہتات کی وجہ سے وہ کھیتی باڑی آسانی سے کر سکتے تھے۔ یہ لوگ بیرونی اور دور دراز کی دنیا کے بارے میں قطعاً کچھ نہ جانتے تھے البتہ ایشیا اور افریقہ کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے تھے۔ ان کے سوداگر نزدیکی ممالک

سے لکڑی، سونا، ہاتھی دانت، گرم مصالحے اور حتیٰ کہ بندر وغیرہ بھی لا کر تجارت کرتے تھے۔

مصری لوگ عمدہ طرز پر کھیتی باڑی کرتے تھے اور اس وجہ سے جلد دولت مند ہو گئے تھے۔ یہ اپنے دیوتاؤں کے لیے اعلیٰ درجہ کے خوبصورت مندر تعمیر کرتے تھے۔ یہ وسیع و عریض تکونی عمارات ''اہرام'' کہلاتی تھیں۔ ان کے پاس اپنی فوج بحری جہاز اور اعلیٰ نظام موجود تھا۔ ان کے ماہر فلکیات ستاروں کا علم بھی جانتے تھے۔ ماہر کاریگر سونے چاندی سے بہترین زیورات تیار کرتے تھے۔ مصر پر حکومت کرنے والے بادشاہ کو فرعون کہا جاتا تھا۔ مصری سمجھتے تھے کہ ان کا سب سے پہلا بادشاہ سورج دیوتا کا بیٹا تھا اور اس کے بعد آنے والے تمام فرعون اس کے رشتہ دار ہیں۔ اس خیال نے فرعونوں کو نہایت مقدس اور پاکباز بنا دیا۔ لوگ انہیں زمین پر دیوتا سمجھتے تھے۔

دنیا کی پہلی خاتون حکمران کا تعلق بھی مصر سے تھا۔ انسانی تاریخ کی اس پہلی خاتون ملکہ کا نام ''ہٹشی پٹ'' (Hatsheput) تھا۔ جب اس کا چھ سالہ بھتیجا تخت نشین ہوا تو اس خاتون کو مصر پر اس کمسن بادشاہ کے قائمقام کے طور پر حکومت کرنے کی دعوت دی گئی۔ تاوقتیکہ وہ بڑا ہو جائے مگر ملکہ ہٹشی پٹ کو حکومت اور اقتدار کا ایسا چسکا لگا کہ اس نے اپنے بھتیجے کو پھر حکومت نہ کرنے دی۔ ہٹشی پٹ نے 1511 ق م سے 1480 ق م تک قدیم مصر پر حکومت کی۔

فرعون عام طور پر تاج تو ضرور پہنتے تھے۔ بعض اوقات فرعون دو تاج بھی بیک وقت پہنتے تھے۔ سفید رنگ کا تاج شمالی مصر کے لیے (جو دراصل جنوبی مصر کا نام تھا) اور سرخ رنگ کا تاج جنوبی مصر کے لیے (جو اصل میں شمال تھا) ہوتا تھا۔ لکسر شہر میں مصر کے کئی آثار قدیمہ موجود ہیں۔ اسے ''بادشاہوں کی وادی'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریائے نیل کے عین کنارے واقع ہے۔ اسی لیے یہ فرعونوں کا منظورِ نظر اور دارالحکومت رہا۔ انہوں نے اس شہر میں بے شمار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ لکسر میں فرعونوں کے تقریباً 700 مقبرے ملے ہیں۔ ان میں توتن خامن اور اس کی بیوی سیتی کے مقابر بہت ہی شاندار ہیں۔

بابل کے معلق باغات

(Hanging Gardens of Babylon)

دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک

بابل (Babylon) دریائے فرات کے کنارے پر آباد میسوپوٹیمیا (اب عراق) کا قدیم ترین شہر جو اپنے تمدن اور تہذیب کے لیے بہت مشہور تھا اور مدت تک کلدانیوں، حمیریوں اور اشوریوں کا دارالحکومت رہا۔ بابل موجودہ شہر بغداد سے 70 میل جنوب کی طرف واقع تھا اور دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک تھا۔ بابل کے معلق باغات عجائبات عالم میں دوسرے نمبر پر آتے ہیں۔

چار ہزار قبل مسیح کی تحریروں میں بابل شہر کا تذکرہ ملتا ہے اور اس کی کھدائی سے اور بھی بہت سے حقائق سامنے آئے ہیں۔ ایک ہزار سال تک بابل ایک چھوٹا سا گاؤں ہی رہا جس کی کوئی تاریخی اہمیت نہ تھی لیکن جب حمورابی نے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا تو یہ دنیا کا سب سے بڑا اور خوبصورت شہر بن گیا۔ 689 قبل مسیح میں اشوری شہنشاہ سیناچرب نے اس کو فتح کر کے تباہ و برباد کر دیا لیکن اس کو دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ لیکن جب اشوری حکومت کے خلاف 612 قبل مسیح میں بغاوت ہوئی تو بابل بالکل تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد شہر کو از سر نو بسایا گیا اور آزاد حکومت قائم ہوئی۔

بابل کی تہذیب بھی بہت قدیم ہے۔ اس علاقہ میں 1500 قبل مسیح تک جو تہذیب

رہی وہ ''بابل کی تہذیب'' کہلاتی ہے۔ بابل اور دیگر بڑے شہروں میں الگ الگ بادشاہ تھے جو پیشوا کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ تقریباً 2400ق م میں سارگون نے سارے میسوپوٹیمیا پر قبضہ کر کے یہاں ایک ایسی سلطنت قائم کی جو دوسو برس تک قائم رہی۔ حمورابی اسی سلطنت کا فرمانروا تھا۔ 1600ق م میں حطاطی قوم کے پہاڑی قبائل نے بابل کو پامال کر ڈالا۔ بابل کے لوگ دین سے زیادہ دنیا کے کاموں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ریاضی اور ہیئت میں انہوں نے کافی ترقی کر لی تھی۔ اُن کے پاس پہیہ دار گاڑیاں تھیں۔

اہل بابل نے بڑے شاندار شہر تعمیر کیے۔ معبدوں کے اونچے اونچے مینار بنائے۔ بابل کا برج اور معلق باغات تاریخ میں بہت مشہور ہیں۔ بابل کی تہذیب میں تجارت کو بڑا فروغ ہوا۔ کاروباری معاملات کے لیے قانون موجود تھے۔ اس زمانے کے کاروباری معاہدے اور حساب کتاب کی یادداشتیں محفوظ چلی آتی ہیں۔ بابل والوں کے رسم الخط میں بہت سے نشان تھے اور کئی نشانوں سے مل کر لفظ بنتا تھا۔ وہ لوگ لکڑی کے ایک نوکیلے ٹکڑے سے مٹی کے تختوں پر لکھتے تھے۔ اُن کے رسم الخط کو ''خط میخی'' یا ''خط پیکانی'' کہا جاتا ہے۔

شاہ بخت نصر جو بابل کا حکمران تھا غالباً 630 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کا شمار بابلی یا کلدانی عہد کے عظیم ترین بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ 7 ستمبر 605 قبل مسیح کو وہ بخت نظر ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا اور 561 قبل مسیح تک حکمران رہا۔ اس کے عہد میں سلطنت کی زیادہ تر دولت بابل کی قلعہ بندی اور تعمیرات پر خرچ ہوئی۔ بخت نصر نے بابل شہر کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ پرانا شہر دریائے فرات کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔ بخت نصر نے دریا پر پل بنوایا اور مغربی کنارے کا ایک وسیع علاقہ بھی شہر کی حدود میں شامل کر لیا۔ بابل اس کے دور میں علم و تہذیب کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔

بخت نصر کی چہیتی ملکہ امیتس یا آمیتہ ایران کے بادشاہ کیا کسارا کی بیٹی تھی یہ ہمدان کی رہنے والی تھی اور اس کا عہد طفولیت عالم شباب تک ایک کوہستانی مرغزار میں گزرا تھا۔ ہمدان پہاڑوں کے دامن میں واقع تھا۔ اس لیے آمیتہ کو پہاڑی مناظر سے قدرتی مناسبت اور دلچسپی تھی۔ وہ بابل کے سطح مرتفع سے تنگ آ گئی تھی۔ اسی لیے اس نے بخت نصر سے بابل کے چٹیل میدان میں پہاڑ اور اس پر باغات کی فرمائش کر ڈالی۔ چنانچہ بخت نصر نے اپنی ملکہ

کے لیے معلق باغات اپنی نگرانی میں تیار کرائے۔

بابل کے معلق باغات بخت نصر نے دریائے فرات کے قریب بنوائے۔ یہ باغ نشیب سے فراز تک جاتے تھے۔ ان باغات کی تعمیر کی داستان بے حد طویل اور دلچسپ ہے۔ مصنوعی پہاڑ کھڑا کرنے کی ترکیب یہ کی گئی کہ محرابوں پر محرابیں تعمیر کی گئیں۔ ہر محراب نیچے والی محراب سے چوڑائی میں چھوٹی تھی یا یوں کہا جائے کہ یہ چار منزلہ عمارت تھی۔ ہر منزل میں باہر کو نکلے ہوئے چبوترے تھے۔ یوں محرابوں کا ایک مصنوعی پہاڑ کھڑا کر دیا گیا جو ہر محراب پر ڈالی جانے والی چھت کے باعث بنا۔ ان کے اطراف 20 فٹ چوڑائی کی چاردیواری بنائی گئی تھی۔ سب سے اوپری چھت زمین سے 350 فٹ اونچی اور 400 فٹ لمبی تھی۔

اس باغ کی جو مرحلہ وار درجہ بندی کی گئی تھی ان میں ایسے سانچے تعمیر کیے گئے تھے جو اتنے مستحکم تھے کہ ان میں نہ صرف خوشبودار جھاڑیاں بلکہ پھلدار درخت بھی لگائے گئے تھے۔ جنہیں ایشیا کے کونے کونے سے بابل لایا گیا تھا۔ ان کی آبیاری کے لیے دریائے دجلہ و فرات سے پانی اوپر تک پہنچایا جاتا تھا۔ دور سے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے یہ باغ ہوا میں لٹکے ہوئے ہیں۔ سب سے اوپری چھت پر ایک بہت بڑا تالاب بنایا گیا جس میں نلوں کے ذریعے دریائے فرات کا پانی بھرا جاتا تھا۔ پمپ دن رات چلتے تھے جو زمین سے پانی اتنی بلندی تک پہنچاتے تھے۔ اس تالاب سے پانی کے چشمے بہتے تھے اور فوارے چھوٹتے تھے۔ باغ انہیں چشموں سے سیراب ہوتے تھے۔ ان باغوں کے اونچے اونچے درخت ہوا کے جھونکوں سے ہلتے تو معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ کا پہاڑ ہل رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ڈیٹس کے مطابق یہ باغات 580 ق م میں تعمیر ہوئے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ باغ کسی زلزلے سے تباہ ہوئے یا حملہ آوروں نے انہیں تہس نہس کر دیا۔

❀ ❀ ❀

ڈائنا کا مندر

(Temple of Artemis at Ephesus)

دنیا کا تیسرا عجوبہ

ڈائنا یا، ڈیانا (Diana) کا مندر ایشیائے کوچک کی ایک قدیم سلطنت ''لیڈیا'' کے شہر ایفی سس میں بادشاہ کروسس نے تعمیر کروایا تھا۔ خیال ہے کہ اس کی تعمیر 550 سال قبل مسیح میں ہوئی۔ رومتہ الکبریٰ کے علم الاصنام کے مطابق ڈائنا ایک قدیم یونانی اور چاند کی دیوی تصور کی جاتی تھی۔ صرف چاند ہی کی نہیں بلکہ جنگلات، مویشی اور وضع حمل کے بعد کی زچہ کی بھی دیوی تھی۔ اس کی ہمعصر دیوی یونان ہی کی آرٹی مس تھی اور اریشیا میں اس کا معبد صرف خواتین کے لیے مختص تھا۔ دیوی ڈائنا کے ہاتھ میں ایک کمان ہوتی تھی۔ اس کے مجسمے اسی کمان کی وجہ سے شناخت کیے جاتے ہیں۔ یونانی اس دیوی کو بہت مقدس سمجھتے تھے اور انہوں نے ایفی سس شہر میں اس کا ایک عالیشان مندر تعمیر کرایا تھا۔ یہ مندر دنیا کے سات عجائبات میں ایک اہم عجوبہ خیال کیا جاتا ہے۔

ایشیائے کوچک میں واقع اس شہر ایفی سس کی کھدائی کی گئی تو اس شہر کے بیشتر آثار ظاہر ہوئے جن میں سڑکیں، ستون، سنگ تراشی اور بت تراشی کے بعض اعلیٰ نمونے بھی برآمد ہوئے۔ اس طرح اس مقام پر یہ پانچواں مندر تھا جو تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ عالیشان عمارت قدیم مصر کے معبد واقع کرناک کے نمونے پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی اندرونی لمبائی 425 فٹ اور

چوڑائی 290 فٹ تھی اور چھت کو 127 منقش ستون سنبھالے کھڑے تھے۔ اس کے مقابلے میں سومنات کے مشہور مندر میں صرف 56 ستون تھے۔

ڈائنا کے مندر کے ستونوں کی لمبائی 60 فٹ تھی جو بذات خود ایک عجوبہ سے کم نہ تھی۔ ان ستونوں میں سے ہر ایک کسی بادشاہ کی یادگار تھا جو ایک ہی سلسلہ کے یکے بعد دیگرے جانشین تھے۔ اس مندر کی بنیاد شاہ یلسیفون نے رکھی تھی۔ لیکن اس کے بعد اس کے ہر جانشین نے اس کی توسیع اور آرائش میں بڑھ چڑھ کر سرگرمی دکھائی لیکن اس کی تکمیل شاہ کروسس نے کرائی جو سکے (Coin) کا بھی موجد تھا۔

اس مندر کو قیمتی پتھروں اور دھات سے بنایا گیا تھا۔ سکندر اعظم کی پیدائش کے دن ایک سردار ''ارسطرا سوتش'' نے اس کو آگ لگا کر تباہ کرنے کی کوشش کی اور وہ قدرے کامیاب بھی ہو گیا۔ پھر اسے از سر نو تعمیر کیا گیا۔ اس تعمیر میں دنیا بھر کے لوگوں نے ایفی سس والوں کی مدد کی۔ خود جب سکندر اعظم تخت نشین ہوا تو اس نے کاریگروں کو حکم دیا کہ اس کی خوبصورتی اور زیبائش میں اضافہ کریں۔ اس مندر کے صدر دروازہ پر ایک قربان گاہ بنائی گئی تھی جس پر سب سے پہلی قربانی ہوتی تھی۔

اس کے بعد مندر کے صحن میں جس کو ''اڈیٹم'' (Adytum) کہتے تھے ایک اور قربان گاہ تھی جس کو منبر شریں نباتات کہتے تھے۔ اس پر بخورات اور خوشبوئیں جلانے کی نذر پیش ہوتی تھی۔ دیوی کے خاص مسکن کے در پر ایک تیسرا منبر تھا۔ اس پر خالص ترین خوشبوئیں جلائی جاتی تھیں۔ اس حجلے میں ریشمی ارغوانی پردے کے پیچھے ڈائنا دیوی کا مرمری مجسمہ تھا۔ اس عبادت گاہ کے نچلے حصہ میں اگر کوئی شخص آکر پناہ حاصل کر لیتا تو رسم و رواج کے مطابق وہ دشمن کی دسترس سے محفوظ ہو جاتا تھا۔

262ء تک یہ عبادت گاہ موجود تھی مگر نامعلوم گوتھوں (Goths) نے جو مشرقی یورپ سے آئے تھے اسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ اس کے 127 ستونوں پر جن میں سے آٹھ ستون عمارت کے پیش رخ پر تھے انہوں نے پوری عمارت کا وزن سنبھال رکھا تھا۔ ان ستونوں کے زیریں حصے اب بھی برطانیہ (لندن) کے عجائب گھر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔

❀❀❀

اسکندریہ کا روشن مینار

(Light House of Alexandria)

دنیا کے قدیم عجائبات میں سے ایک

مشہور فاتح سکندراعظم نے جب 332 قبل مسیح میں مصر کو فتح کیا تو اس نے وہاں ایک شہر آباد کیا جو اس کے نام کی مناسبت سے اسکندریہ (Alexandria) کہلایا۔ جو بعد ازاں مصر کی ایک اہم بندرگاہ اور تجارتی مرکز بن گیا۔ اسی اسکندریہ کے قریب ایک جزیرہ نما ''فاروس'' ہے۔ ابتداء میں یہ ساحل سے پرے ایک جزیرہ تھا جسے سکندرِاعظم نے ایک مصنوعی بندرگاہ کے ذریعے شہر اسکندریہ سے ملحق کر دیا تھا۔

اسکندریہ کی تاریخ میں سب سے غیر معمولی چیز وہ چراغ راہ تھا جو فاروس جزیرے پر ایستادہ لائٹ ہاؤس میں نصب تھا۔ سفید سنگ مرمر سے بنا یہ لائٹ ہاؤس 280 سے 270 ق م کے دوران بنایا گیا تھا۔ جس وقت یہ لائٹ ہاؤس بنایا گیا اس وقت مصر میں بادشاہ بطلیموس دوم (PtolemyII) کا دور تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آنے والے جہاز کسی چٹان وغیرہ سے نہ ٹکرا جائیں۔ یہ سب سے پہلا اور بڑا روشنی کا مینار تھا۔ جس کی اونچائی 500 فٹ کے قریب تھی۔ اس میں موجود لائٹیں اتنی تیز تھیں کہ وہ سمندر سے 56 کلومیٹر سے 36 کلومیٹر تک پھیل جاتی تھیں۔

اس لائٹ ہاؤس کا ڈیزائن یونانی ماہر تعمیرات سیسٹراٹوس (Cesratos) نے بنایا

تھا۔ بعض اندازوں کے مطابق اس کی بلندی 440 فٹ (134 میٹر) تھی۔ اس کا نچلا حصہ چوکور تھا۔ درمیان کا حصہ ہشت پہلو اور اوپر کا حصہ گول تھا۔ بعض مورخین کا کہنا ہے کہ یہ لائٹ ہاؤس آٹھ یا چار میناروں کی شکل میں بنایا گیا تھا۔ سب سے بڑا ٹاور سب سے نیچے رکھا گیا تھا اور اس کے اوپر اس سے چھوٹا، پھر اس سے چھوٹا ٹاور نصب کیا گیا تھا اور اسی طرح پورا لائٹ ہاؤس مکمل کیا گیا تھا۔ لائٹ ہاؤس کے آخری سرے پر تانبے کا بنا دہکتے انگارے رکھنے کا ایک بہت بڑا طباق تھا۔ اس طباق کے اندر دن رات آگ جلتی رہتی تھی۔ اس جھلملاتے چراغ کو بحیرہ روم میں سفر کرنے والے بحری جہاز 40 کلومیٹر (25 میل) دور سے دیکھ لیا کرتے تھے۔

اسکندریہ کے اس مشہور لائٹ ہاؤس کے بارے میں مختلف باتیں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی چوٹی پر ایک آئینہ نصب تھا جس میں ان تمام واقعات کو دیکھا جا سکتا تھا جو بحیرہ روم کے مشرقی سرے پر واقعہ شہر قسطنطنیہ (اب استنبول) اور (Minor Asia) میں ہوتے تھے۔ اس آئینے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس آئینہ کو ایک جلتے ہوئے شیشے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر کسی بحری جہاز سے اسکندریہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی جاتی تو سورج کی جلتی ہوئی شعاعوں کو اس آئینے کے ذریعے جہاز کی طرف اس طرح منعکس کیا جاتا کہ وہ جل کر تباہ ہو جاتا۔

اس لائٹ ہاؤس کے بارے میں اس تمام مبالغہ آرائی کے باوجود یہ لائٹ ہاؤس یقیناً اس قابل تھا کہ اسے زمانہ قدیم کے عجائبات میں شمار کیا جا سکے۔ بحیرہ روم میں یہ پہلا لائٹ ہاؤس نہیں تھا لیکن یہ سب سے بڑا اور غیر معمولی ضرور تھا۔ اسکندریہ کا یہ روشن مینار تقریباً 900 سال تک بحیرہ روم میں سفر کرنے والے جہازوں کی رہنمائی کرتا رہا۔ حتیٰ کہ عربوں نے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا اور اس عظیم لائٹ ہاؤس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قسطنطنیہ کا بادشاہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان اس لائٹ ہاؤس کو اپنے جہازوں کی رہنمائی کے لیے استعمال کریں۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح مسلمان بحری جہازوں کی مدد سے تجارت کو فروغ دے سکیں گے۔ چنانچہ شاہ قسطنطنیہ نے بڑی چالاکی سے ایک منصوبہ بنایا اور اپنا ایک جاسوس خلیفہ الولید کے پاس بھیجا۔

اس جاسوس نے خلیفہ کو یہ یقین دلا دیا کہ اس لائٹ ہاؤس کے نیچے ایک قیمتی خزانہ

چھپا ہوا ہے۔ چنانچہ خلیفہ نے خزانے کی تلاش کے لیے اسے توڑنے کا حکم دیا۔ جب یہ لائٹ ہاؤس آدھے سے زیادہ ٹوٹ چکا تب خلیفہ کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھ تو بہت بڑا دھوکہ کیا گیا ہے مگر اس وقت تک بڑا آئینہ گر کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ لائٹ ہاؤس کے جو تھوڑے بہت حصے بچے تھے وہ 1375ء میں اسکندریہ میں آنے والے ایک زلزلہ میں بالکل تباہ ہو گئے اور اب اس بندرگاہ پر سفید سنگ مرمر کے چند ٹکڑے ہی باقی بچے ہیں۔

❁ ❁ ❁

دیوارِ چین

(The Great Wall of China)

دنیا کا چوتھا عجوبہ

عظیم دیوار چین دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چاند سے کرہ ارض کی اگر کوئی چیز واضح طور پر دکھائی دیتی ہے تو وہ دیوار چین ہے مگر ماہرین اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں۔ اس کی تاریخ دو ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے۔ یہ دیوار تیسری صدی قبل مسیح میں مملکت چین کو تاتاریوں اور منگولوں کے حملوں سے محفوظ کرنے کے لیے تعمیر کی گئی۔ یہ دیوار مشرق سے مغرب تک 6700 کلومیٹر لمبی ہے اور اس کا گزر پانچ صوبوں میں سے ہوتا ہے۔ کبھی یہ بل کھاتی ہوئی ریگستانوں، سبزہ زاروں اور پہاڑوں میں سے گزرتی ہے اور کبھی کسی سڑک کی طرح اس کا رخ سیدھا ہوتا ہے۔

اگرچہ دیوار چین کے کچھ حصے تباہ ہو چکے ہیں یا مکمل طور پر غائب ہیں۔ تاہم یہ ابھی بھی سحر انگیز ہے۔ 1987ء میں یونیسکو نے بھی اسے عالمی اثاثہ قرار دے کر اپنی فہرست میں شامل کر لیا اور اس کی مرمت اور توسیع پر بھرپور توجہ دی۔ جب اس منصوبے کا آغاز ہوا تو مختلف ریاستوں کی خودمختار دیواریں تھیں اور ''کن'' کے دور تک یہ عظیم دیوار نہیں بن پائی تھی البتہ جب چین کا اقتدار شانگ خاندان نے سنبھالا تو اس نے تمام دیواروں کو ملانے کی مہم کا آغاز کیا اور اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہوا۔ اس کے پیش نظر شمال میں ہنز (Huns) کے

حملوں سے بچاؤ تھا۔ اب عظیم دیوار چین جو 5000 کلومیٹر سے زیادہ وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی ہے چینی تاریخ کی یادگار ہے۔

دیوار چین شمالی چین سے شروع ہو کر صوبہ کانسو سے صوبہ ہوپہ تک محیط ہے اور زیادہ تر سطح مرتفع منگولیا کے کنارے کنارے گزرتی ہے۔ اس دیوار کی تعمیر چین کے بادشاہ شی ہوانگ ٹی کے عہد حکومت یعنی 228ق م سے 210ق م کے دوران شروع ہوئی اور 17ویں صدی عیسوی کے وسط میں منگ کے دور میں مکمل ہوئی۔ بعد کے ادوار میں بھی اس کی مرمت اور بحالی کے لیے کام ہوا۔ لاکھوں مزدوروں اور 10 سالہ محنت کے بعد جنرل منگ تیان کی زیرنگرانی یہ دیوار مغرب میں لنتاؤ اور مشرق میں لائیوڈونگ۔ اس کے بعد دوسرے صوبوں کی حفاظت کے لیے اس دیوار کو مزید وسعت دی گئی اور مشرق سے مغرب تک ذرائع رسل و رسائل محفوظ ہو گئے۔

چین کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں اسی قسم کی دیواریں تعمیر کی گئی تھیں جن کے پھاٹک رات کے وقت بند کر دیئے جاتے تھے تاکہ اگر رات کو حملہ آور اچانک دھاوا بول دیں تو شہری اپنا دفاع کر سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چین کی عظمت اور اس کی بانس کی پیداوار، بارود کی ایجاد وغیرہ نے اس کے بہت سے دشمن پیدا کر دیئے تھے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں اس پر قابض ہو کر اپنی بادشاہتیں قائم کرتے رہے۔ اس کے علاوہ چین دنیا کا پہلا ملک تھا جس نے ریشم پیدا کرنے والے کیڑوں کو شہتوت کے درختوں پر پالنا شروع کیا اور اس طرح چینی ریشم نے ساری دنیا میں شہرت حاصل کر لی۔

اس دیوار پر ایک وقت میں سات گھڑ سوار اپنے گھوڑوں کو بھگا سکتے ہیں۔ گو یہ دیوار شروع سے آخر تک ایک جیسی چوڑائی نہیں رکھتی۔ اگر قدیم کتب کا مطالعہ کیا جائے تو 5ویں سے 7ویں صدی تک جو دیواریں تسلسل سے شمالی وائی، شمالی کی اور شمالی زاؤ میں تعمیر کی گئیں 650 کلومیٹر سے 1500 کلومیٹر لمبی تھیں۔ 12ویں صدی عیسوی میں ''جن'' دور میں ایک ایسی دیوار تعمیر کی گئی جو چار ہزار کلومیٹر سے زیادہ طویل تھی۔ اس دیوار نے مشرقی حصے کو محفوظ کر دیا۔ موجودہ دیوار چین زیادہ تر قبل از مسیح منگ عہد میں تعمیر کی گئی اور اس کے ڈیزائن پر بھی توجہ دی گئی۔ حکمت عملی کے لحاظ سے واچ ٹاورز کی بحالی اور انہیں مضبوط بنانے کے پہلو کو مدنظر رکھا

گیا جو اس دور کے لوگوں کی ذہانت کا ثبوت ہے۔

اس وقت حکمران خائف تھے کہ شمال سے منگول حملہ آور پھر نہ لوٹ آئیں۔ اس دور میں منگولیا کے حملہ آور زیادہ تر چین کا رخ کرتے تھے۔ لہٰذا یان، زاؤ اور کن نے اس منصوبے کی تکمیل میں تندہی سے کام لیا۔ اب عظیم دیوارِ چین انسانی تاریخ میں تعمیراتی عجوبہ بن چکی ہے۔ چینی قوم کے لیے قابل فخر بات یہ ہے کہ مقامی ہنرمندوں نے یہ شاہکار پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کی تعمیر کے دوران قیدیوں، سپاہیوں اور مقامی لوگوں سب نے مل جل کر کام کیا۔ یہ چینی لوگوں کی عقل مندی، ہنرمندی اور مسلسل محنت کا نمونہ ہے۔ پوری دنیا کی تعمیراتی تاریخ میں دیوار چین کا تعمیراتی سٹائل شاندار ہے۔ ایک اہم حکمت عملی کے تحت اس دور کے ہتھیاروں کو مدنظر رکھتے ہوئے جگہ جگہ واچ ٹاور اور سگنل ٹاور بنائے گئے جہاں بیٹھے فوجی اس کے دفاع کے لیے پوری طرح تیار رہتے تھے۔

دیوار چین، چین کی تاریخ، ثقافت اور ترقی کی عینی شاہد ہے۔ یہ 20 سے 30 فٹ تک اونچی ہے جبکہ چوڑائی تقریباً پانچ میٹر ہے۔ ہر 100 گز کے فاصلے پر اسے برجوں کے ذریعے مستحکم کر دیا گیا ہے۔ دیوار کے دونوں طرفوں میں نیچے سے اوپر تک اینٹیں یا پتھر لگے ہوئے ہیں بیچ میں مٹی بھری ہوئی ہے مختلف ادوار میں دیوار کی تعمیر کے لیے جو لیبر استعمال کی گئی وہ بھی کچھ کم متاثر کن نہیں تھی۔ مثال کے طور پر جب دیوار کو پہلی مرتبہ کن عہد کے دس سالوں میں جنرل منگ تیان کی زیرنگرانی ملایا گیا تو اس میں 30 ہزار فوجیوں اور سپاہیوں نے حصہ لیا۔ اس کے بعد دیوار کا 150 کلومیٹر حصہ 555ء میں بنایا گیا۔ اس دور میں 18 لاکھ لوگوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ مزدور کی حیثیت میں کام کریں۔ سخت مشقت، تعمیر اور صحت کے لیے ناکافی سہولتوں کی فراہمی سے اس منصوبے کے دوران ہزاروں لاکھوں مزدور ہلاک ہوئے۔ ان میں سے کچھ کو تو دیوار میں چن دیا گیا۔

دیوار چین کی تعمیر میں حصہ لینے والے مزدوروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلے گروپ میں فوجی تھے جو مین فورس کے طور پر کام کرتے تھے۔ دوسرا گروپ مزدوروں کا تھا جن سے زبردستی کام لیا جا رہا تھا اور تیسرے نمبر پر وہ مجرم تھے جنہیں طویل سزائیں سنائی گئی تھیں اور اب جبری مشقت دیوار کی تعمیر کے لیے لی جا رہی تھی۔ ان تینوں قوتوں نے ایک

مضبوط تعمیراتی فوج تشکیل دی جس نے بظاہر ناممکن لیکن عظیم دیوارِ چین کے خواب کو ممکن بنا دیا۔

دیوار چین زیادہ تر مٹی، اینٹوں یا پتھروں سے بنائی گئی۔ چونکہ یہ 5 ہزار کلومیٹر تک پھیلی ہوئی ہے اس لیے مقامی لوگوں نے پہاڑوں کو کاٹا، میدانی علاقے میں وہ میٹریل کو لکڑی کے تختوں کے درمیان رکھ کر دبانے سے پہلے پانی اور مٹی کو مکس کرتے۔ ابتداء میں تو مٹی اور چٹانوں کو زیادہ استعمال کیا گیا جبکہ مینگ دور میں اینٹوں کا استعمال شروع ہوا۔ تعمیراتی میٹریل کے علاوہ دیوار کا ڈھانچہ مقامی حالات اور آب و ہوا کو مدنظر رکھ کر کھڑا کیا گیا۔ مضبوطی اور استحکام کے لیے دیوار کی شکل سیڑھی کی طرح ہے۔ کن وال کے تعمیراتی پہلوؤں کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ چین نے اس شعبے میں بہت پہلے ترقی کر لی تھی۔ انہوں نے لکڑی کا ایک فریم بنایا۔ مزدوروں نے فریم کو گیلی مٹی اور پتھروں کے گارے سے بھر دیا۔ اس طرح چار انچ گہری تہہ بن گئی اور اس کے بعد اوپر تہہ در تہہ لگائی گئی اور دیوار آہستہ آہستہ ایک وقت میں چار انچ بلند ہوتی گئی۔

منگ عہد میں تعمیراتی ٹیکنالوجی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ منگ کی تعمیر کی ہوئی دیوار سانپ کی طرح بل کھاتی اور جادوئی لگتی تھی۔ اسے 70 کے زاویئے پر بنایا گیا۔ منگ وال عام طور پر اینٹوں، پتھروں یا دو قسم کے میٹریل کو مکس کر کے بنائی گئی تھی۔ دیوار کی باڈی اینٹوں سے نمایاں تھی اور اس قدر احتیاط سے کام لیا گیا تھا کہ دیوار کے اندرونی حصوں میں گھاس بھی نہیں اُگ سکتی تھی۔ ٹاپ پر بارش کا پانی نکالنے اور دیوار کو محفوظ رکھنے کے لیے نالیاں بھی تھیں۔ تعمیر کے دوران جب دیوار کسی دریا پر سے گزرتی تو اس کی باڈی کے نیچے ایک واٹر گیٹ بنا دیا جاتا تاکہ ندی کی روانی متاثر نہ ہو۔ دفاعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دیوار پر حفاظتی پلیٹ فارم بھی بنائے گئے جو ایک دوسرے سے زیادہ دور نہ تھے تاکہ نزدیک آئے دشمن کو نشانہ بنایا جا سکے۔

دیوار چین کے مشہور عجوبے کو روزانہ آنے والے ہزاروں ملکی و غیر ملکی سیاحوں کی وجہ سے شدید نقصان پہنچا ہے اور حکومت نے اس دیوار کے ایک بڑے حصے کی بحالی کے لیے غور و غوض شروع کیا۔ سیاحوں نے اس کی تقریباً ہر اینٹ کو کھرچ کر اپنے نام یا محبت کے

جذبات جیسے الفاظ نقش کر دیئے ہیں۔ ایک شخص نے تبصرہ کیا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمین پر کوئی بڑا اخبار ہو۔ دیوارِ چین کی کل لمبائی 63 سو کلومیٹر تھی جس میں سے اب صرف 2500 کلومیٹر کا حصہ اپنی اصلی حالت میں ہے۔

❁ ❁ ❁

زیوس دیوتا کا مجسمہ

(Statue of Zeus at Olympia)

دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک

یونانی دیومالا یا علم الاصنام کی رو سے ''زیوس'' (Zeus) کوہ اولمپس کے مقدس دیوتاؤں کا سردار تھا۔ قدیم یونانی یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگرچہ اُن کے دیوتا غیرفانی اور مافوق الفطرت طاقتوں کے مالک ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان میں کچھ خصوصیات انسانوں جیسی بھی ہوتی ہیں۔ اُن کے اندر حسد، نفرت اور انتقامی جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر یونانی ان دیوتاؤں سے عقیدت رکھتے تھے۔

یونانیوں کے نزدیک زیوس سب سے عظیم دیوتا تھا۔ اُسے دیوتاؤں اور انسانوں کا باپ اور بادشاہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اُن کے نزدیک زیوس میں ربوبیت کی تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ سوائے اس کے کہ تقدیر کی دیوی اس کے قابو میں نہیں تھی۔ زیوس کی شادی اس کی بہن ہیرو یا جونو سے ہوئی تھی۔ اس کے باوجود دوسری کئی دیویوں کے ساتھ اس کے تعلقات تھے۔ وہ دیوی لیڈا کے سامنے ایک راج ہنس کی شکل میں آتا تھا جبکہ یوروپا کے سامنے اپنے آپ کو ایک بیل کی شکل میں ظاہر کرتا تھا۔

یونان کے شمال مشرق میں اولمپس (Olympus) نامی پہاڑ تھا جسے دیوتاؤں کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یونان کے جنوبی شہر اولمپیا میں یونانی اپنے دیوتاؤں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اسی

اولمپیا شہر میں سب سے پہلے 776ق م میں زیوس کے اعزاز میں اولمپک مقابلے منعقد ہوئے تھے۔ ہر چار سال بعد ان اولمپک گیمز کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

پانچویں صدی قبل مسیح میں قدیم یونانیوں نے زیوس کے لیے ایک شاندار مندر بنانے کا فیصلہ کیا جس میں زیوس دیوتا کا مجسمہ رکھا جائے۔ یونانیوں نے جب مندر مکمل کر لیا تو زمانہ قدیم کے مشہور اور عظیم سنگ تراش و مجسمہ ساز فیڈیاس سے زیوس کا شاندار مجسمہ بنانے کی درخواست کی گئی۔ اس وقت فیڈیاس ایتھنز میں پارتھیائی عمارت تعمیر کر رہا تھا۔ لیکن وہ فوراً مجسمہ بنانے اولمپیا چلا آیا۔ تقریباً 433 قبل مسیح میں یہ مجسمہ تیار ہوا۔

یہ دیوہیکل مجسمہ تقریباً 60 فٹ (18 میٹر) اونچا تھا اور سونے و ہاتھی دانت سے بنایا گیا تھا۔ ساری دنیا نے یہ بات تسلیم کی کہ فیڈیاس نے ایک شاندار اور عالیشان مجسمہ تیار کیا ہے۔ مجسمے کی اونچائی، اس کا حسن، اس کی شان و شوکت اور سونے و ہاتھی دانت کے ملے جلے کام نے اس کی وقعت میں اضافہ کر دیا۔ فیڈیاس نے مجسمہ کے مختلف حصے لکڑی اور پتھر سے بنا کر ان پر ہاتھی دانت سے کندہ کاری کی جبکہ مجسمہ کا لباس اور زیورات سونے کے بنے ہوئے تھے۔ تاج زیتون کی لکڑی سے بنا تھا۔ زیوس دیوتا کو جس شاہی تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ اس تخت کو صنوبر کی لکڑی سے بنایا گیا تھا اور یہ تخت سونے، ہاتھی دانت، آبنوس اور قیمتی پتھروں سے مرصع تھا اور اس پر جنگلی جانوروں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ زیوس کے پورے جسم کو ہاتھی دانت سے بنایا گیا جبکہ اس کے بال اور داڑھی سونے کی تھی جبکہ آنکھوں میں قیمتی پتھر لگائے گئے تھے۔

زیوس کے دائیں ہاتھ میں سونے اور ہاتھی دانت سے بنا فتح کی دیوی کا ایک اور مجسمہ تھا جبکہ بائیں ہاتھ میں ایک عصا تھا جس کے سرے پر ایک عقاب بیٹھا تھا۔ 60 فٹ بلند یہ مجسمہ مندر کی چھت تک پہنچتا تھا۔ قدیم سکوں پر زیوس کی جو شبیہ کندہ ہے اس کے مطابق زیوس کے بال لمبے، داڑھی گھنی اور مونچھیں نوکیلی تھیں۔ مندر میں آخری سرے پر بیٹھا یہ دیوپیکر مجسمہ بڑا شاندار تھا۔

زیوس مجسمہ کے متعلق ایک روایت بہت مشہور ہے کہ رومن بادشاہ گیلی گولا جو خود بھی دیوتا کہلاتا تھا نے زیوس کے مجسمے کے سر کو روم لے جانے اور اس کی جگہ اپنے سر کا مجسمہ

نصب کروانے کے لیے آدمی اولمپیا بھیجے لیکن جب یہ لوگ زیوس کا سر اتارنے کے لیے مندر میں داخل ہوئے تو مندر میں چاروں طرف سے خوفناک قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جن سے خوفزدہ ہو کر یہ لوگ بھاگ گئے۔

بعدازاں یہ مجسمہ اچانک غائب ہو گیا۔ معلومات کے مطابق شہنشاہ تھیروڈورس اس مجسمے کو قسطنطنیہ لے گیا جہاں 475ء میں ایک آتشزدگی کے دوران یہ مجسمہ جل کر تباہ ہو گیا۔ لیکن اس مندر کے کھنڈرات اب بھی اولمپیا (یونان) میں موجود ہیں اور وہ سانچے جن میں فیڈیاس نے سونا بھر کر مجسمہ کے مختلف حصے بنائے تھے حال ہی میں دریافت ہوئے۔

❁ ❁ ❁

مسولیس کا مقبرہ

(Mausoleum at Halicarnassus)

دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک

ایشیائے کوچک (ترکی) کا شہر ہیلی کارنیسس جو اب بوڈرم (Bodrum) کہلاتا ہے میں شاہ مسولیس کا مقبرہ دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا تھا۔ یہ مقبرہ ایشیائے کوچک کے علاقے کریا کے حکمران شاہ مسولیس (Mausollus) کی رفیقہ حیات ملکہ آرٹی میسیا (Artemisia) نے اپنے شوہر نامدار کا نام باقی رکھنے کے لیے بنوایا۔ اس کی تعمیر تقریباً 350 قبل مسیح میں ہوئی۔

چوتھی صدی ق م میں ایران کے ایک صوبے ''کریا'' پر مسولیس کی حکمرانی تھی۔ 353 ق م میں جب مسولیس مرا تو اس کی ملکہ آرٹی میسیا جو اس کی بہن بھی تھی اس کے غم میں اس قدر رنجیدہ اور غمزدہ ہوئی کہ اس نے بادشاہ کے جسم کی راکھ کو شراب میں حل کر کے پی لیا۔ بادشاہ کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھنے کے لیے ملکہ نے فیصلہ کیا کہ اس کی یاد میں ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرائے گی۔

ملکہ نے اس کے لیے یونانی عمارت سازوں اور معماروں کی خدمات حاصل کیں۔ ان میں معروف ماہر تعمیرات پیتوریس اور سیٹاروس کے علاوہ ماہر سنگ تراش اور مجسمہ ساز اسکوپس، بریاکس، لیو چیرز اور تیموتھوس بھی شامل تھے۔ یہ عمارت مستطیل یا قائم الزاویہ تھی۔

اس کے بعد اس پر درجہ بہ درجہ سیڑھیاں تعمیر کر کے اس پر ایک ہرم بنایا گیا تھا جس پر ایک چار گھوڑوں والی رتھ پر بادشاہ اور ملکہ کے مجسمے دکھائے گئے تھے۔ بادشاہ کے مجسمے کی اونچائی دس فٹ تھی۔

جب یہ مقبرہ شروع ہوا تو اس کے تین سال بعد ہی 350 ق م میں ملکہ آرٹی میسیا کا انتقال ہو گیا مگر ابھی مقبرہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ یونانی کاریگروں نے اپنے نام اور شہرت کی وجہ سے جلد از جلد اس کام کو مکمل کیا۔ جب یہ مقبرہ مکمل ہوا تو وہ اتنا شاندار اور خوبصورت تھا کہ اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہونے لگا۔

مسولیس کی اس یادگار نے اتنی شہرت حاصل کر لی کہ جو بھی یادگاری مقبرہ تعمیر کیا جاتا تو اسے ''میسولیم'' ہی کہا جاتا۔ یہ مقبرہ زمین کے مربع قطعہ پر بنایا گیا اور اس کے چاروں طرف ستونوں کو مہارت سے تراش کر لگایا گیا تھا۔ بنیاد سے اوپر سنگ مرمر کے 36 ستونوں کی قطار تھی اور ان ستونوں نے اپنے اوپر ایک مخروطی مینار اٹھا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ ہوا میں تیر رہا ہو۔ اس مخروطی مینار کی چوٹی پر سنگ تراشی کر کے ایسی رتھ بنائی گئی تھی جسے چار گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ اس رتھ میں مسولیس اور آرٹی میسیا کے مجسمے کھڑے تھے۔

مقبرہ کی پوری عمارت 43 میٹر (141 فٹ) بلند تھی۔ یہ مقبرہ 14ویں صدی عیسوی تک قائم رہ سکا اور پھر یہ ایک زلزلے کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ 15ویں صدی کے شروع میں رہوڈس کے سپاہیوں نے بوڈرم پر قبضہ کر لیا اور انہوں نے اس مقبرے کے زیادہ تر ملبے کو ایک قلعہ کی تعمیر میں لگا دیا۔ اس مقبرے کے کچھ آثار برطانوی میوزیم میں محفوظ کیے گئے ہیں۔

جزیرہ رہوڈز پر سورج دیوتا کا بت

(Colossus of Rhodes)

دنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے ایک

ایشیائے کوچک (ترکی) کی بندرگاہ سے 19 کلومیٹر (12 میل) دور بحیرۂ ایجیئن میں ایک خوبصورت جزیرہ رہوڈز (Rhodes) واقع ہے۔ یہ سورج کے دیوتا ہیولس کے حوالے سے مشہور ہے۔ اپنے دور کا ایک اہم تجارتی مرکز بھی تھا۔ اس جزیرے کی تاریخ کافی قدیم اور دلچسپ ہے۔

جزیرہ رہوڈز پر زمانہ قدیم سے ہی یونانی قابض رہے ہیں لیکن مختلف اوقات میں اس جزیرے پر رومی، ایرانی، عرب اور ترک بھی حکومت کرتے رہے۔ مختلف زمانوں میں جن قوموں نے یہاں حکومت کی وہ اپنے اپنے فن تعمیر کے نمونے بھی چھوڑ کر گئے اور یوں یہ جزیرہ اپنے زمانے میں فن تعمیر کا بہترین مرکز بن گیا۔ اسی جزیرہ میں تقریباً 280 قبل مسیح میں یہاں کے لوگوں نے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے اس کا دیوپیکر مجسمہ تعمیر کیا جو ان کے خیال میں بیرونی حملہ آوروں سے ان کی حفاظت کرتا تھا۔

یہ 312 قبل مسیح کا واقعہ ہے کہ مصر کے بادشاہ بطلیموس (Ptolmy) کی مقدونیہ کے بادشاہ انٹی گونز (Anti Gonus) سے جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کے دوران اہل رہوڈز نے بطلیموس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے نتیجے میں بطلیموس فتح یاب ہوا اور مقدونیہ کو شکست ہوگئی۔ اس

جنگ کے بعد مقدونیہ کے عوام اور حکمران اہل رہوڈز سے نفرت کرنے لگے اور رہوڈز پر حملہ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ چند سال بعد انہیں اس کا موقع ملا اور انہوں نے بحری جہازوں کے عظیم بیڑے کے ساتھ رہوڈز پر حملہ کر دیا۔ مقدونیہ کی ان گنت فوج کا اہل رہوڈز نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور ایک سال تک مقدونین فوج کو روکے رکھا۔ بالآخر یہ محاصرہ مقدونیہ کی شکست پر ختم ہوا۔

رہوڈز کا دفاع کرنے والوں میں ایک مجسمہ ساز چیرز آف لنڈیز بھی تھا۔ مقامی لوگوں نے اس مجسمہ ساز سے درخواست کی کہ وہ اس فتح کی خوشی میں اور اہل رہوڈز کی طرف سے حب الوطنی کے اظہار کے طور پر سورج دیوتا کا دھات کا ایک مجسمہ بنائے۔ اس مجسمہ کو زیادہ یادگاری بنانے کے لیے مجسمہ ساز نے اُن بچے کھچے دھات کے ٹکڑوں سے ایک ایسا مجسمہ تیار کیا جو مقدونیہ کی فوجیں ٹوٹے ہوئے جہازوں اور ہتھیاروں کی شکل میں ساحل سمندر پر چھوڑ گئی تھیں۔

اس کو مجسمہ ساز نے آٹھ دھاتوں سے بارہ سال کی محنت کے بعد مکمل کیا۔ اس نے یہ مجسمہ 292 قبل مسیح سے 280 قبل مسیح کے دوران بنایا۔ مجسمہ ساز کے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ جب مجسمہ مکمل ہو گیا تو اچانک اسے اندازہ ہوا کہ اس نے مجسمہ بنانے میں ایک بڑی غلطی کر دی ہے۔ اسے اپنی غلطی کا اس شدت سے افسوس ہوا کہ اس نے خودکشی کر لی۔ لیکن اس کے باوجود یہ مجسمہ اس قدر دلکش اور بڑا تھا کہ دنیا کے عجائبات میں شمار ہونے لگا۔

چمکدار کانسی کا یہ مجسمہ یا بت 120 فٹ بلند تھا اور اس کا وزن 295 ٹن تھا۔ یہ دیوپیکر مجسمہ بندرگاہ کے باب الداخلہ پر ایستادہ کیا گیا تھا۔ یہ ایک خلیج پر نصب کیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ اتنا بڑا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ خلیج کے ایک طرف اور دوسری ٹانگ دوسری طرف ہوتی تھی۔ یعنی یہ پوری بندرگاہ کو اپنی ٹانگوں کے درمیان لیے کھڑا تھا اور بحری جہاز اس کی کھلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان سے گزر جاتے تھے۔ ایک بہت بڑا آئینہ مجسمہ کے سینے میں جڑا تھا۔ یہ آئینہ اتنا روشن اور شفاف تھا کہ جب بھی کوئی بحری جہاز مصر کی بندرگاہ سے روانہ ہوتا اس کا عکس رہوڈز کی بندرگاہ پر اس آئینے میں نظر آ جاتا تھا۔

قدیم عجائبات میں اس مجسمے کی عمر سب سے کم تھی۔ اس کو مکمل ہوئے ابھی 56 سال

بھی نہیں گزرے تھے کہ 227 قبل مسیح یا 224 قبل مسیح میں ایک زلزلہ آیا تو یہ دیو پیکر مجسمہ سمندر میں غرقاب ہو گیا۔ اس مجسمے کے کچھ ٹکڑے پہلی صدی عیسوی تک ساحل سمندر پر موجود تھے۔ ایک رومی مورخ پلینی نے انہیں ساحل سمندر پر دیکھا اور ان کے بارے میں لکھا کہ مجسمہ کا انگوٹھا اتنا بڑا تھا کہ کئی آدمی مل کر اسے اٹھاتے تھے۔

7ویں صدی عیسوی میں جب عرب جزیرہ رہوڈز پر قابض ہوئے تو اس کے ٹکڑے یہودی تاجروں کو فروخت کر دیئے گئے۔ یہ تاجر ان ٹکڑوں کو اٹھانے کے لیے سو اونٹ لے کر آئے۔ ان اونٹوں نے نو چکر لگائے تب جا کر سارا ملبہ ساحل سمندر سے اٹھایا جا سکا۔

1953ء میں ایک ماہر ''ہربرٹ میریان'' نے نشاندہی کی بندرگاہ 600 فٹ چوڑی تھی اس لیے یہ نظریہ کہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سے بحری جہاز گزر جاتے تھے صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ یہ مجسمہ بندرگاہ کی کسی جانب ایستادہ ہو۔

❀ ❀ ❀

تاج محل

(Taj Mahal Agra)

دنیا کا آٹھواں عجوبہ

تاج محل کا نام سنتے ہی یا تصویر دیکھتے ہوئے انسان میں محبت کے لطیف جذبات جنم لینے لگتے ہیں۔ تاج محل دنیا کی خوبصورت ترین عمارتوں میں سے ایک ہے جسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیا جاتا ہے۔ دہلی سے 220 کلومیٹر کے فاصلے پر آگرہ کا شہر واقع ہے۔ کبھی یہ شہر مغل سلطنت کا دارالحکومت ہوتا تھا۔ راس کماری سے کابل تک یہاں سے سکہ چلتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب مغلیہ سلطنت ختم ہوگئی تو آگرہ کی محل سرائیں بھی اجڑنے لگیں اور دہلی کی رونقیں لوٹنے لگیں۔ آج نئے ذہنوں میں اگر آگرہ آتا ہے تو اس کی وجہ مغلیہ سلطنت کا دارلحکومت نہیں بلکہ تاج محل ہوتا ہے جسے ہر سال دنیا بھر سے دیکھنے سیاح لاکھوں کی تعداد میں بھارت آتے ہیں۔

تاج محل کو محبت کی یادگار کہا جاتا ہے۔ اسے جدید دنیا کے عجوبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دریائے جمنا کے مغربی کنارے پر واقع تاج محل کی تعمیر 17 ستمبر 1613ء کو اس وقت ہوئی جب اس وقت کے مغل بادشاہ شاہ جہاں کی دوسری بیوی ارجمند بانو دنیا سے رخصت ہوگئی جس سے شاہ جہاں کو بہت محبت تھی۔ شاہ جہاں نے ارجمند بانو جو ممتاز محل کے نام سے مشہور ہے کی یاد میں ایسی اعلیٰ یادگار بنانے کا حکم دیا جو دنیا بھر میں منفرد ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جس معمار

نے تاج محل کا نقشہ تیار کیا اس کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے کہ دوبارہ وہ کبھی اس سے خوبصورت عمارت کا نقشہ نہ تیار کر سکے۔

ارجمند بانو (ممتاز محل) اور شاہ جہاں کی شادی 1612ء میں ہوئی اور 18 سالوں میں ممتاز محل نے شاہ جہاں کے 14 بچوں کو جنم دیا۔ ملکہ فوجی مہمات میں بھی اپنے شوہر کے ساتھ ہوتی تھی۔ 1630ء میں برہان پور میں اسی طرح کی ایک مہم کے دوران ملکہ نے اپنے آخری بچے کو جنم دیا اور پیدائش میں پیچیدگی کے باعث انتقال کر گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی بیماری کے دوران ہی ممتاز محل نے بادشاہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر شاندار مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ اس خواہش کے احترام میں بادشاہ نے فوری طور پر مقبرہ کی تعمیر کے احکامات جاری کیے۔ فن تعمیر کا یہ نادر نمونہ پانچ عناصر پر مشتمل ہے۔ دروازہ، باغیچہ، مسجد، نقار خانہ یا آرام گاہ اور روزہ یا تاج محل مقبرہ۔

تاج محل کی تعمیر کے بارے میں تو مختلف کہانیاں تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں لیکن شاہ جہاں اور ممتاز محل کے ملنے کی داستان بھی اپنی جگہ خاصی دلچسپ ہے۔ ارجمند بانو، ملکہ نور جہاں کے بھائی آصف خان کی صاحبزادی تھی۔ ملکہ نور جہاں نہیں چاہتی تھی کہ ارجمند بانو کی شادی شاہ جہاں سے ہو جو اس وقت مغل بادشاہ جہانگیر کا ولی عہد تھا۔ ملکہ نور جہاں کی خواہش تھی کہ شاہ جہاں کی بجائے اس کے داماد شہریار کو ولی عہد بنایا جائے۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے شاہ جہاں کے خلاف سازش کی اور شہنشاہ جہانگیر کو کہہ کر اسے حیدرآباد دکن کو فتح کرنے بھیج دیا۔ جہاں سے شاہ جہاں کی واپسی کے امکانات بہت کم تھے۔ لیکن کرنا کیا ہوا کہ شاہ جہاں نے حیدرآباد دکن کو فتح کر لیا۔ جب یہ اطلاع دارالحکومت پہنچی تو ملکہ نور جہاں نے اپنے بھائی آصف خان کو بلا کر تنبیہ کی کہ وہ شاہ جہان کے ساتھ ارجمند بانو کی شادی نہ کرے۔ آصف خان نے لیت و لعل سے کام لیا تو نور جہاں نے اسے خبردار کیا کہ وہ شاہ جہان کو واپس آنے ہی نہیں دے گی۔ جس کے بعد نور جہاں نے شہنشاہ جہانگیر کو کہہ کر شاہ جہان کو نائب السلطنت کا خطاب دلوا دیا کہ یہ اسے حیدرآباد دکن فتح کرنے کی خوشی میں دیا جا رہا ہے اور اب اسے واپس آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ راستے سے ہی واپس لوٹ کر حیدرآباد دکن کا انتظام سنبھال لے۔

شاہ جہاں نے شاہی حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سفر جاری رکھا۔ شاہی محل میں جب وہ ارجمند بانو سے گفتگو کر رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ ''میں اپنی ایک شرط پوری ہونے تک حیدر آباد دکن واپس نہیں جاؤں گا۔'' شہنشاہ جہانگیر پیچھے موجود تھا۔ اس نے شرط پوچھی تو شاہجہاں نے کہا ''ارجمند بانو سے شادی''۔ چنانچہ جہانگیر نے دونوں کی شادی کروا دی۔ یوں ملکہ نور جہاں کی کوششیں رائیگاں گئیں۔ لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد جب شاہ جہاں اور ارجمند بانو جو ممتاز محل کا لقب پا چکی تھی حیدر آباد دکن میں رہ رہے تھے۔ ایک روز ملکہ نور جہاں کی طرف سے بھیجا ہوا ایلچی وہاں پہنچا جس نے خبر دی کہ ممتاز محل کے والد آصف خان شدید بیمار ہیں۔ ممتاز محل یہ خبر سن کر بے چین ہوگئی اور جلدی میں شاہ جہاں کی اجازت سے ایک محافظ لے کر ساتھ نکل پڑی۔ راستے میں ایلچی نے دولت کا لالچ دے کر محافظ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ جب یہ دہلی پہنچے تو ایلچی نے ممتاز محل کو پائیں باغ میں انتظار کرنے کو کہا۔ سازش کے مطابق شاہ جہاں کا بھائی خسرو پرویز باغ میں ایسے سامنے آیا جیسے اچانک سامنا ہوا ہو۔ وہ ممتاز محل سے الفت کا اظہار کرنے لگا۔ ممتاز محل نے اسے جھڑکا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ ملکہ نور جہاں بھی وہاں پہنچ گئی اور ممتاز محل کو سرزنش کی کہ تم ہمیں اطلاع کیے بغیر یہاں کیسے پہنچ گئی اور خسرو کے ساتھ تمہارے کیا مراسم ہیں۔

یہ واقعہ ایلچی اور محافظ بھی دیکھ رہے تھے۔ ایلچی محافظ کو لے کر فوراً حیدر آباد دکن واپس پہنچا اور شاہ جہاں کے سامنے اس واقعے کو ایسا بنا کر پیش کیا جیسے ممتاز محل نے سارا ڈرامہ خود رچایا ہو۔ شاہ جہاں نے تصدیق کے لیے محافظ سے پوچھا تو اس نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ شاہ جہاں کو ممتاز محل کی ''بے وفائی'' کا شدید صدمہ پہنچا۔ اس دوران ملکہ نور جہاں نے جہانگیر کی طرف سے اسے افغانستان کی مہم کے احکامات بھجوا دیئے۔ تصدیق کا وقت نہیں تھا اور ممتاز محل بھی موجود نہیں تھی۔ دوسری طرف ممتاز محل نے سازش کی بو پاتے ہی فوراً واپسی کا سفر کیا اور اس وقت حیدر آباد دکن پہنچی جب شاہ جہاں افغانستان کی مہم پر جانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ ممتاز محل جاتے ہی شاہ جہاں کے قدموں میں گر گئی۔ ملکہ نور جہاں کی یہ سازش بظاہر کامیاب ہو چکی تھی لیکن ممتاز محل کی طرف سے حقیقت بتانے کے بعد شاہ جہاں نے اپنے ذرائع سے تحقیق کا فیصلہ کیا جس سے ممتاز محل کی بے گناہی ثابت ہوگئی۔ یہی

وہ موقع تھا جب دونوں کی محبت نے جنون کی شکل اختیار کر لی اور مرنے کے بعد بھی وہ اپنی محبت کے ذریعے امر ہو گئے۔

شاہ جہاں اور ممتاز محل کی شادی 1612ء میں ہوئی اور 19 برس قائم رہی۔ 1630ء میں جب ممتاز محل کے ہاں زہرآراء کی پیدائش ہوئی تو وہ زچگی ہی میں فوت ہو گئی۔ ممتاز محل کی موت کا شاہ جہاں نے شدید غم لیا اور ساری زندگی شادی نہ کی اور ممتاز محل سے اپنی محبت کو تاج محل کی صورت میں امر کر دیا۔

تاج محل کی خوبصورتی تو مصدقہ ہے لیکن اس کے آغاز، تعمیر، مدت تعمیر اور لاگت کے حوالے سے مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت جو سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس کے مطابق 1630ء میں ہی تاج محل کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ ایران اور یورپ کے باہر تعمیرات نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ 20 ہزار سے زائد مزدوروں نے 20 برس میں اس کی تعمیر کی اور 27 ستمبر 1654ء کو اس کی تعمیر 22 برس بعد مکمل ہوئی۔ اس پر تین کروڑ 20 لاکھ روپے لاگت آئی۔ ایک قدیم نسخے کے مطابق جو شاہ جہاں کے ایک درباری سے منسوب ہے۔ جس کے مطابق ممتاز محل نے مرتے وقت شاہ جہاں سے دو وعدے لیے۔ ایک تو وہ مزید شادی نہیں کریں گے اور دوسرا ان کی یاد میں بے نظیر عمارت تعمیر کریں گے۔

قدیم نسخے کے مطابق شاہ جہاں نے ممتاز محل کی وفات کے بعد عمارت کے لیے دریائے جمنا کے کنارے جگہ مخصوص کر دی اور نقشے بنانے کا حکم دے دیا۔ ممتاز محل کی میت کو 6 ماہ تک مقبرے سے باہر چوک کے دروازے پر جو دوسری زمین موجود تھی ہاں امانتاً رکھ دیا گیا۔ مقبرے کی عمارت کے لیے جو نقشے پیش کیے گئے شاہ جہاں نے ان میں سے ایک نقشہ پسند کیا۔ اس کے مطابق لکڑی کا روضہ تعمیر کیا گیا۔ تاج محل کی تعمیر شروع ہوئی تو سترہ مختلف مقامات جن میں بغداد اور یمن کے علاقے شامل تھے سے سنگ مرمر منگوایا گیا۔ 17 سال کی مدت میں تاج محل تعمیر ہوا جس پر 6 کروڑ 52 لاکھ 321 روپے 10 آنے لاگت آئی۔ شاہ جہاں کے ایک درباری عبدالحمید لاہوری کے مطابق تاج محل 12 سال میں تعمیر ہوا اور اس کی تعمیر کا آغاز ممتاز محل کی وفات کے چھ ماہ بعد 17 ستمبر 1631ء کو شروع ہوا۔

تاج محل جس کے معنی ہیں ''ملکہ کا تاج'' ایک بہت بڑے مستطیل باغ میں بنایا

گیا۔ اس کے چاروں طرف سرخ ریت کی دیوار ہے۔ باغ کے دوسرے سرے پر ایک خوبصورت دروازہ ہے جس میں قیمتی پتھر جڑے ہیں اور سفید سنگ مرمر میں قرآنی آیات کی دلکش خطاطی کی گئی ہے۔ اس باغ کو جیومیٹریکل ڈیزائن میں ایران کے باغات کی طرز پر اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہ باغ پورا کا پورا مقبرہ کا ایک حصہ نظر آتا ہے۔ سنگ مرمر کی دو نہریں جو اس مربع نما باغ کے درمیان میں آپس میں ملتی ہیں اس باغ کو چار برابر حصوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ گنبد اور مرکزی راستے کے درمیان میں سنگ مرمر کا بنا مچھلیوں کا تالاب ہے جس میں ہر وقت مقبرہ کا عکس منعکس ہوتا رہتا ہے۔

بنیادی طور سے تاج محل ایک مربع نما عمارت ہے جو مربع نما سرخ پتھر سے بنے پلیٹ پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر شاندار خوبصورت مینار ہیں۔ اس عمارت میں سب سے دلکش اس کا گنبد ہے جو اس عمارت کے درمیان میں سے ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ گنبد کا قطر 70 فٹ اور پوری عمارت 120 فٹ بلند ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر چار چھوٹے گنبد ہیں۔ عمارت کی ہر سمت پر نوکیلی محرابیں مقبرہ کے لیے ایک شاندار دروازہ بناتی ہیں۔ مرکزی دروازہ کی محرابوں کے ساتھ چھوٹی محرابیں ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر بنی ہوئی ہیں۔ اس کا فرش شطرنج کی بساط کی مانند سفید اور سیاہ ماربل سے بنایا گیا ہے جو بہت متاثر کن ہے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی تمام آیات اس مقبرہ پر لکھ دی گئیں جو نہ صرف اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں بلکہ عمارت کے اندرونی ڈیزائن کا ایک حصہ ہیں۔ خطاطی کا یہ اہم ترین کام شیراز (ایران) کے ماہر خطاط امانت خان نے کیا تھا۔ امانت خان شیرازی کا نام ہی وہ واحد نام ہے جو تاج محل کے گنبد کی اندرونی طرف لکھا ہوا ہے اور جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ تاج محل کے طرز تعمیر کو دیکھا جائے تو اس میں بڑی خوبصورتی سے مغلیہ طرز تعمیر میں ایرانی، وسطی ایشیائی اور اسلامی رنگ شامل کیا گیا ہے۔ محرابوں پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔

تاج محل کے مرکزی کمرے میں ممتاز محل اور شاہ جہاں کے پتھر کے تابوت رکھے ہیں جن پر بڑے نفیس اور باریک نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ ان کے جسم بہت نیچے قبروں میں دفن ہیں۔ شاہ جہاں اور ممتاز محل کے ان نمائشی تابوتوں پر پچی کاری کا دلکش کام کیا گیا ہے جن میں 35 قسم کے قیمتی پتھر جڑے ہیں اور دلکش خطاطی میں ملکہ، بادشاہ کی تعریف اور اللہ تعالیٰ کی

ثناء کی گئی ہے۔ ان تابوتوں کے اردگرد سنگ جراحت کی ایک سکرین پر نہایت باریک جالی بنائی گئی ہے جس پر طلائی تاروں سے کام کیا گیا ہے۔ تاج محل کی دوسری جانب سرخ ریت کے پتھر سے بنی تین گنبدوں والی ایک مسجد ہے جس کا مقصد محض تعمیراتی حسن کا اظہار تھا۔ اس کو نماز کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔

جامعہ الازہر

(Al-Azhar University)

عالم اسلام کی سب سے قدیم یونیورسٹی

مصر کی الازہر یونیورسٹی اپنے علمی و ادبی معیار کی بدولت عالم اسلام بلکہ پوری دنیا میں شہرت رکھتی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ الازہر یونیورسٹی کی بنیاد ایک مسجد پر رکھی گئی جس کا نام مسجد الازہر ہے۔ جب سسلی کی فوجوں کے کمانڈر نے خلیفہ المعاذ کے حکم پر مصر کو فتح کیا تو اس نے 969ء (358ھ) میں قاہرہ (Cairo) کی بنیاد رکھی جس میں الازہر نامی مسجد بھی تعمیر کی گئی۔

مسجد کی تعمیر میں دو سال کا عرصہ لگا۔ اس مسجد میں پہلی نماز ۷ رمضان المبارک 361ھ کو پڑھائی گئی۔ اس مسجد کو بعد میں یونیورسٹی میں تبدیل کر دیا گیا جو بعدازاں جامعہ الازہر کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہوئی۔ جامعہ الازہر اس وقت عالم اسلام کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہے۔ تاریخ دان اس کا نام الازہر رکھے جانے میں اختلاف کرتے ہیں۔ ہر کوئی الگ وجہ بیان کرتا ہے۔ کچھ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ اس کا نام الازہر اس لیے رکھا گیا کیونکہ جس وقت اس شہر کی بنیاد رکھی گئی اس جگہ پر خوبصورت مکانات بنے ہوئے تھے جبکہ کچھ کا کہنا ہے کہ اس کا نام حضرت فاطمۃ الزہرہؓ سے عقیدت و محبت کی بناء پر رکھا گیا۔ یہی توجیح زیادہ درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس وقت کے مسلمان حکمران حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے خاندان .

سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔

مسجد کی تعمیر کے ساڑھے تین سال بعد یہاں مختلف علوم کی باقاعدہ کلاسز شروع کی گئیں۔ خلیفہ المعاذ کے ہی دور میں اکتوبر 975ء (رمضان 365ھ) میں امام ابوحنیفہؒ کے بیٹے قاضی القضاہ ابوالحسن علی النعمان الخیروائی نے اپنے والد کی شیعہ مکتبہ فکر کی فقہہ کے بارے میں لکھی گئی کتاب ''الاختصار'' پڑھی جس سے سینکڑوں لوگوں نے استفادہ کیا۔ اس لیکچر میں شرکت کرنے والے تمام افراد کے نام یادداشت کے طور پر محفوظ کر لیے گئے۔ ابوالحسن پہلے شخص تھے جنہیں چیف جسٹس (قاضی القضاہ) کے لقب سے نوازا گیا۔ الازہر میں ہونے والے اس سیمینار کی تقلید میں دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی سیمینار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جامع الازہر میں ہونے والے سیمینار مذہبی موضوعات پر ہوتے تھے۔ تاہم ان پر سیاسی رنگ نمایاں نظر آتا تھا۔ خلیفہ العزیز باللہ کے دور حکومت میں جامعہ الازہر میں تعلیمی اصلاحات کی گئیں۔ اسی دور میں خلیفہ العزیز باللہ کے وزیر یعقوب ابن کلیس نے جامعہ الازہر میں شیعہ قانون کے متعلق اپنی کتاب ''الرسالہ العزیزیہ'' پڑھ کر سنائی۔ یعقوب ابن کلیس نے جامعہ میں تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے 30 قانون دانوں کو نوکری دی اور ان کے لیے ماہانہ تنخواہ اور جامعہ کے قریب رہائش گاہوں کا بندوبست کیا۔

جامعہ میں خواتین کی اخلاقی تربیت کے لیے بھی سیمینار کا اہتمام کیا گیا۔ جامعہ کو دو سو سال تک عدالتی کارروائیوں اور ٹیکسوں کے نظام کی بہتری کے لیے استعمال کیا جاتا رہا اور اس سلسلے میں جامعہ سے ہر قسم کی رہنمائی حاصل کی جاتی رہی۔ بغداد اور اندلس میں اسلامک کلچرل مراکز کی تباہی تک جامعہ کو اسلامی دنیا کے تعلیمی اداروں میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ جامعہ میں ہونے والے سیمینار پہلے دن سے ہی خالصتاً تعلیمی و ادبی نوعیت کے تھے۔ ان سیمینار میں شرکت بالکل مفت تھی اور بعض افراد کو وظائف بھی دیئے جاتے۔ تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے جامعہ کے باقاعدہ اساتذہ کے علاوہ مختلف علوم کے ماہرین کو بھی لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جاتا۔ سیاحتی اساتذہ کے ذریعے تعلیم دینے کا یہ نظام اتنا کامیاب ہوا کہ بعد میں مشرق و مغرب کے دیگر تعلیمی اداروں نے اپنا لیا۔

648ھ مملوکوں کے دور اقتدار میں جامعہ الازہر نے بہت ترقی کی۔ انہوں نے

جامعہ کی بہتری کے لیے بہت سے اقدامات کیے۔ وسط ایشیا پر مغلوں کے حملے اور اندلس میں مسلمانوں کے زوال کے بعد عالموں اور دانشوروں کے لیے زمین تنگ پڑ گئی۔ اس دوران زیادہ تر دانشوروں نے جامعہ الازہر میں پناہ لی۔ ان علماء کے آنے سے جامعہ نے بہت زیادہ ترقی کی۔ 8ویں اور 9 صدی ہجری میں جامعہ اپنے علمی معیار کی وجہ سے عروج پر تھی۔ جامعہ نے سائنسی علوم کی ترقی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ جامعہ کے کچھ دانشوروں اور اساتذہ نے علم الادویات، ریاضی، فلکیات، جغرافیہ اور تاریخ کی ترقی کے یے بہت محنت کی۔

جامعہ مصر میں سیاسی انتشار کے باوجود علمی و ادبی خدمات سرانجام دیتی رہی۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں جامعہ الازہر کو ملنے والے عطیات کی وجہ سے جامعہ خود مختار ادارے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ علماء کو نئے نئے موضوعات پر تحقیق کرنے کے بھرپور مواقع میسر آئے۔ اس طرح جامعہ اسلامی اور عربی علم کا مرکز بن گئی۔ عثمانی حکمرانوں نے کبھی بھی جامعہ کے معاملات میں مداخلت نہ کی اور نہ ہی جامعہ کے بڑے عہدے ''امام'' پر اپنی مرضی کے آدمی لانے کی کوشش کی۔ اس بڑے عہدے کو مصریوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تاکہ کوئی باہر کا آدمی جامعہ پر اپنا حق نہ جتا سکے۔

جولائی 1789ء میں جب نپولین بوناپارٹ نے مصر پر حملہ کیا تو وہ جامعہ کے تعلیمی معیار اور نظم و نسق سے بہت متاثر ہوا۔ نپولین نے اپنی ذاتی ڈائری میں جامعہ الازہر کے تعلیمی معیار کو پیرس کی سوربون یونیورسٹی کے معیار کے برابر قرار دیا اور وہاں کے اساتذہ اور طالب علموں کو عوام اور ملک کے لیے عظیم سرمایہ قرار دیا۔ نپولین نے مصر پر قبضہ کے دوران قاہرہ میں ''دیوان'' کے نام سے ایک مشاورتی کونسل بنائی جو حکومتی معاملات میں مشورے دیتی تھی۔ اس کونسل میں 9 علماء شامل تھے جس کے چیئرمین شیخ عبداللہ الشرکاوی تھے جو الازہر یونیورسٹی کے بڑے امام تھے۔ دیگر 9 علماء بھی جامعہ میں تدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نپولین کی نظر میں الازہر یونیورسٹی کے علماء کی کیا وقعت تھی۔

جب انقلاب فرانس برپا ہوا تو اسی جامعہ میں فرانسیسیوں اور انقلابیوں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ اس کمیٹی کی صدارت شیخ محمد السادات نے کی۔ مذاکرات کی ناکامی پر انقلاب میں شدت آ گئی جس کے نتیجہ میں بڑے امام اور دیگر علماء نے فیصلہ کیا کہ جامعہ کو

نقصان سے بچانے کے لیے اسے بند کر دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ تاریخ میں پہلی مرتبہ اتنے طویل عرصہ کے لیے جامعہ بند کی گئی۔ تقریباً تین سال تک جامعہ میں کسی قسم کی تعلیمی سرگرمیاں نہیں ہوئیں۔ فرانسیسیوں کے جانے کے بعد حسب معمول تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

1805ء میں مصر میں محمد علی پاشا کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے مصر کو جدید ریاست بنانے کا ارادہ کیا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسے جامعہ الازہر پر انحصار کرنا پڑا۔ اس نے جامعہ کے طلباء کو وظائف پر پڑھنے کے لیے یورپی ممالک میں بھیجا۔ ان طلباء نے جدید تعلیم حاصل کی اور واپس آ کر ملکی ترقی میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ان طلباء میں سعد زغلول پاشا (وزیراعظم)۔ محمد عبدو وغیرہ نمایاں ہیں۔ جامعہ الازہر پر ایک دور ایسا بھی آیا جب مسلمان اور عیسائی علماء مل کر لوگوں سے خطاب کیا کرتے تھے اور اس قسم کے اجتماعات میں عوام شرکت کرتے تھے۔

19ویں صدی کے آخری نصف میں مصر میں اسلامی تحریک شروع ہوئی جس نے جامعہ کو کافی متاثر کیا۔ 1872ء میں جامعہ نے ایک قانون منظور کیا جس کے تحت ڈگریاں جاری کی جانے لگیں۔ 1930ء میں دوسرا قانون پاس کیا گیا جس میں الازہر یونیورسٹی کے مختلف کالجوں اور فیکلٹیوں میں پڑھائے جانے والے مضامین کو دوبارہ منظم کیا گیا۔ جامعہ الازہر میں دنیا بھر کے مسلم ممالک سے طلباء داخلہ لے سکتے ہیں۔

مسجد الحرام

(The Holy Mosque of Mecca)

روئے زمین پر خدائے واحد کا پہلا گھر

ریتلے راستوں اور فطری انداز میں بنی وادیوں میں سے ایک وادی ابراہیم بھی ہے۔ اس پیالہ نما وادی میں خانہ کعبہ اور مسجد الحرام واقع ہیں۔ حج کے موقعہ پر سینکڑوں میلوں کی دوری سے جب عازمین حج کعبہ کی طرف رخ کرتے ہیں تو ان کے ہونٹوں پر لبیک کا ورد ہوتا ہے۔ ''اے خدا یہ تیرے ہی حکم کی وجہ سے ہے کہ ہم تیری خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔''

روایت بتاتی ہے کہ حضرت آدمؑ نے خدا کے اس گھر کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ اس خانہ خدا کے سامنے تھا جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی حاجرہ اور اپنے نوعمر بچے اسماعیلؑ کو چھوڑا تھا۔ پھر اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ خانہ کعبہ بنانا شروع کیا۔ یہی گھر تھا کہ جسے بعد میں انسانیت کے مرکز کی حیثیت حاصل ہونا تھی۔ حضرت آدمؑ کے بنائے گئے ڈھانچے پر جب حضرت ابراہیمؑ نے دوبارہ بنیادیں کھڑی کیں تو موسم کے مصائب کو برداشت کرتے ہوئے دونوں باپ بیٹے بھاری پتھر اٹھا کر دیواریں بناتے رہے۔ انہیں پتھروں کے ڈھانچے کے بیچ انہوں نے اسود بھی رکھا جو نشان تھا کہ اس مقام سے حج کے لیے چکر شروع ہوں گے۔

دیواریں اونچی ہوتی گئیں تو حضرت ابراہیمؑ کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ پتھر اٹھا کر

ان کو اور بلند کر سکیں۔ لہٰذا حضرت اسماعیلؑ نے ایک پتھر اٹھا کر ان کے قدموں تلے رکھ دیا جس پر کھڑے ہو کر انہوں نے دیواروں کو مزید بلند کرنا شروع کیا۔ اس پتھر پر ان کے پیروں کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو گئے اور یہ پتھر محفوظ کر لیا گیا۔ اب اس کا نام مقام ابراہیم اور پتھروں کے بنے اس ڈھانچے کو جو چوکور شکل کا تھا اس کی مناسبت سے کعبہ کہا جانے لگا۔

حضرت ابراہیمؑ کے دور سے چار ہزار سال بعد اب تک بھی کعبہ کی عمارت کا نقشہ اور مقام وہی ہے۔ اس کی بنیادیں بھی ابھی تک وہی ہیں اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ آج تک کعبہ کی جب بھی تعمیر ہوئی ہے انہی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ قدیم حوالوں کے مطابق کعبہ کو ایک بغیر چھت کی چار دیواری بتایا گیا ہے۔ اس کی دیواریں عام انسان کی اونچائی سے کچھ ہی زیادہ تھیں۔ تاریخ دان ازرقی نے اس کی اونچائی کو تقریباً 4.5 میٹر بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کھردرے خشک پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ چاروں کونوں میں چار پتھر تھے۔ زم زم کا چشمہ بھی دالان کے اندر ہی واقع تھا۔

ہجرت کے 18 سال قبل قریش نے کعبہ کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس لیے کہ موسموں کی تفسیر اور سیلاب نے اسے کافی خراب کر دیا تھا۔ ازرقی کے بقول اس دور میں شاہبہ کے ساحل کے قریب ایک یونانی جہاز تباہ ہو گیا۔ قریش نے اس کی لکڑی لے لی اور جہاز ہی پر سوار ایک بچ جانے والے یونانی بقیم کو جو بڑھئی تھا کعبہ کی تعمیر کا کام دے دیا۔ اس بار اس کی تعمیر میں کل 31 ٹکڑے استعمال کیے گئے۔ ایک پتھر رکھا جاتا اور پھر ایک لکڑی کا ٹکڑا۔ اس میں سولہ پتھر لگے اور پندرہ لکڑی کے ٹکڑے آخر میں پتھر لگا۔ جب کالا پتھر (حجر اسود) رکھنے کا وقت آیا تو قریش میں جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ تمام سرداروں کی خواہش تھی کہ پتھر وہ رکھیں گئے۔ اس طرح سے خونی فساد کھڑا ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس موقع پر حضرت محمدؐ نے فیصلہ کیا کہ پتھر کو ایک چادر پر رکھ دیا جائے اور تمام سردار اس چادر کو اٹھا کر اس مقام پر رکھیں جہاں اسے لگایا جانا تھا۔ اس فیصلے کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ یہ فیصلہ تمام سرداروں نے قبول کر لیا اور ایسا ہی ہوا۔ تمام سرداروں نے چادر اٹھائی اور حضور نبی کریمؐ نے پتھر رکھا۔ اس طرح سے ایک بہت بڑا مسئلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔

اس کے بعد کعبہ کے اوپر سیدھی چھت بنائی گئی جو کہ لکڑی کے چھ ستونوں پر کھڑی

کی گئی اور پھر کعبہ پر اون کے کپڑے کا غلاف چڑھا دیا گیا۔ کعبہ کو اندر سے تصویروں سے سجایا گیا جس میں پیغمبروں، فرشتوں اور درختوں کی تصویریں بھی شامل تھیں۔ اس میں حضرت ابراہیمؑ کی تصویر بھی لگی ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے 2600 سال بعد حضرت محمدؐ دنیا میں تشریف لائے۔ آپؐ نے 10 ہجری کو پہلا اسلامی حج کیا۔ آپ کے ساتھ ایک لاکھ 14 ہزار مسلمان بھی شریک تھے۔ اس وقت اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا اور حجاج کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ مسجد الحرام اور مطاف کے رقبے کو بڑھانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ (مطاف وہ جگہ جو کعبہ کے اردگرد واقع ہے اور جس پر چکر لگا کر طواف کیا جاتا ہے)۔ مسجد الحرام اور مطاف میں پہلی توسیع حضرت عمر فاروقؓ نے کی اور آخری توسیع شاہ فہد بن عبدالعزیز کے عہد میں 1409ء اور 1413ھ کے درمیان مکمل ہوئی۔

حضرت عمر ابن خطابؓ کے دور میں توسیع 638ء (17ھ)

حضرت عمرؓ جب مکہ پہنچے اور عمرہ ادا کرنے کے لیے کعبہ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ کعبہ کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی۔ لوگوں نے بتایا کہ سیلاب کی وجہ سے کعبہ کو نقصان پہنچا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کو مرمت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی توسیع کرنے کے بارے میں بھی سوچا۔ کیونکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی غرض سے آپؓ نے مسجد الحرام کے اردگرد مکانوں کو معقول معاوضے سے خرید لیا اور انہیں گرا کر مسجد الحرام میں توسیع کی اور کعبہ کے گرد ایک دیوار تعمیر کروائی جو کہ آدمی کی اونچائی سے چھوٹی تھی۔ اس کے علاوہ آئندہ سیلاب سے بچنے کے لیے دیگر حفاظتی انتظامات بھی کیے گئے۔

حضرت عثمان بن عفانؓ کے دور میں توسیع 646ء (26ھ)

حضرت عمر فاروقؓ کی توسیع کو ابھی مشکل سے دس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنیؓ نے مسجد الحرام میں حجاج کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر توسیع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مسجد کے اردگرد واقع مکانوں کو خریدا گیا اور انہیں مسجد میں شامل کر لیا گیا۔ مسجد کو از سر نو بنایا گیا اور نمازیوں کے لیے پہلی دفعہ نماز پڑھنے والی جگہ کو بھی ڈھانپا گیا اور اس پر چھت تعمیر کی گئی۔

خلیفہ عبداللہ بن زبیر کے دور میں توسیع 684ء (65ھ)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے حضرت عبداللہ بن زبیر جو کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی آسیہ کے صاحبزادے تھے نے 65 ہجری میں مسجد الحرام کی توسیع کی۔ واقعات کے مطابق جب حضرت عبداللہ بن زبیر زید کے ساتھ مل کر سیاسی کنٹرول حاصل کرنے کی کوششیں کر رہے تھے تو اس وقت زید نے مکہ پر حملہ کر دیا۔ محاصرہ کے دوران کعبہ کو آگ لگ گئی۔ زید کی موت کی وجہ سے محاصرہ ختم ہو گیا تو عبداللہ نے کعبہ کی دوبارہ تعمیر شروع کی۔ انہوں نے سب سے پہلے وہ پتھر اٹھانے کا حکم جاری کیا جو جنگ کے دوران کعبہ پر گرے تھے۔ جب عبداللہ نے کعبہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے اس کی دیواریں گرانے کا حکم دیا تو لوگ کعبہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرنے لگے اور کوئی بھی اس کے لیے آگے نہ بڑھا چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے خود اس امر کی پہل کی۔ محاصرے کے دوران حجر اسود تین ٹکڑے ہو گیا تھا۔ عبداللہ نے اس پر سلور کا خول چڑھا دیا اور پھر دوبارہ اسی مقام پر رکھ دیا۔

عبداللہ بن زبیر نے جب خانہ کعبہ دوبارہ تعمیر کیا تو اس میں حطیم کا علاقہ بھی شامل کیا جس سے اس کی لمبائی میں اضافہ ہو گیا۔ اس کی اونچائی میں بھی تقریباً 16 انچ کا اضافہ کر دیا۔ اس کے دو دروازے تعمیر کیے گئے۔ ایک داخل ہونے کے لیے اور دوسرا باہر نکلنے کے لیے۔ دروازوں پر سونے کی چادر چڑھائی گئی۔ کعبہ کی اندرونی اور بیرونی دیواروں کو پالش کیا گیا۔ اب اس کو ریشم کے کپڑے کے غلاف سے ڈھانپا گیا۔

حجاج بن یوسف کے دور میں توسیع 694ء (75ھ)

خلیفہ عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں جب والی عراق حجاج بن یوسف نے مکہ کا محاصرہ کیا تو کعبہ کو بھی نقصان پہنچا۔ جب حجاج شہر میں داخل ہوا تو کعبہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور عبداللہ بن زبیر کے تمام ڈھانچے کو تبدیل کر دیا گیا۔ کعبہ کے دو دروازوں کو ختم کر کے صرف ایک دروازہ باقی رکھا گیا۔

خلیفہ الولید بن عبدالملک کے دور میں توسیع 709ء (91ھ)

ولید بن عبدالملک کے دور میں بڑا سیلاب آیا جس کی وجہ سے مسجد کو کافی نقصان پہنچا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ مسجد کو نئے سرے سے تعمیر کیا جائے۔ نئی تعمیر کے لیے مصر اور

شام سے اعلیٰ قسم کا ماربل پتھر منگوا کر استعمال کیا گیا۔

خلیفہ ابو جعفر المنصور کے دور میں توسیع 754ء (137ھ)

خلیفہ المنصور نے بھی مسجد الحرام کی توسیع میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ابو جعفر نے مسجد کے شمال مغربی حصے میں کافی توسیع کی۔ اس سے مسجد کی جگہ دوگنی ہو گئی۔

خلیفہ محمد بن المہدی کے دور میں توسیع 776ء (160ھ)

محمد المہدی کے دور میں دو مرتبہ مسجد کی توسیع کی گئی۔ پہلی بار 160ھ میں جب مسجد کے شمالی حصے کو وسیع کیا گیا۔ اس سے المہدی نے محسوس کیا کہ کعبہ مسجد کے مرکز میں نہیں رہا۔ چنانچہ 780ء (164ھ) میں مسجد کے جنوبی حصے کو وسیع کیا گیا اور خود المہدی کھڑا ہو کر یہ اطمینان کرتا رہا کہ واقعی کعبہ مرکز میں ہو گیا ہے۔ اس نے نمازیوں کے لیے مزید چار لکڑی کی عمارتوں کا اضافہ کیا۔

222 ہجری تا 486ھ کی توسیع

222 ہجری میں خانہ کعبہ میں ایک بار پھر تعمیری کام شروع ہوا۔ تزئین کے لیے سمرا کے پیلے ماربل استعمال کیے گئے۔ مقام ابراہیم کو محفوظ رکھنے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ کعبہ کو سیلاب سے بچانے کے لیے احتیاطی تدابیر کی گئیں۔ کعبہ کے سلور کے دروازے پر سونے کا پینٹ کیا گیا اور سرخ سلک کا غلاف چڑھایا گیا جس پر سونے کا کام کیا گیا تھا۔

بعد ازاں خلیفہ عباس المعتمد نے 484ء (271ھ)۔ خلیفہ العباس المعتضد نے 894ء (281ھ)۔ اور خلیفہ العباس المقتدر نے 919ء (306ھ) میں مزید توسیع کرائیں۔ 1400ء (803ھ) میں مسجد کا مشرقی حصہ آگ لگنے کی وجہ سے جل گیا جس سے ایک سو سے زائد ماربل ستون اور چھت جل گئی۔ یہ واقعہ فراج بن برقوق کے دور میں رونما ہوا۔ اس کی مرمت امیر بیبسق الظاہری کے دور میں ہوئی۔

خانہ کعبہ اور مسجد الحرام کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے بڑا منصوبہ دور عثمانیہ میں بنایا گیا۔ سلطان سلیم دوم کے عہد 1564ء (972ھ) میں مسجد کی دوبارہ مرمت کی گئی اور اسے درست کیا گیا۔ اس کی نگرانی ترکی کے ماہرین نے کی۔ 994ھ میں سلطان سلیم نے منصوبہ کے تحت مسجد کے صحن میں اضافہ کیا اور سات میناروں کا اضافہ کیا۔ مسجد کے فرش کو ٹھیک کیا گیا۔

اس کی سطح گلی کی سطح سے نیچی ہوگئی تھی اسے برابر کیا گیا۔ سلطان سلیمان نے بھی کعبہ کے لیے سونے اور چاندی سے مرصع دروازہ بھجوایا۔ کعبہ کو دو چادروں سے ڈھانپا گیا۔ چھت کی سمت سیاہ چادر رکھی گئی۔ جبکہ اطراف کی چادروں کا رنگ سرخ تھا۔ کعبہ کے اردگرد ریت کو زم زم کے پانی سے دھویا گیا۔

کعبہ اور مسجد الحرام کو تقریباً چار سو برس تک اسی حالت میں رکھا گیا یہاں تک کہ 1955ء (1375ھ) میں سلطان عبدالعزیز آل سعود کے زیرنگرانی کعبہ اور مسجد الحرام کے توسیعی منصوبے پر عملدرآمد شروع ہوا۔ اس کی تکمیل کے بعد 1978ء (1398ھ) میں مطاف کی توسیع اور حرم کے نکاسی آب کے منصوبوں پر کام شروع ہوا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کعبہ میں حجاج کرام کی آمد میں اضافہ ہوتا گیا۔ چنانچہ 1966ء سے پاکستانی انجینئروں کی نگرانی میں کام شروع ہوا۔

1974ء میں پاکستانی فرم اور انجینئروں کی زیرنگرانی مطاف کے رقبے میں اضافہ کیا گیا کیونکہ پہلے حجاج کرام کی تعداد تقریباً 5لاکھ تھی جو 1974ء تک یہ تعداد 15لاکھ تک پہنچ گئی تھی اس لیے مطاف کے رقبے میں توسیع ناگزیر تھی۔ 1974ء میں مطاف کا رقبہ 64.8 میٹر تھا جبکہ 1975ء کے بعد یہ 95.2ڈایا میٹر ہوگیا۔ 1974ء سے پہلے 14ہزار آدمی ایک وقت میں طواف کرسکتے تھے جبکہ 1975ء کے بعد مسجد کی توسیع سے یہ گنجائش بڑھ کر 28ہزار ہوگئی۔

اس منصوبے کے تحت مسجد کا فرش بالکل بدل دیا گیا۔ پہلے والا ماربل نکال دیا گیا کیونکہ وہ گرمی کی وجہ سے بہت گرم ہوجاتا تھا جس کی وجہ سے نمازیوں کے پاؤں جلتے تھے۔ پاکستانی انجینئروں نے اس کی جگہ ایک خاص قسم کا ماربل لگایا جو انتہائی گرم موسم میں بھی ٹھنڈا رہتا ہے۔ اس ماربل کو پوری دنیا میں چیک کیا گیا اور پھر مسجد الحرام میں لگایا گیا۔ یہ توسیعی منصوبے چل رہے تھے کہ 1979ء میں ایک نہایت افسوسناک واقعہ رونما ہوا جس میں ایک گروپ نے خانہ کعبہ پر قبضہ جما لیا اور مسجد کے اندر اسلحہ لے گئے۔ کافی دن تک وہ مسجد پر قابض رہے۔ ان کے قبضے سے مسجد کو آزاد کرانے کے لیے حکومت نے جو فوجی قدم اٹھایا۔ اس کے دوران مسجد کو کافی نقصان پہنچا۔ قابض گروپ چونکہ تہہ خانے میں چھپا ہوا تھا۔ اس لیے سب سے زیادہ نقصان تہہ خانے کو پہنچا۔ 1980ء میں سعودی حکومت نے پاکستانی

انجینئروں کو بلایا اور مسجد کی مرمت کا کام سونپا۔

تہہ خانہ میں مختلف کمرے بنے ہوئے تھے جن میں آفس اور ایک عجائب گھر بھی تھا۔ مرمت کے دوران وہاں سے تمام کمرے ختم کر دیئے گئے اور عجائب گھر ختم کر دیا گیا۔ اس عجائب گھر میں مسجد سے متعلقہ پرانی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن زائرین کے لیے زیادہ جگہ کی فراہمی کے پیش نظر اس کو بھی ختم کرنا پڑا۔ 1980ء میں تہہ خانے کو بھی گراؤنڈ فلور جیسا بنا دیا گیا۔ 1983ء میں کعبہ کے اندر کے فرش اور دیواروں کی ٹائلیں بھی تبدیل کر دی گئیں۔ کیونکہ ہر سال جب اسے غسل دیا جاتا تھا تو غسل کا پانی اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچا رہا تھا۔

مسجد الحرام کا قدیم رقبہ 10 ہزار مربع میٹر جبکہ موجودہ رقبہ ایک لاکھ 5 ہزار 500 مربع میٹر ہے۔ سعی کا رقبہ 17 ہزار مربع میٹر۔ مطاف کا رقبہ 16 ہزار مربع میٹر۔ کعبہ المشرفہ کا رقبہ 145 مربع میٹر۔ حطیم کا رقبہ 94 مربع میٹر اور مقام ابراہم کا رقبہ دو مربع میٹر پر مشتمل ہے۔

الحمرا

(Al-Hamra)

یورپ میں مسلمانوں کے عروج کی آخری شاندار علامت

ہسپانیہ (سپین) میں غرناطہ کے سامنے ایک پہاڑی پر ہسپانوی اسلامی تعمیرات کا مجموعہ جو حصار کے آثار باقیہ۔ شاہی محل اور شرفا اور اہلکاروں کی قیام گاہ پر مشتمل ہے۔ الحمرا کی تعمیر 1238ء سے 1354ء کے درمیان ہوئی۔ 1492ء میں مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ بڑی حد تک تباہ کر دی گئی۔ تاریخ میں 1492ء کا سال خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس برس کوسٹوفر کولمبس نے نئی دنیا (امریکہ) کو دریافت کیا اور اسی سال سپین میں 800 سال حکومت کرنے کے بعد عربوں کو حتمی شکست ہو گئی۔ 8ویں صدی عیسوی سے لے کر 11ویں صدی عیسوی تک سپین میں عربوں کی سلطنت جس کا دارالحکومت قرطبہ تھا یورپ کی سب سے ترقی یافتہ سلطنت تھی۔

1031ء میں قرطبہ کی خلافت ختم ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی۔ شمال میں واقع عیسائی ریاستوں نے دوبارہ آہستہ آہستہ سپین کو فتح کرنا شروع کر دیا۔ 13ویں صدی عیسوی کے اوائل میں صرف ریاست غرناطہ میں عربوں کا تسلط قائم رہ گیا۔ یہاں مسلمانوں نے مزید اڑھائی صدی تک حکومت کی۔ حتیٰ کہ 1492ء میں آخری سلطان بائیول کو رومن کیتھولک حکمرانوں شاہ فرڈیننڈ اور ملکہ ازابیلا کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا گیا۔ غرناطہ

میں الحمرا پیلس وہ یادگار ہے جو یورپ میں مسلمانوں کے عروج کی آخری شاندار نشانی ہے۔

غرناطہ (اب گریناڈا) شہر جنوبی سپین میں سیرا نیواڈا کے شمال مغربی کنارے پر واقع ہے اور اس کے سامنے سرسبز قطعہ زمین ہے۔ اس عمارت کی تعمیر 1238ء میں غرناطہ کے پہلے سلطان ابن العامر کے دور میں شروع ہوئی اور 14ویں صدی عیسوی میں سلطان یوسف سوم اور سلطان محمد پنجم کے عہد میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ باہر سے الحمرا کی دیواریں اور ستون سادہ مگر باوقار ہیں۔ اس کے تمام فن تعمیر کا حسن اور آرائش اندرونی حصوں میں نظر آتا ہے۔ دیواروں سے بنا اس کا احاطہ تین حصوں میں منقسم ہے۔ مغرب میں ''الکرابا'' کا مضبوط حصار ہے۔ درمیان میں الحمرا پیلس ہے۔ جہاں سلطان اور اس کی بیگمات (ملکائیں) رہا کرتی تھیں۔ ان میں کھلے صحن ہیں۔ صحنوں کے گرد بڑے اور چھوٹے کمرے ہیں جو پیچیدہ، ہندسی آرائش سے مزین ہیں۔

مشرق میں شاہی شہر تھا جس کی اب کوئی چیز باقی نہیں۔ اس کمپلیکس میں اندر داخل ہونے کا راستہ شمالی دیوار میں گھوڑے کی نعل کی شکل کا ایک بہت بڑا گیٹ ہے جو ''دروازہ انصاف'' کہلاتا ہے۔ اس دروازے کے اوپر ایک کھلا ہوا ہاتھ بنا ہوا ہے جس کی پانچوں انگلیاں اسلام کے پانچ بنیادی ارکان توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو ظاہر کرتی ہیں۔ انصاف کے دروازے سے گزر کر یہ راستہ ایک کھلے میدان کی طرف جاتا ہے جہاں چٹانوں کو کاٹ کر بہت بڑے بڑے حوض بنائے گئے ہیں۔ ان حوضوں میں بارش کا پانی جمع کیا جاتا تھا۔ اس اندیشے کے تحت کہ اگر محاصرہ کے دوران قلعہ میں محصور لوگوں کا باہر کی دنیا سے رابطہ ختم ہو جائے تو اس پانی کو استعمال کیا جا سکے۔ یہاں الحمرا کے سامنے ایک غیر متناسب چوکور محل موجود ہے جسے چارلس پنجم نے 1525ء میں شروع کروایا تھا مگر جو کبھی مکمل نہیں ہو سکا۔

سادہ دروازے سے الحمرا میں داخل ہونے والا سیاح اپنے آپ کو ایک جادونگری میں پاتا ہے۔ معروف امریکی مصنف واشنگٹن ارونگ نے سارے ماحول کو ''جادو کی دنیا'' قرار دیا۔ وہ لکھتا ہے کہ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہمیں کسی اور زمانے میں اور کسی اور دنیا میں پہنچا دیا گیا ہو اور جیسے ہم الف لیلیٰ کے مناظر میں سے گزر رہے ہیں۔ یہ راستہ ایک بہت بڑے بیضوی صحن کی طرف جاتا ہے جو مہندی کا صحن کہلاتا ہے۔ اس صحن کے

درمیان میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس کے اردگرد مہندی کے پودوں کی دو قطاریں ہیں۔ اس صحن کے شمالی سرے پر ستونوں سے بنا ہوا ایک برآمدہ ایک ہال تک پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ یہ ہال رحمت کا ہال کہلاتا ہے۔ یہ ہال اصل میں شاندار طریقے سے سجے سجائے سفیروں کے ہال کی ڈیوڑھی ہے جہاں اس وقت کے سلطان غیر ملکی مہمانوں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔

الحمرا کے دروازے شہتیر اور چھتیں آبنوس کی لکڑی کی بنی ہوئی ہیں جنہیں کھود کر حسین نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اس کے فرش اور دیواروں کے نچلے حصے سبز، اودے اور نارنجی رنگوں کے ڈیزائنوں میں بنائے گئے۔ دیواروں کے بقیہ حصے سرخ، نیلے اور پیلے رنگ میں پینٹ کیے گئے۔ الحمرا کے دیگر کمروں میں ملکہ کا ڈریسنگ روم، شاہی غسل خانے، دو بہنوں کا ہال اور بادشاہوں کا ہال ہے۔ پھر یہاں گارڈن آف ڈراسکا بھی ہے جہاں سمر ہاؤس موجود ہے۔ اس کا ایک کمرہ رازوں کا ہال کہلاتا ہے۔ اس کمرے کے ایک کونے میں اگر سرگوشی کی جائے تو دوسرے سرے پر اسے آسانی سے سنا جاسکتا ہے۔

اپنے فن تعمیر کے خوبصورت تناسب کے علاوہ الحمراء کی آرائش بے مثال ہے۔ اس میں آرائش کے تین بنیادی انداز نظر آتے ہیں۔ استرکاری کر کے نقش و نگار بنانے کا انداز۔ موزیک ٹائلز میں جیومیٹریکل ڈیزائن اور عربی انداز کی خطاطی کیونکہ اسلامی آرٹ میں انسانوں اور جانوروں کی تصاویر نہیں بنائی جاتیں۔ اس لیے یہ تین انداز اپنائے گئے۔ الحمراء کے جیومیٹریکل ڈیزائن اسلامی فلسفے کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں جبکہ خطاطی کے ذریعے قرآنی آیات کے علاوہ اس محل کو بنانے والوں کی خوبصورت اشعار کے ذریعے تعریف کی گئی ہے۔ 1828ء کے بعد الحمراء پیلس کے وسیع پیمانے پر مرمت کر کے اسے بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔

ایفل ٹاور

(Eiffel Tower)

فرانس کے صنعتی استحکام کی پہچان

ایفل ٹاور (Eiffel Tower) ایک ایسا تعمیراتی عجوبہ اور شاہکار ہے جو پوری دنیا میں فرانس کی پہنچان بن چکا ہے۔ اس سپر سٹرکچر کی حیران کن طاقت اس وقت دھرتی کے سینے پر موجود دیگر بڑی تعمیرات سے کہیں بڑھ کر ہے۔ فولاد کے ذریعے تیار ہونے والے اس انقلابی ڈھانچے پر 7000 ٹن سٹیل استعمال ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرانس کے لیے قومی سطح پر افتخار کا نشان بن گیا۔ آسمان کو چھوتے ہوئے اس شاہکار کا شمار کرہ ارض کے بہترین تعمیراتی معجزوں میں ہوتا ہے۔

اس عظیم الشان مینار کی تاریخ کچھ یوں ہے کہ 14 جولائی 1889ء کو پیرس میں انقلاب فرانس کی پہلی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک عظیم الشان صنعتی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش کے منتظمین نے نمائش کو یادگار بنانے کی بہت سی تجاویز پر غور کیا۔ پروجیکٹ کے انچارج مسٹر گریوی (Grevy) چاہتے تھے کہ اس پروجیکٹ کے ذریعے ملک کو صنعتی انقلاب کا لیڈر بنا دیا جائے اور یہ کام صرف ایک ہی طریقے سے کیا جا سکتا تھا اور وہ طریقہ تھا تعمیر۔ ان کے تصور کو فرانس کے وزیر صنعت نے بہت پسند کیا اور انہیں اس منصوبے کے لیے 86 لاکھ ڈالر کی رقم مل گئی۔ اس بجٹ کے اندر انہوں نے 1000 فٹ اونچے ٹاور کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جو

فرانس کے صنعتی استحکام کی پہچان بن سکے۔

1886ء میں لوکرائے (Lockroy) نے ماہرین تعمیرات کو ٹاور کے لیے اپنے منصوبے جمع کرانے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں 100 سے زیادہ تجاویز موصول ہوئیں۔ ان میں الیگزنڈر گستاف ایفل (Gustave Eiffel) کا ڈیزائن پہلے نمبر پر رہا۔ ایفل ریلوے انجینئر رہ چکا تھا اور اس سے پہلے امریکہ کو پیش کیے جانے والے مشہور مجسمہ آزادی کا ڈھانچہ، کئی پل اور چھتیں تعمیر کر چکا تھا۔ ان دنوں خاص طور پر بڑے تعمیراتی ڈھانچوں کے لیے ساختہ فولاد سے تعمیر کا رجحان عام تھا۔ ایفل کو بھی فولاد کے ڈھانچے بنانا پسند تھا اور اس منصوبے کی بدولت وہ دنیا بھر میں ایک عظیم ماہر تعمیرات کی حیثیت سے اپنی منفرد شناخت بنانے والا تھا۔

ایفل نے کیمپادی مارس کے مقام پر فولاد کے 1000 فٹ بلند ٹاور کی تعمیر کا منصوبہ پیش کیا تھا۔ اس کا ڈیزائن ججوں کی تمام تر توقعات پر پورا اترا اور 8 جنوری 1887ء کو اسے ٹاور کا ٹھیکہ مل گیا۔ اب اس منصوبے کو مقررہ وقت کے اندر مکمل ہونا تھا کیونکہ افتتاحی تقریب کی تاریخ آگے نہیں بڑھائی جا سکتی تھی۔ ایفل نے اپنے چیف انجینئر ماریس کوچلن (Maurice Koechlin) اور آرکیٹکٹ سٹیفن ساورترے (Stephen Sauverstre) کے ساتھ مل کر ٹاور کے ڈیزائن پر کام کرنا شروع کیا اور اس کام کو مکمل ہونے میں 5 ماہ لگے۔ 50 انجینئرز اور ڈیزائنر نے 5300 بلیو پرنٹ تیار کیے جن میں ایک ایک چیز کی تفصیل موجود تھی۔ کام شروع کرنے سے پہلے ہر ہر خم کی لمبائی کو مینوئل طریقے سے بڑی احتیاط کے ساتھ کیلکولیٹ کیا گیا۔ کیونکہ کیلکولیشن میں ایک بھی غلطی بہت بڑی افتاد کا باعث بن سکتی تھی۔

یکم جولائی 1887ء کو کنکریٹ کی بنیاد کے ساتھ اس کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ بنیاد میں ٹاور کو سہارا دینے کے لیے 26 فٹ طویل اور چار انچ قطر کے بولٹ لگائے گئے۔ مکمل ڈھانچہ فولاد کے 18038 حصوں کو جوڑ کر تیار کیا جانا تھا۔ یہ تمام پارٹس پیرس کے نواح میں ایفل کی کمپنی کے قریب قائم لیوالوئس پیرٹ فیکٹری میں تیار کیے گئے۔ ان کی تیاری کے لیے 100 لوگ روزانہ 18 گھنٹے کام کرتے رہے۔ ٹاور کے ہر ٹکڑے کے ڈیزائن کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا اور ایک ملی میٹر کے دسویں حصے تک پیمائش کو درست کیا گیا۔ ابتدائی طور پر ٹاور کے ٹکڑوں کو بولٹ استعمال کر کے اسمبل کیا گیا۔ بولٹس کو بعد ازاں روٹوں (Rivets) سے تبدیل

کر دیا گیا جنہیں گرم کر کے لگایا گیا۔ ان کے ٹھنڈا ہونے اور سکڑنے سے ہر ٹکڑا مضبوطی سے ایک دوسرے سے پیوست ہو گیا۔ روٹیں لگانے کے لیے چار لوگوں کی ایک ٹیم تشکیل دی گئی۔ ایک انہیں گرم کرتا تھا اور دوسرا لگانے کی جگہ پر انہیں تھامے رہتا تھا، تیسرا ہتھوڑے کی ضربوں سے انہیں دونوں طرف سے ہموار کر دیتا تھا۔ ان لوگوں کے صبر اور استقامت کا اندازہ لگائیں جنہوں نے ٹاور میں 25 لاکھ روٹیں لگائی تھیں۔ 10 سے 15 فٹ طویل اور 3 ٹن وزنی بنیادی ٹکڑوں کو جوڑنے کے لیے سائٹ پر 121 لوگ موجود تھے۔ تعمیر کے دوران جو مسئلہ پیش آیا اور جس نے منصوبے کو بہت بڑا جھٹکا دیا وہ کچھ اور نہیں بلکہ اس کے ڈیزائن پر پیدا ہونے والا اختلاف تھا۔

انسان پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جو کوئی بھی منفرد کام کر رہا ہو اس کی حوصلہ افزائی کی جائے لیکن ایفل کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس وقت کے کئی ممتاز انجینئروں اور ممتاز ماہر تعمیرات نے اس منصوبے کو گالیاں تک دے ڈالیں اور اس کی تعمیر پر شدید احتجاج کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ دارالحکومت پیرس کے قلب میں بنائے جانے والے اس دیو ہیکل اور بیکار ٹاور سے فرانس کے فن اور جمالیاتی تاریخ پر دھبہ لگ جائے گا۔ تمام تر مخالفت اور تکلیفوں کے باوجود ایفل نے اپنا کام جاری رکھا۔ انہوں نے بعد ازاں اس میں گول آرائشی محرابوں کا بھی اضافہ کیا۔ ایفل نے دوسرے ماہرین فن کی تعظیم بھی کی جس کا ثبوت 72 نمایاں سائنس دانوں اور انجینئروں کے نام ہیں جو پہلے پلیٹ فارم کے نچلے حصے میں کھدے ہوئے ہیں۔

28 جنوری 1887ء کو مینار کی بنیادیں اور یکم جولائی 1887ء کو بنیادوں کے اوپر کام شروع کر دیا گیا تھا اور چھ ماہ میں یہ مینار اپنی پہلی منزل تک پہنچ گیا۔ اس عظیم الشان ڈھانچے کی تکمیل میں دو سال صرف ہوئے اور اپریل 1888ء میں پہلی منزل اور پلیٹ فارم اور اگست 1888ء میں دوسری منزل مکمل ہو گئی۔ نومبر 1888ء میں مینار کی بلندی 186 میٹر تک پہنچ گئی تھی اور یوں یہ مینار اس وقت کی سب سے اونچی بلڈنگ ہونے کا اعزاز حاصل کر چکا تھا۔

31 مارچ 1889ء کو یہ ٹاور اپنی انتہائی بلندی 302 میٹر (984 فٹ) تک پہنچ گیا اور یوں دو سال دو ماہ کی تعمیر کے بعد یہ مینار مکمل ہو گیا۔ یہ ٹاور اپنی تعمیر کے وقت دنیا کی طویل

ترین عمارت تھا اور اگلے 41 برس تک اسے یہ اعزاز حاصل رہا۔ 1930 میں نیویارک کی ایمپائرسٹیٹ بلڈنگ تعمیر ہوئی تو وہ بلندی کے اعتبار سے اس عمارت پر فوقیت لے گئی۔

ایفل ٹاور کے تین پلیٹ فارم ہیں۔ پہلا 186 فٹ بلند اور 20ویں منزل پر۔ دوسرا 377 فٹ بلند اور 41ویں منزل پر، جہاں سیڑھی کے کل 1060 قدم بنتے ہیں اور تیسرا بالائی پلیٹ فارم 890 فٹ کی بلندی پر ہے۔ اس پلیٹ فارم پر صرف لفٹ کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ چوٹی پر 50 لوگوں کی گنجائش ہے۔ تیز رفتار ہوا سے یہ ٹاور 12 سنٹی میٹر تک جھولتا ہے جسے چوٹی پر محسوس کیا جا سکتا ہے جبکہ سورج کی تمازت ٹاور کو 17 سنٹی میٹر تک پھیلا دیتی ہے۔ ایفل ٹاور کا وزن 7000 ٹن ہے۔ مجموعی طور پر 1792 سیڑھیاں ہیں اور اس کی چوٹی سے 75 کلومیٹر دور تک کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

جب اس ٹاور کی تکمیل ہوگئی تو تنقید بھی خود بخود دم توڑ گئی۔ کیونکہ اس تعمیراتی شاہکار کو زبردست پذیرائی ملی۔ 1889ء کے عالمی میلے پر 20 لاکھ لوگ اسے دیکھنے کے لیے آئے اور یوں یہ مشن مکمل ہوگیا۔ یہ ایک عارضی ڈھانچہ تھا جسے جلد ہی گرا دیا جانا تھا لیکن اس کی بلندی نے اسے بچا لیا۔ یہ بلندی ایک ریڈیو ٹاور کے لیے انتہائی موزوں تھی۔ 1909 میں اس ٹاور کی چوٹی پر 66 فٹ بلند ایک ریڈیو انٹینا بھی نصب کیا گیا جس سے یہ مینار ریڈیو کی نشریات کے لیے بھی معاون ثابت ہونے لگا۔ 1953ء میں اس ٹاور پر ایک ٹیلی ویژن انٹینا بھی نصب کر دیا گیا۔ یہ ٹاور آج بھی پوری آب و تاب سے ایستادہ ہے اور اسے ہر سال 60 لاکھ سے زائد لوگ دیکھنے آتے ہیں۔

ایفل ٹاور کو پورا پینٹ کرنے کے لیے 50 ٹن پینٹ کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے ہر 5 سے 7 سال بعد پینٹ کیا جاتا ہے۔ تعمیر کے بعد اب تک اسے 17 مرتبہ پینٹ کیا جا چکا ہے اور اس پر 850 ٹن پینٹ صرف ہو چکا ہے۔ ڈھانچہ ساختہ (Wrought) فولاد سے بنا ہے۔ اس لیے اگر اسے باقاعدگی سے پینٹ کیا جاتا رہے اور پینٹ میں زنک کی مقدار زیادہ رکھی جائے تو یہ ہمیشہ کے لیے قائم رہ سکتا ہے۔ اسے پینٹ کرنے کے لیے 25 پینٹروں کو سال بھر کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کام میں 1500 برش اور رگڑائی کے لیے ریت کی 5 ہزار ڈسکیں استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کام کرنے والوں کے لیے 1500 جوڑے کپڑوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایفل ٹاور کو حال ہی میں دو آرائشی لائٹ بیمز (Beams) نے مزین کیا ہے جنہیں 80 کلومیٹر کی دوری سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر شام ہوتے ہی ٹاور کی یہ لائٹ بینمز بھی آن کر دی جاتی ہے۔ یہ کمپیوٹر پروگرامز کے ذریعے خودکار انداز میں آپریٹ ہوتی ہیں۔ اس کے لیے 1200 گھنٹے تک چلنے والے 6 ہزار واٹ کے زینون (Xenon) لیمپوں کا انتخاب کیا گیا۔

ایفل ٹاور کی رسم افتتاح کے موقع پر اس وقت کے 62 سالہ وزیر اعظم صرف دوسری منزل تک پہنچ سکے اور بقایا سیڑھیاں چڑھنے کے لیے وزیر اعظم نے وزیر تجارت کو کہا۔ افتتاح کے فوراً بعد ایڈورڈ ہشتم پرنس آف ویلز نے اپنے خاندان کے ہمراہ تیسری منزل کی سیر کی۔ 15 مئی 1889ء کو ایفل ٹاور عام پبلک کے لیے کھول دیا گیا۔ ایفل ٹاور کے تیسرے پلیٹ فارم پر دو مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک مجسمہ انجینئر ایفل گستاف کا ہے اور دوسرا مجسمہ گراموفون کے موجد تھامس ایڈیسن کا ہے۔

ایفل ٹاور سے دنیا کے تمام ممالک کے دارالحکومتوں کا ہوائی فاصلہ اور سمت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ٹاور سے اسلام آباد کا ہوائی فاصلہ 5968 کلومیٹر ہے۔

پیسا مینار

(Pisa Tower)

عزم و ہمت اور جذبوں نے اسے سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا

پیسا (Pisa) کا صحیح تلفظ اطالوی زبان میں ''پیزا'' ہے۔ یہ وسطی اٹلی کا شہر ہے جو دریائے آرنو پر بحیرہ ٹرینئین کے قریب واقع ہے۔ 11ویں صدی کے آخر تک پیسا ایک طاقتور بحری جمہوریہ بن چکا تھا لیکن 1284ء میں اس کی بحری طاقت جنوآ (Genoa) نے کچل ڈالی۔ 13-14ویں صدی عیسوی میں یہاں مجسمہ سازی کا ایک دبستان تھا جس کا بانی نیکولا پیزانو تھا۔ گیلیلیو گلیلی بھی اسی جگہ پیدا ہوا۔

''پیسا مینار'' دنیا بھر میں ''پیسا کا ٹیڑھا یا خمیدہ مینار'' کہلاتا ہے۔ اس ٹیڑھے مینار نے پیسا شہر کو بڑی شہرت بخشی۔ 190 فٹ بلند یہ مینار جو عجائبات عالم میں شامل ہے اپنی تعمیر کے فوراً بعد ہی جھکنا شروع ہو گیا تھا۔ اب یہ عمود سے 14 فٹ ہٹا ہوا ہے۔ برطانیہ کی شاہی یادگاروں کی سوسائٹی کے ارکان ہر سال اس کے جھکاؤ کی پیمائش کرتے ہیں۔ ہر سال یہ مینار ایک انچ ضرور جھکتا ہے۔

اس مینار کی تعمیر کا مقصد کلیسا کے لیے گھنٹی گھر تھا تاکہ گھنٹی کی آواز سن کر لوگ عبادت کے لیے پہنچیں۔ اس کی تعمیر کا آغاز تو 1174ء میں ہوا تھا مگر تکمیل 1350ء میں ہوئی۔ اس کی جنوبی بنیاد ریت میں رکھی گئی اور ابھی بمشکل تین گیلریاں بنی تھیں کہ یہ مینار جھکنا شروع

ہو گیا۔ پھر اس کی تعمیر کے منصوبے میں کچھ ردوبدل کیا گیا۔ اسی چوک میں کلیسا بھی ہے اور بپتسمہ لینے کی جگہ بھی۔ یہ دونوں عمارتیں بھی رومن فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ قریب ہی قدیم مقدس قبرستان موجود تھا۔ اس قبرستان کی تقدیس میں اضافہ کے لیے یروشلم سے 53 جہازوں میں مٹی منگوائی گئی۔

اٹلی کی شہرہ آفاق یادگار پیسا مینار آہستہ آہستہ ''نیم دراز'' ہو گئی تھی۔ پوری دنیا کے لوگ اس مینار کے گرنے کے منتظر تھے۔ ہزاروں سیاح اسے دیکھنے آتے تھے۔ تقریباً 10 سال تک اس مینار پر انسانی قدم نہیں پڑے تھے۔ یہ صورتحال اٹلی کی حکومت کے لیے تکلیف دہ تھی۔ بالآخر انہوں نے اس مینار کو سیدھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ اہل پیسا چاہتے تھے کہ یہ یادگار کم ازکم 16 انچ سیدھی ہو جائے۔ تاکہ اس کی وجہ شہرت یعنی اس کا مشہور ٹیڑھا پن بھی برقرار رہے اور اس کے زمین بوس ہونے کا خطرہ بھی نہ رہے۔ اس مینار کو سیدھا کرنے کا کام پولینڈ کے ماہر تعمیرات اور انجینئر مائیکل سیموئیل کوسکی کی سربراہی میں ماہرین کی ایک ٹیم کو سونپا گیا۔ ماہرین کی اس ٹیم نے مینار کے جھکاؤ کے مخالف سمت کھدائی کی۔ ٹیم نے 18 ماہ تک جانفشانی سے کام کیا اور بالآخر کوششیں رنگ لائیں اور یہ مینار 12 سینٹی میٹر (4.8 انچ) تک سیدھا ہو گیا۔

حیرت انگیز بات یہ کہ گزشتہ 800 سال سے اس شاندار مینار کو سیدھا کرنے کی کوششیں ناکام ہو رہی تھیں۔ مگر جذبوں کے آگے اس مینار نے اپنی ضد چھوڑ دی اور سیدھا ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ مینار کو سیدھا کرنے میں اس کا جھکاؤ کم کرنے میں تقریباً 26 ملین ڈالر لاگت آئی۔ مینار کو سیدھا کرنے کی کوششیں جزوی طور پر بارآور ثابت ہوئیں تو حکومت نے اعلان کیا کہ یہ مینار پہلے مرحلے پر بچوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ دنیا بھر کے لوگوں کو شدت سے یہ انتظار تھا کہ یہ کھولا جائے۔ ان کا یہ انتظار رنگ لایا اور 17 جون 2000ء کو روم یونیورسٹی کے 200 طلباء نے مینار کی 293 سیڑھیاں چڑھ کر اس کی مضبوطی اور استحکام کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس مینار پر کم وبیش 10 سال بعد انسانی قدم رکھے گئے تھے۔

پیسا شہر کے باشندوں نے اپنے شہر کی شناخت اس مینار کے دوبارہ کھل جانے کی خوشی میں 17 جون 2000ء کو پورے شہر میں چراغاں کیا۔ مینار کے قریب سبزہ زار میں آتش

بازی کا شاندار مظاہرہ بھی کیا گیا۔ اہل پیسا نے دریائے آرنو میں پلاسٹک کے شفاف گلاسوں میں موم بتیاں جلا کر بہائیں اور اس طرح منفرد طریقے سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

پیسا کا علاقہ سیاحوں کے لیے کشش کا باعث رکھتا ہے۔ جن دنوں پیسا رومن کالونی تھا ان دنوں کے کھنڈرات باقی ہیں۔ ان کھنڈرات کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اس شہر کی تاریخی اہمیت اس وقت مزید بڑھ گئی جب 11 ویں صدی عیسوی میں اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1284ء میں میلورا کے پرے بحری لڑائی میں شکست کے بعد اس کی اہمیت کم ہو گئی۔ 1406ء میں فلورنس نے اسے فتح کر لیا۔ 1859ء میں پیسا اٹلی کا ایک حصہ بن گیا۔

❁ ❁ ❁

ٹاور آف لندن

(Tower of London)

شاہی افراد کی قتل گاہ اور پھانسی گھاٹ و قید خانہ

لندن ٹاور کی تاریخ قتل و غارت گری اور پھانسی کی طویل کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ان واقعات میں سے 1483ء میں 13 سالہ شہزادہ ایڈورڈ اور اس کے چھوٹے ڈیوک آف یارک کا قتل سب سے ظالمانہ واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔ ٹاور آف لندن کے ساتھ تشدد کی بے شمار کہانیاں منسوب ہیں۔

اس کا آغاز اس وقت ہوا جب فاتح ولیم نے اپنی سلطنت کے دارلحکومت پر اپنا قبضہ مضبوط کرنے کے لیے ایک قلعہ بنوایا۔ زمانہ وسطیٰ میں یہ ایک خوبصورت تزئین و آرائش سے مرصع ایک شاندار محل تھا اور اسے عدالتی نظام کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ حکومت کے باغیوں یا قیدیوں کو یہاں رکھنے کا آغاز 1100ء میں ہوا۔ ٹاور آف لندن کے سب سے پہلے قیدی کا نام بشپ رینلف فلیمبرڈ تھا۔ جب اس نے ٹاور کی سب سے اونچی منزل پر واقع ایک کال کوٹھڑی سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ مارا گیا۔

ٹیوڈر خاندان کے دورِ حکومت کے بعد ٹاور آف لندن ایک ایسی مستقل جگہ بن گئی جہاں شاہی خاندان کے دشمنوں اور باغیوں کو ایذائیں دی جاتیں اور پھانسی پر چڑھایا جاتا تھا۔ فاتح **نارمن (Norman)** سے لے کر 19ویں صدی کے ابتدائی دور تک یہاں شاہی ٹکسال قائم

تھی اور یہاں نیکولس بروٹ اور جان روٹر جیسے ماہر سکے ڈھالنے والے اور میڈل بنانے والے ملازم تھے۔ 13 ویں صدی سے لے کر 1834ء تک اس ٹاور میں شاہی چڑیا گھر بھی تھا۔ انگلینڈ کا سب سے قدیم شاہی اسلحہ کا عجائب گھر اب بھی یہاں موجود ہے۔ اس کے علاوہ یہاں شاہی سازوسامان کا سب سے قیمتی ذخیرہ بھی موجود ہے۔

ٹاور کمپلیکس 18 ایکڑ پر واقع ہے۔ اس ٹاور کا پل قدیم لندن شہر کی دیوار کے اوپر ایک محافظ کی طرح قائم ہے۔ پورے کمپلیکس کے بالکل درمیان میں سفید ٹاور شاندار قلعہ ہے۔ یہ اس کمپلیکس کا سب سے قدیم ڈھانچہ ہے۔ فاتح ولیم نے 1078ء میں اس قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد نارمن بادشاہوں نے لندن کے اردگرد قلعوں کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ اس عمارت کی تعمیر کی نگرانی ایک پادری نارمن گنڈلف نے کی تھی جو روچسٹر کا بشپ بھی تھا۔ یہ عمارت جس میں شاہی گارڈ کے رہنے کی جگہ اور شاہی عدالت قائم تھی کی بلندی 90 فٹ تھی۔ جبکہ چوڑائی 107 فٹ اور لمبائی 118 فٹ تھی۔ اس کی دیواروں کو لاتعداد پشتوں نے سہارا دے رکھا تھا۔

اس ٹاور کو 13 ویں صدی عیسوی میں سفید ٹاور کہا جانے لگا جب شاہ ہنری سوم نے اس پر سفیدی کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد 17 ویں صدی تک سفید ٹاور کو شاہی اسلحے خانے کی حیثیت حاصل رہی۔ یہاں بے شمار ہتھیار اور چھوٹی توپوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ شاہ ہنری ہشتم نے یہاں لاتعداد ہتھیار جمع کیے۔ اس ٹاور کمپلیکس کی جو موجودہ شکل نظر آتی ہے وہ ان تبدیلیوں کے بعد ہوئی جو ہنری سوم نے 1266ء میں اور ایڈورڈ اول نے 1272ء میں کروائی تھیں۔ ٹاور کے تین اطراف میں ایک گہری اور چوڑی خندق کی صورت میں حفاظتی لائنیں بنائی گئی تھیں۔ 1843ء تک ان خندقوں میں پانی بھرا رہتا تھا۔ پھر ان سے پانی خارج کر کے انہیں بھروا دیا گیا۔

ٹاور کے مغربی سرے پر ایڈورڈ اول نے پتھروں سے ایک خوبصورت راستہ بنوایا تھا جو ٹاور میں داخل ہونے والوں کو سہولت فراہم کرتا ہے۔ یہ راستہ ٹاور کے وسط سے خندق کے آخری سرے تک جاتا ہے۔ یہاں خندق کے اوپر پتھر سے بنا ایک پل موجود ہے۔ اس ٹاور کے بالکل سامنے اندرونی دیوار کے اندر بیل ٹاور ہے جہاں سر تھامس مور اور ملکہ الزبتھ اول کو

قید کیا گیا تھا۔ بیل ٹاور سے مشرق میں کوئینز ہاؤس ہے جہاں الزبتھ اول کھانا کھاتی تھی اور جہاں اس کی ماں این بولین کو پھانسی دینے سے قبل رکھا گیا تھا۔

سفید ٹاور اور اندرونی حفاظتی دیوار کی مغربی دیوار کے درمیان گرین ٹاور ہے یہاں معروف شخصیات جن میں این بولین، کیتھرائن ہاورڈ اور لیڈی جین گرے شامل ہیں کی پھانسی کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ پھانسی پانے والوں کو سینٹ پیٹر کے گرجے کے نزدیک دفن کیا جاتا تھا۔ اس گرجے کے ساتھ ہی وسیع واٹرلو بیرکیں ہیں۔ 1967ء تک اس بیرک میں شاہی ہیرے رکھے جاتے تھے۔ ان جواہرات کو ٹاور آف لندن میں رکھنے کی ابتداء اس وقت ہوئی تھی جب 14ویں صدی عیسوی کے اوائل میں شاہی خزانہ یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ اس خزانہ کو یہاں منتقل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ 1303ء میں ویسٹ منسٹر ایبے میں واقع شاہی خزانے میں چوری کی ایک بہت بڑی واردات ہوگئی تھی اور چور ایک لاکھ پونڈ کی رقم لے گئے تھے۔ اس کے بعد شاہی جواہرات کو چرانے کی صرف ایک کوشش کامیاب ہوسکی۔ 1671ء میں سکاٹ لینڈ کا ایک بدمعاش ''کولونل بلڈ'' یہ جوہرات چرانے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر اس کو گرفتار کرنے کے بعد شاہ چارلس دوم نے اسے معاف کر دیا اور اپنے پاس جاسوس کی حیثیت سے ملازم رکھ لیا۔

ٹاور آف لندن کا ایک حصہ ویک فیلڈ خونی ٹاور کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ یہاں کمسن شہزادوں کو قتل کیا گیا تھا۔ اس خونی ٹاور کے قیدیوں میں آرچ بشپ گرین مر بھی شامل تھا جسے ملکہ میری کے حکم پر کھمبے سے باندھ کر جلا دیا گیا تھا۔ آج ٹاور آف لندن پھانسی دینے کی جگہ تو نہیں لیکن انگلینڈ میں آنے والے سیاحوں کے لیے سب سے زیادہ دلچسپی کا باعث ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ٹاور انگلستان کے دور شہنشاہیت کی تاریخ میں ظلم وتشدد کی ایک علامت کے طور پر قائم ہے۔ ٹاور آف لندن کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ اگر اس ٹاور میں قید کیا جانے والا کوئی باغی زندہ بچ جاتا تو یہ ٹاور بھی گر کر تباہ ہو جاتا۔

توہم پرستی قدیم زمانے اور دور دراز پسماندہ ترین علاقوں تک ہی مخصوص نہیں بلکہ برطانیہ جیسی سپر پاور حکومت اور شاہی خاندان بھی آج کے سائنسی دور میں اس کا شکار ہے۔ لندن کی اس تاریخی عمارت ٹاور آف لندن میں رہائش پذیر کوؤں کے بارے میں قدیم روایت

مشہور ہے کہ اس عمارت کے کوؤں سے خالی ہونے پر عمارت منہدم ہو جائے گی اور ساتھ ہی سلطنت برطانیہ کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ برطانوی شاہی خاندان اور حکومت کی طرف سے اس عمارت میں کم از کم 6 کوئے ہر وقت موجود رہتے ہیں اور ان کے لیے خصوصی اقدامات کیے گئے ہیں۔ ان کوؤں کو اڑنے سے روکنے کے لیے وقتاً فوقتاً ان کے پر کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ 11ویں صدی کے دوران تعمیر کی گئی اس قلعہ نما عمارت میں نیک شگون کے طور پر کوؤں کی رہائش کی روایت بھی صدیوں پرانی ہے۔

17ویں صدی عیسوی کے برطانوی بادشاہ چارلس دوم نے اس روایت سے متاثر ہوکر ٹاور آف لندن میں ہروقت کم ازکم چھ کوؤں کے موجود رہنے کو لازمی قرار دیا تھا۔ ان کوؤں کے باقاعدہ علیحدہ علیحدہ نام رکھے گئے ہیں جو بالڈوک، بران، بران وین، گنڈنف، گویلم، یوجین، مونین اور تھاز ہیں۔

امریکہ کا مجسمہ آزادی

(Statue of Liberty)

امریکہ کی آزادی اور جمہوریت کی علامت

اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مجسمہ امریکہ کا مجسمہ آزادی (Statue of Liberty) ہے جو جزیرہ بڈلوئی میں واقع ہے۔ امریکہ نے فرانسیسیوں کی مدد سے برطانیہ کے چنگل سے 4 جولائی 1776ء کو آزادی حاصل کی تھی۔ فرانس نے نہ صرف امریکن کالونیوں کو جنگ آزادی کے لیے اسلحہ، جہاز اور رقم فراہم کی بلکہ خود فرانسیسی باشندوں اور فوجیوں نے اس جنگ میں عملاً حصہ لیا۔ کچھ فرانسیسی جن میں سب سے قابل ذکر جارج واشنگٹن کے قریبی دوست مارکوس ڈی لافیٹی شامل ہیں امریکی فوج میں اعلیٰ عہدے پر پہنچے۔ ایسی ہی دوستی کے پیش نظر فرانسیسیوں نے امریکیوں کو مجسمہ آزادی تحفے کے طور پر پیش کیا۔

1776 میں امریکہ کی آزادی کے تقریباً 100 سال بعد 1865ء میں ایک فرانسیسی دانشور، سکالر اور ماہر قانون ایڈورڈ ڈاینے لی فیبوری نے امریکہ اور فرانس کی دوستی کے لیے فرانس کی طرف سے امریکہ کو ایک ایسا یادگار تحفہ دینے کا خیال پیش کیا جو دونوں ملکوں کی دوستی اور آزادی کی علامت کے طور پر ہمیشہ قائم رہے۔ یہی مجسمہ آزادی اس دانشور کے خواب کی عملی تعبیر ہے۔ مجسمہ آزادی کی تعمیر اور تخلیق کے لیے فرانسیسی عوام نے عوامی سطح پر چندہ جمع کیا۔ اسے فرانس کے مشہور مجسمہ ساز اور ایفل ٹاور کے خالق گستاف ایفل نے بنایا۔ فرانسیسی

عوام نے امریکی عوام کو آرٹ اور فن تعمیر کا یہ نادر نمونہ اپنی دوستی کی یاد اور ان کی آزادی کے احترام میں پیش کیا۔

مجسمہ آزادی ایک دیو ہیکل مجسمہ ہے۔ کانسی کی پلیٹوں سے بنا ہوا یہ مجسمہ 152 فٹ بلند ہے جو نیویارک میں لبرٹی آئی لینڈ پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اسے نئی دنیا (امریکہ) میں داخلے کے لیے گیٹ وے (Gateway) کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہ مجسمہ 4 جولائی 1884ء کو امریکی آزادی کے سو سال پورے ہونے پر فرانسیسی عوام کی طرف سے امریکی عوام کو تحفے کے طور پر دیا گیا تھا۔

شہر کی بندرگاہ کے رخ پر ایستادہ لکڑی کے ڈھانچے کے اوپر تانبے سے بنا یہ مجسمہ ایک ایسی عورت کی شکل ہے جس نے روایتی لباس زیب تن کر رکھا ہے جس کے سر پر سات پروں والا ایک تاج ہے۔ غلامی کی ٹوٹی زنجیریں اس کے قدموں میں پڑی ہیں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک شمع ہے جسے اس نے بلند کر رکھا ہے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک کتاب ہے جس پر اعلان آزادی کی تاریخ 4 جولائی 1776ء درج ہے۔ مجسمے کی بلندی 46 میٹر (151 فٹ اور 5 انچ) ہے۔ اسے اس دور کا سب سے اونچا اسکائی اسکریپر (Sky Scraper) کہا جا سکتا ہے۔ اس کی بنیاد یا پلیٹ فارم کو بھی شامل کریں تو اس کی کل اونچائی 93 میٹر (305 فٹ) بنتی ہے۔

یہ مجسمہ (Statue) جسے دنیا کو روشن کرنے والی آزادی قرار دیا جاتا ہے فرانسیسی مجسمہ ساز فریڈرک آگسٹ برتھولڈی کے فن کا ایک نمونہ ہے۔ اس نے 1875ء میں اپنے اسٹوڈیو میں اس پر کام کا آغاز کیا۔ پہلے اس نے مٹی سے ایک چھوٹے سائز کا ماڈل بنایا اور پھر نہایت باریک بینی سے پیمائش کرتے ہوئے اس کے تین بڑے نمونے کامیابی سے بنائے۔ آخر کار اس نے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ کے ماڈل پورے اور بڑے سائز میں لکڑی سے تیار کیے اور ان پر پلاسٹر چڑھایا۔ پھر کارپینٹروں نے پلاسٹر سے بنی شکل کے مطابق لکڑی کی شکلیں بنائیں۔ تانبے کی چادروں کو ان لکڑی کی شکلوں پر ہتھوڑے کے ذریعے مطلوبہ شکل وصورت میں لایا گیا۔ پھر اسے اسٹوڈیو کے نزدیک ایک بڑے صحن میں بنائی گئی فل سائز کی اسمبلی اور سپورٹ فریم پر جوڑا گیا۔

جب دارالحکومت پیرس میں اس مجسمے کو مکمل طور پر جوڑ لیا گیا تو پھر اس کے تمام حصوں کو دوبارہ علیحدہ کر کے 214 لکڑی کے بڑے بڑے بکسوں میں پیک کیا گیا اور بحری جہاز کے ذریعے امریکہ روانہ کر دیا گیا۔ مختلف حصوں میں بٹا یہ مجسمہ 17 جون 1885ء کو نیویارک پہنچا۔ اس دیوہیکل مجسمہ کی تعمیر کے بنیادی مسائل کے حل کے لیے برتھولڈی نے ایفل ٹاور کے معمار انجینئر گستاف ایفل کی خدمات حاصل کیں تاکہ وہ اس کا اندرونی سپورٹنگ سسٹم ڈیزائن کرے۔ ایفل نے مجسمہ آزادی کے داخلی فریم میں چار افقی کالموں پر مشتمل ایک مرکزی ٹاور تیار کیا جسے عمودی بیم کے ذریعے آپس میں جوڑا گیا تھا۔ اسے زمین پر کنکریٹ اور گرینائٹ کے پیڈسٹل پر کھڑا کیا گیا۔ پیڈسٹل کی یہ فاؤنڈیشن اس وقت دنیا میں سب سے بڑی اور واحد کنکریٹ اسٹرکچر تصور کی جاتی تھی جسے امریکی ماہر تعمیرات رچرڈ مورس ہنٹ نے تقریباً 80 سال پہلے نیویارک شہر کو بحری حملے سے بچانے کے لیے ایک ستارہ کی شکل کے قلعے کی دیواروں کے درمیان تعمیر کیا تھا۔

گستاف ایفل نے مجسمہ آزادی کے لیے جو داخلی ڈیزائن تیار کیا تھا اس نے تعمیرات کی دنیا میں چند ایسی اختراعات متعارف کرائیں جو امریکہ میں آئندہ تعمیرات کے لیے نہایت اہم ثابت ہوئیں۔ وسائل کی فراہمی میں تاخیر کے سبب بالآخر 1886ء میں آٹھ لاکھ ڈالر کی لاگت سے اپنی بنیاد اور پلیٹ فارم سمیت مجسمہ آزادی مکمل ہو گیا۔ اس پر خرچ ہونے والی رقم میں آدھی فرانسیسیوں نے اور آدھی امریکیوں نے جمع کی تھی۔ اسے امریکی حکومت نے 1886ء میں 112 ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے جزیرہ بڈلوئی میں نصب کیا۔ مجسمہ پر چڑھنے کے لیے 186 سیڑھیاں ہیں۔

❀ ❀ ❀

مادام تساؤ کا مومی عجائب گھر

دنیا کی تاریخ کا عینی شاہد

لندن کے مادام تساؤ میوزیم کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر جو کوئی بھی اس عجیب و غریب میوزیم کو ایک بار دیکھ آتا ہے اسے یہ تاریخی عمارت عجوبے سے بھی کوئی آگے کی چیز لگتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کا مبالغہ بھی نہیں ہے۔ مادام تساؤ میوزیم دراصل اس بچی کی کہانی ہے جس کا اصل نام ''میری گروشولز'' (Marie Grosholtz) تھا۔ 1761ء میں اس کا باپ یورپ کی سات سالہ جنگ میں مارا گیا۔ تب وہ اپنی ماں کے ساتھ پارسی ڈاکٹر فلیس کریٹس کے گھر چلی گئی اور گھریلو کام میں اس کا خوب ہاتھ بٹانے لگی۔

ڈاکٹر فلیس کریٹس خود بھی عجیب و غریب مومی چیزیں اور مجسمے بنا کر ان کی نمائش کیا کرتا تھا اور اس سے اچھے خاصے پیسے کماتا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں جو آرٹ گیلری بنا رکھی تھی اس میں اپنے وقت کے معروف اساتذہ، ماہر تعمیرات، کھلاڑیوں حتیٰ کہ چوروں، ڈاکوؤں اور لٹیروں کے مجسمے بھی موجود تھے۔ اس کی یہ آرٹ گیلری کسی قدیم زمانے کا ایک غار معلوم ہوتی تھی۔ یہاں ڈاکٹر کریٹس سے مومی چیزیں بنانے کی مہارت حاصل کرنے کے بعد میری اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ یہ تعلیم مزید کسی دوسرے کو دے سکے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مادام تساؤ (میری) فرانس کے شاہ لوئس XVI کی چھوٹی بہن کو آرٹ کی تربیت دینے پر مامور ہو گئی۔

دلچسپ وحیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت میری بمشکل 9 برس کی تھی جب وہ شاہ لوئس کی بہن کو آرٹ کی تربیت دے رہی تھی۔ اسی دوران انقلاب فرانس رونما ہوا جس میں میری (مادام تساؤ) کو بھی قید کر دیا گیا۔ اسے فرانس کی شہزادی کے برابر والا سیل (کمرہ) دیا گیا۔ چونکہ میری کی مجسمہ سازی کی مہارت سے انقلابی گروپ بھی واقف تھا اس لیے اس ننھی قیدی بچی سے کہا گیا کہ وہ انقلاب فرانس میں ہلاک ہونے والی اہم شخصیات کے ماسک تیار کرے۔

9 سالہ میری کے لیے یہ ایک بہت ہی خوفناک بلکہ ہولناک تجربہ تھا کہ ایسے لوگ جن کے چہرے جنگی ہلاکت کے بعد بری طرح سے مسخ اور ڈراؤنے ہو چکے تھے جن کے کٹے ہوئے سر بھی لا کر باقاعدہ اسے دکھائے گئے تھے۔ اسے کہا گیا کہ وہ ان چہروں کو سامنے رکھ کر ایسے ہی ہو بہو ماسک تیار کرے۔ لہٰذا میری نے سب سے پہلے فرانس کے ہلاک ہونے والے بادشاہ اور اس کی ملکہ کے چہرے کے ماسک بنائے۔ جسے انقلابیوں نے بہت پسند کیا اور پھر میری کو اس کام کے لیے ہی مخصوص کر دیا گیا۔

اسی طرح وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ میری کی مجسمہ سازی کی شہرت اور مہارت دور دور تک چلی گئی۔ اسی دوران ایک فرانسیسی باشندہ فرانسکو تساؤ میری کی شخصیت اور فن کا اس قدر مداح ہو گیا کہ اس نے اس مجسمہ ساز لڑکی کو شادی کی پیشکش کی جو میری نے بہت سوچ سمجھ کے بعد قبول کر لی۔

اس طرح 1795ء میں اس کی شادی فرانسکو تساؤ سے ہو گئی اور یوں میری کو نیا نام یعنی ''مادام تساؤ'' مل گیا۔ اس دوران اس کے ہاں ایک بیٹا بھی پیدا ہوا۔ انہیں دنوں مادام تساؤ نے مشہور برطانوی جزائر کی سیر وسیاحت کی اور وہاں جو بھی مناظر دیکھے مادام تساؤ نے واپسی پر ان جزائر کا نقشہ اپنی انگلیوں سے بنا ڈالا جو آج بھی مادام تساؤ میوزیم میں موجود ہے۔ وہ اپنے کام میں اس قدر مگن ہو گئی کہ اس نے اپنی ازدواجی زندگی کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ حتیٰ کہ 1807ء میں مادام تساؤ نے شوہر سے قانونی طور پر علیحدگی حاصل کر لی اور پیرس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر لندن آ گئی۔ وہ اپنے ساتھ اپنے بیٹے کو بھی برطانیہ لے آئی۔ 1802ء میں مادام تساؤ نے لندن آ کر ''مادام تساؤ میوزیم'' کی بنیاد رکھی۔

برطانیہ آ کر مادام تساؤ کو پتہ چلا کہ برطانوی حکومت اور یہاں کے باشندے تو پہلے ہی اس کے فن کے شیدائی ہیں۔ اس سلسلے میں برطانوی حکومت نے خصوصی طور پر مادام تساؤ سے رابطہ کیا اور اسے کہا گیا کہ وہ منہ مانگے داموں پر انقلاب فرانس کے بارے میں نہ صرف ہلاک ہونے والوں بلکہ جنگی عمل کو بھی اپنے فن کی صورت میں محفوظ کر لے۔ اپنی انہی کوششوں اور جدوجہد میں مصروف رہنے کے بعد 15 اپریل 1850ء کو مادام تساؤ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

کافی عرصہ بعد 1884ء میں مادام تساؤ کے پوتے نے اپنی دادی کے کام کو آگے بڑھایا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی دادی کے گھر کو مومی مجسموں کی یادگار بنا دیا اور اس جگہ ایک پرشکوہ عمارت تعمیر کروائی جو خود فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ تھی۔ 1925ء میں ایک موقع پر عمارت کو آگ لگ گئی اور اس کا ایک حصہ بری طرح سے تباہ ہو گیا مگر 1928ء میں اس کی دوبارہ مرمت کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ عمارت میں ایک ریسٹورنٹ اور ایک سینما ہال کا بھی اضافہ کیا گیا۔

مادام تساؤ جب برطانیہ آئی تو وہ برطانیہ کے شاہی خاندان اور اس کے افراد سے بے حد متاثر تھی۔ تب اس نے کئی برطانوی بادشاہوں کے مجسمے بھی بنائے تھے۔ آج میوزیم میں ملکہ برطانیہ اور شاہی خاندان کی تمام شخصیات کے مجسمے موجود ہیں۔ اس میوزیم کے اندر ایک کمرہ ایسا بھی ہے جہاں پرنس آف ویلز کے علاوہ اس دور کے مصاحبین اور درباری نظر آتے ہیں۔ یہاں پر ملکہ برطانیہ کی والدہ کا مومی مجسمہ خاص اہمیت کا حامل ہے اور اسے دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے سچ مچ ملکہ ان کے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اسے ایک ماں اور ایک ملکہ دونوں روپ میں مکمل دکھایا گیا ہے۔

مادام تساؤ نے 33 برس تک اپنے مشاہدے کے لیے سیر و سیاحت بھی کی جس کے بعد اس نے لندن کی بیکر سٹریٹ میں میوزیم بنانے کے لیے ایک جگہ حاصل کی۔ اس میوزیم میں خاص طور پر ایک ایسا چیمبر بنایا گیا تھا جہاں انقلاب فرانس کے بارے میں تاریخی مجسموں کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔

حتیٰ کہ اہم شخصیات کے علاوہ اس دور کے بڑے بڑے مجرموں اور جرائم پیشہ افراد

کے مجسمے بھی بنائے گئے تھے۔ اسی میوزیم کے خاص کمرے کا دروازہ حساس اور بزدل لوگوں کے لیے ہمیشہ بند رہتا تھا۔ کیونکہ اس کمرے میں بہت خوفناک مناظر تھے۔ اس چیمبر کے شائقین میں چارلس ڈکنز بھی تھا جس نے کھلے عام یہ چیلنج دے رکھا تھا کہ جو کوئی ایک رات بھی اس میوزیم میں گزار لے گا وہ بھاری انعام کا مستحق ہوگا۔ مگر چارلس ڈکنز کا یہ چیلنج آج تک کوئی قبول نہیں کر سکا۔

مومی میوزیم میں رکھا مادام تساؤ کا مجسمہ اس کی موت سے 8 سال قبل 1842ء میں بنایا گیا تھا جب وہ خاموش اور غیر معمولی زندگی بسر کر رہی تھی اور انقلاب فرانس کی نشانیوں کو مجسموں کی صورت میں محفوظ کر رہی تھی۔ مادام تساؤ میوزیم میں مہاتما گاندھی کا مجسمہ بھی موجود ہے۔

یہ اس وقت بنایا گیا تھا جب گاندھی 1931ء میں لندن میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ میوزیم میں جنوبی افریقہ کے عظیم لیڈر نیلسن منڈیلا کا مجسمہ 1991ء میں بنایا گیا جب انہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں ان کی قوم نے ''بابائے قوم'' کا لقب دیا۔ اس کے علاوہ مقدس پوپ جان پال دوم کا مجسمہ بھی موجود ہے۔

لیڈی ڈیانا کا مجسمہ میوزیم میں 1996ء میں بنایا گیا۔ سرخ لباس میں ڈیانا کا مجسمہ بنانے کے لیے باقاعدہ ڈیانا کی ماڈلنگ کروائی گئی تھی۔ مادام تساؤ میوزیم کے خاص چیمبر میں ان لوگوں کے ماسک بھی رکھے گئے ہیں جن کے سر انقلاب فرانس میں قلم کر دیئے گئے تھے۔ ان بدنصیبوں میں شاہ لوئس 16 اور میری انتونیو شامل ہیں۔ امریکی صدر کینیڈی کا مجسمہ بھی میوزیم کی زینت ہے۔ ان کا مجسمہ 1961ء میں شامل کیا گیا۔ اس کے علاوہ عالمی شہرت یافتہ ہیوی ویٹ چیمپئن محمد علی کلے کا مجسمہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کیوبا کے لیڈر فیڈل کاسترو کا مجسمہ بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔

مادام تساؤ کے مومی عجائب گھر میں دنیا بھر کی ہر بڑی اور مشہور شخصیتوں مثلاً سربراہان مملکت، بادشاہ، وزراء اعظم، سائنسدان، عالمی لیڈر، کھلاڑیوں اور شوبز سے تعلق رکھنے والوں کے مومی مجسمے موجود ہیں۔ ستمبر 2004ء میں بھارت کی مشہور اداکارہ اور سابقہ ملکہ حسن ایشوریہ رائے کا مومی مجسمہ میوزیم میں رکھنے کی تقریب منعقد ہوئی۔

مادام تساؤ میوزیم کے اپنے اسٹوڈیوز ہیں جہاں موی مجسمے بنانے سے پہلے شخصیات کی ماڈلنگ کی جاتی ہے۔ چہرے کے مطابق سائز لے کر ماسک تیار کیے جاتے ہیں۔ میوزیم کی نگران جینی کے مطابق مجسمے پہلے مٹی سے بنائے جاتے ہیں پھر ان کے اوپر پلاسٹر چڑھایا جاتا ہے اور اس کے اوپر فائبر گلاس استعمال ہوتا ہے۔ اس سے ڈھانچہ کافی مضبوط ہو جاتا ہے جبکہ چہرہ ویکس سے بنایا جاتا ہے۔

حاجیہ صوفیہ

(Hajia Sophia)

مقدس دانائی کا چرچ، مسجد یا میوزیم

مقدس دانائی کا چرچ جو انگریزی میں "حاجیہ صوفیہ" (Hajia Sophia) کے نام سے مشہور ہے ایک سابق یونانی آرتھوڈوکس چرچ تھا۔ 1453ء میں جب عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ (اب استنبول) کو فتح کیا تو اسے ایک مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ 1924ء میں کمال اتاترک کی جمہوری حکومت نے اسے میوزیم میں تبدیل کر دیا۔ استنبول میں اس عمارت کو عالمی سطح پر دنیا کی عظیم ترین عمارات میں سے ایک تسلیم کیا جاتا ہے۔

حاجیہ صوفیہ جو بازنطینی طرز تعمیر کی عظیم ترین زندہ مثال ہے سب سے پہلے چوتھی صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا۔ پھر اس کی تباہی کے بعد کانسٹنٹائن دی گریٹ کے بیٹے نے اسے دوبارہ تعمیر کیا۔ 532ء کے فسادات میں یہ ایک مرتبہ پھر تباہ ہوا۔ اب کی بار اسے عیسائی بادشاہ جسٹنین اول نے اپنی ذاتی نگرانی میں تعمیر کرایا۔ اس کی آرٹسٹک عظمت اس کے داخلی ڈیزائن موزیک اور سنگ مرمر کے ستونوں میں تھی۔

حاجیہ صوفیہ کی تعمیر و آرائش اس قدر زبردست تھی کہ جسٹنین نے بڑے فخر سے کہا تھا "سلیمانؑ میں نے تمہیں پیچھے چھوڑ دیا"۔ اس وقت یہ دنیا کا عظیم ترین کیتھڈرل تھا کہ ایک ہزار سال تک جس سے بڑا کیتھڈرل نہیں بنایا جا سکا۔ آج یہ اپنے سائز کے لحاظ سے دنیا کا

چوتھا بڑا کیتھڈرل ہے۔ حاجیہ صوفیہ کا گنبد خاص طور پر آرٹ کے مورخوں اور ماہرین تعمیر کے نزدیک اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اسے پنڈولم کی تکنیک کے ذریعے بڑے اختراعی انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس سے پہلے کسی عمارت میں یہ تکنیک استعمال نہیں کی گئی تھی۔ اس تکنیک نے نہ صرف اسے جمالیاتی حسن بخشا تھا بلکہ اس بہت بڑے گنبد کا وزن جو کسی عام سٹرکچر کے لیے سنبھالنا ناممکن تھا بنیادوں پر تقسیم ہو جاتا تھا۔

اس عمارت کی دوسری دلچسپ حقیقت وہ چالیس کے قریب کھڑکیاں ہیں جو گنبد کی بنیاد کے گرد بنائی گئیں۔ حاجیہ صوفیہ اپنی جادوئی روشنی کی وجہ سے بھی مشہور ہے جو عمارت کے اندر ہر طرف عجیب انداز میں منعکس ہوتی ہے۔ یہ ڈیزائن اس طرح ممکن ہوا کہ اسے ایک کھلی ہوئی چھتری کی طرح بنایا گیا جس کے اندر کی مخروطی شاخیں اس کی کھڑکیوں کو محفوظ رکھ کر اس کے وزن کو بتدریج اس کی بنیادوں پر منتقل کر دیتی ہیں۔ عثمانی ماہر تعمیرات نے اس عمارت کے کئی حصوں کی تعمیر نو اور اسلامی آرکیٹکچر کی کئی اہم علامتوں اور محرابوں کو اس میں شامل کیا۔ ان میں سب سے مشہور کام 16ویں صدی کے عثمانی معمار اعظم سینان کا تھا۔ اس نے اس کا پرانا گنبد گرا کر نیا گنبد تعمیر کیا اور پرانے میناروں کی جگہ بھی نئے مینار بنائے جو آج بھی قائم ہیں۔

اگلے چار سو سالوں میں بھی ہر بڑے زلزلے اور یہاں لگنے والی آگ کے بعد اس کی تعمیر و مرمت کا کام جاری رہا تاکہ اسے محفوظ رکھا جا سکے۔ حاجیہ صوفیہ ایک مرکزی گنبد سے ڈھکا ہوا ہے جس کی چوڑائی 31 میٹر (102 فٹ) اور بلندی 56 میٹر ہے۔ یہ گنبد اپنی محرابی کھڑکیوں کی بدولت بے وزن نظر آتا ہے۔ اس کے مشرقی اور مغربی کناروں پر محرابی دروازے ہیں جن کے اوپر نصف گنبد بنے ہوئے ہیں۔ اس کی داخلی دیواروں پر پولی کروم ماربل لگایا گیا ہے جس کا رنگ سبز اور سفید ہے۔

حاجیہ صوفیہ قسطنطنیہ کے آرتھوڈوکس عیسائی حکمرانوں کی گدی رہی ہے۔ جہاں شاہی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ یہاں لاطینی قبضے کے دوران (1204-61ء) اسے رومن کیتھولک چرچ میں بدل دیا گیا اور اس کے بہت سے خزانے اور منفرد علامتیں ضائع ہو گئیں۔ 1453ء میں عثمانی سلطان محمود دوم کے عہد حکومت میں اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ چونکہ اسلام میں انسانی شکلیں اور تصویریں جائز نہیں اس لیے اس کے موزیک پلاسٹر سے ڈھک

دیئے گئے۔ تاہم ان تاریخی ڈیزائنوں کو عثمانی سلطانوں نے ضائع نہیں کیا بلکہ مختلف وقفوں سے موزیک کو برقرار رکھتے ہوئے ان پر پلاسٹر چڑھایا جاتا رہا۔

تقریباً 500 سال تک حاجیہ صوفیہ جسے ترک ''آیا صوفیہ'' کے نام سے پکارتے ہیں استنبول کی بڑی مسجد رہی اور عثمانی دور کی کئی مساجد مثلاً مسجد شہزاد، مسجد سلیمان اور مسجد رستم پاشا اسی حاجیہ صوفیہ کی مثال کو سامنے رکھ بنائی گئیں۔ 1932ء میں امریکن بازنطینی انسٹی ٹیوٹ نے اس عمارت کی بحالی کا کام شروع کیا جب اس کے اندر بنی اکثر شکلیں دوبارہ دریافت کی گئیں۔ بطور ایک چرچ اور ایک مسجد اس عمارت کی طویل تاریخ نے اس کی بحالی کا کام کرنے والوں کے سامنے بھی ایک چیلنج رکھا۔ عیسائی تصویری موزیک نمایاں کیے گئے تاہم اس عمل میں کئی اہم تاریخی اسلامی آرٹ کے نمونے ضائع ہو گئے۔

سیسٹائن چیپل

(Sistine Chapel)

مذہب اور آرٹ کی نادر عکاسی

دنیا بھر میں جتنی بھی عبادت گاہیں تعمیر کی جاتی ہیں خواہ وہ مساجد ہوں۔ مندر ہوں گرجے ہوں۔ چیپل ہو یا سینا گاگ۔ وہ اس مذہب کے بنیادی فلسفہ حیات، بندے اور اس کے رب کے درمیان مطلوب تعلق کی نوعیت، زندگی میں مذہب کی فوقیت و عملداری اور روحانی وابستگی اور بالیدگی کی انسانی خواہش کی بھی تصویر کشی کرتی ہیں۔ سیسٹائن چیپل ایسا ہی ایک عبادت خانہ ہے جس نے عیسائیت کے بنیادی نظریہ زندگی اور بائبل میں درج کائنات کی تخلیق کی کہانیوں کو تصویری شکل میں پیش کر کے بائبل کی تعبیر و تشریح کا کام آسان بنایا۔ اس کے ساتھ ہی آرٹ، فن اور مصوری کی دنیا میں بھی ایک تہلکہ مچا دیا۔

رومن کیتھولک پوپ کی سرکاری رہائش گاہ ویٹی کن سٹی کے ویٹی کن پیلس میں ہے۔ اس پیلس کے ساتھ ہی سیسٹائن چیپل واقع ہے جسے پوپ سیکٹس چہارم نے 1475ء سے 1483ء کے دوران بنوایا تھا۔ یہ مغربی دنیا کے معروف ترین چرچوں میں سے ایک ہے جو دنیا بھر میں اپنے منفرد اور وسیع ہال کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے۔ یہاں عیسائیت کی سرکاری تقریبات اور پوپ کی رسم تاجپوشی جیسی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ اس ہال کے معروف ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کی چھت کی اندرونی سمت تصویر کشی کا آرائشی اور تمثیلی کام اٹلی کے

ایک عظیم مصور مائیکل اینجلو نے کیا تھا۔

سیسٹائن چیپل 132 فٹ لمبا اور 44 فٹ چوڑا ہے۔ اس گرجے کی پیمائش بائبل میں درج حضرت سلیمانؑ کے ہیکل سلیمانی کی پیمائش کے مطابق کی گئی۔ اس کی لمبائی اس کی بلندی سے دوگنا اور چوڑائی سے تین گنا ہے۔ پوپ سیکسٹس نے اس دور کے عظیم فنکاروں کے ایک پورے گروپ کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے اس گرجے کی دیواروں پر پوری پوری کہانیاں مصور کیں۔ جنوبی دیوار پر حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے مختلف واقعات کو پینٹنگ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے جبکہ شمالی دیوار پر حضرت موسیٰؑ کی زندگی تصویروں کے ذریعے سامنے ہے۔ جب یہ چیپل تعمیر ہوا اس وقت ہال کی چھت بالکل سادہ تھی۔

1508ء میں پوپ سیکسٹس کے بھتیجے پوپ جولیس دوم نے مائیکل اینجلو کو سیسٹائن گرجا کی چھت کی آرائش کا کام سونپا۔ ابتداء میں مائیکل اینجلو یہ کام کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک مصور کی بجائے ایک مجسمہ ساز ہے لیکن جولیس کے مجبور کرنے پر اس نے یہ کام کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ مسلسل چار سال تک کام کرتا رہا اور اس کام میں اتنا غرق ہو گیا کہ راتیں بھی مچان پر گزارتا۔

مائیکل اینجلو نے اس کام کے لیے فریسکو میڈیم استعمال کیا۔ یہ چھت یا دیوار پر استرکاری کے خشک ہونے سے پہلے تصویر کشی کا ایک طریقہ ہے۔ اس نے شوخ اور چمکیلے رنگ استعمال کیے۔ اسے کام کرنے کے لیے مسلسل اوپر دیکھنا پڑتا تھا اور یوں گیلے پینٹ کے قطرے اس کے چہرے پر ٹپکتے رہتے تھے۔ یہ کام ابھی نصف مکمل ہوا تھا کہ پوپ نے یہ مطالبہ کیا کہ اسے عوام کو دیکھنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس نے اس عظیم مصور کو دھمکی دی کہ جب تک اس نے چھت کا کام مکمل نہ کیا اسے مچان سے نیچے نہیں اترنے دیا جائے گا۔ یوں مائیکل اینجلو نے اس مصوری کے بارے میں جو منصوبہ اپنے ذہن میں بنایا تھا اس نے اسے ادھورا اور نامکمل چھوڑ دیا لیکن جب گرجے کی یہ چھت عوام کے سامنے آئی تو وہ ششدر رہ گئے۔

بائبل میں دنیا کے وجود میں آنے کی جو کہانی درج ہے مائیکل اینجلو نے انہیں چھت پر 9 مناظر میں پینٹ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ روشنی کو اندھیرے سے الگ کر رہے ہیں۔

ستارے کس طرح وجود میں آئے۔ زمین پانی سے کس طرح جدا ہوئی ہے۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق کا منظر، حضرت حوا کی پیدائش، ان دونوں کے جنت سے اس دنیا میں آنے کا منظر، حضرت نوحؑ کی قربانی، طوفان نوحؑ کا منظر۔ ان میں سے پانچ مناظر کے گرد اس نے بہت خوبصورت فریم بنائے ہیں۔ سیسٹائن چیپل کی چھت پر بنی ہوئی تصاویر ایک بہت بڑی کہانی کی صورت میں دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ فن کی دنیا میں انسان نے اس سے عظیم اور کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔

ان پینٹنگز کا حسن اس منظر میں اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کو مٹی سے بنا رہے ہیں اور ان میں کس طرح روح پھونکی جاتی ہے۔ اس گرجے کی چھت پر مائیکل اینجلو کا یہ آخری کام نہیں تھا۔ 1535ء میں پوپ پال سوم کی درخواست پر وہ ایک بار پھر یہاں آیا اور اس نے آخری سرے کی دیوار کے مناظر تبدیل کر کے آخری فیصلے کے منظر یہاں پینٹ کیے۔ عمر کی زیادتی کی وجہ سے اس نے اس کام کو چھ سال میں مکمل کیا۔

سینٹ پال کیتھڈرل

(Saint Paul Cathederal)

یورپ میں عیسائیت کا اہم تعمیراتی معجزہ

قرون وسطیٰ کے دور میں یورپ میں گاتھ طرز تعمیر کے جو گرجا گھر بنائے گئے تھے اور جن کی خصوصیت نوک دار محراب ہوتی تھی وہ عمارتیں طرز تعمیر کے نادر شاہکار ہیں۔ یہ عمارتیں اتنی بڑی ہوتی تھیں کہ ان کے مکمل ہونے میں کئی کئی سال لگ جاتے تھے۔ اس کے لیے ان عمارتوں کے نقشے ایک سے زیادہ آدمی تیار کرتے تھے۔

اٹلی کے طرز تعمیر کا اثر 7ویں صدی عیسوی تک انگلینڈ نہیں پہنچ سکا تھا۔ انگلستان میں ''ایٹو گوجائز'' ایک ماہر تعمیرات تھا۔ دوسرا قابل ذکر ماہر تعمیر وہ تھا جس نے وہ کارنامہ سرانجام دیا جو اس سے پہلے اور کسی ماہر تعمیر نے نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک عظیم گرجے کا ڈیزائن بنایا اور یہ عظیم گرجا گھر صرف 35 برس میں مکمل ہو گیا۔ یہ لندن شہر میں بنایا جانے والا گرجا سینٹ پال تھا اور ماہر تعمیر سر کرسٹوفر رین تھا جس کے دور کا آغاز 1632ء سے ہوتا ہے۔ رین نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز ایک سائنسدان کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس نے ڈیزائنگ کی کوئی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ اپنے ذاتی شوق سے خود ہی مختلف عمارتیں ڈیزائن کی تھیں۔

سینٹ پال کا نادر ڈیزائن بنانے کے بعد رین نے لندن کے جن گرجا گھروں اور پبلک عمارتوں کے ڈیزائن بنائے ان کی تعداد 52 ہے۔ لندن میں 1666ء کی عظیم آتشزدگی کے

بعد شہر کو از سر نو تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی اس نے بنایا تھا۔ اگر اس کے منصوبے پر عمل کیا جاتا تو لندن آج یورپ کا سب سے خوبصورت شہر ہوتا۔ سینٹ پال گرجا 1675ء اور 1710ء کے دوران اس جگہ پر بنایا گیا تھا جہاں قدیم ازمنہ وسطیٰ کا ایک گرجا تھا جو ایک آگ کے نتیجے میں تباہ ہوا تھا۔

سینٹ پال کا سب سے خوبصورت حصہ عظیم گنبد ہے۔ یہ گنبد بے شمار ستونوں پر کھڑا ہے۔ اس کے اوپر پتھر کی بنی ایک لالٹین ہے۔ لالٹین کے اوپر ایک گنبد اور اس پر ایک کراس کا نشان ہے۔ گنبد 336 فٹ بلند جبکہ اس کا قطر 131 فٹ ہے۔ اس کے خوبصورت تناسب نے اسے یورپ کا سب سے نفیس گنبد بنا دیا ہے۔ روم کے گرجے سینٹ پیٹر کا وہ گنبد جس کا ڈیزائن مائیکل اینجلو نے تیار کیا تھا وہ بھی اس کی اہمیت تک نہیں پہنچ سکا۔ یہ گنبد ڈیزائن کرتے وقت کرسٹوفر رین نے بڑی مہارت دکھائی۔ باہر سے دیکھنے سے یہ گنبد اتنا لمبا نظر آتا ہے کہ یہ اپنے اردگرد کی تمام عمارتوں پر چھایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے اندر سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک لمبی چمنی ہے۔

اس گنبد کا پتھر کی ایک بہت بھاری لالٹین کے وزن کو برداشت کرنا بھی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کا حل اس طرح تلاش کیا گیا کہ ایک ہی گنبد کے اندر تین گنبد بنائے گئے۔ اندرونی گنبد متاثر کن اور اونچا ہے لیکن بہت زیادہ بلند نہیں ہے۔ دوسرا گنبد جو نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اینٹوں سے بنا مخروطی شکل کا ہے۔ اسی گنبد نے ہی لالٹین کا وزن اٹھا رکھا ہے۔ بیرونی گنبد لکڑی کا بنا ہوا ہے اور اس پر سیسہ چڑھا ہوا ہے۔ سینٹ پال کی نچلی منزل کے لیے رین نے جو پہلا ڈیزائن تیار کیا تھا وہ ایک یونانی طرز کے گرجے کا تھا لیکن بڑے پادری نے اس ڈیزائن کو مسترد کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ گرجے کا وسطی حصہ لمبا اور روایتی طرز کا بنایا جائے اور آخر لاطینی طرز کا ڈیزائن منظور کیا گیا۔

باہر سے سینٹ پال کی عمارت دو منزلہ نظر آتی ہے۔ اس منصوبہ بندی نے اس عمارت کی بلندی اس قدر کر دی ہے کہ عظیم گنبد کا اس کے ساتھ صحیح تناسب پیدا ہوا ہے۔ سینٹ پال کے مغربی کنارے پر اندر داخل ہونے کا جو مرکزی راستہ ہے اس کا پورچ دو منزلہ ہے۔ یہ پورچ ستونوں پر قائم ہے۔ اس پورچ کے اوپر کے مثلث حصہ پر سینٹ پال کی شبیہہ

کندہ کر کے ابھاری گئی ہے۔ یہاں سامنے کے حصہ پر دونوں جانب دوخوبصورت گھنٹہ گھر ہیں۔گنبد کے ساتھ ساتھ یہ دونوں ٹاور بھی رین نے ڈیزائن کیے جوشاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

مغربی دروازے سے داخل ہوں تو سینٹ پال کا اندرونی حصہ روشنی سے منور محسوس ہوتا ہے۔گنبد کے نیچے کا درمیانی حصہ ایک متاثر کن تاثر پیدا کرتا ہے۔اس کی آرائش لکڑی، پتھر اور لوہے سے کی گئی ہے۔ یہ ساری آرائش اپنے وقت کے بہترین ہنرمندوں نے کی تھی۔ عبادت کے لیے بیٹھ کر گانے والوں کا سائبان اور آرگن کا غلاف لکڑی کو تراش کر نقش و نگار بنانے والے عظیم فنکار گرنگلن گیبنز نے بنایا تھا جبکہ دلکش ڈیزائنوں سے مزین لوہے کے گیٹ فرنچ مین جین ٹی نے تیار کیے۔ اس عمارت کا خالق کرسٹوفر رین خود اس گرجے کے جنوبی راستے کے نیچے دفن ہے۔اس کی قبر کے اوپر دیوار پر ایک کتبے پر اس کے کوائف درج ہیں۔

کرائسٹ دی ری ڈیمر

(Christ The Re Daimer)

برازیل میں حضرت عیسیٰؑ کا سب سے بڑا مجسمہ

جنوبی امریکہ کا ملک برازیل (Brazil) دو خصوصیات کی بنا پر پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ایک تو یہاں کی فٹ بال ٹیم اور دوسرا مسیح علیہ السلام کا عظیم الجثہ مجسمہ جو یہاں کے مشہور شہر ریوڈی جنیرو کی ''کارکوواڈو'' پہاڑی پر اپنی بانہیں پھیلائے سایہ فگن ہے جو مسیحیوں کے نزدیک ان کی نجات کا وعدہ کرتا ہے اور اپنی کھلی بانہوں کے ساتھ یہاں آنے والے مہمانوں کا استقبال کرتا ہے۔

''کرائسٹ دی ری ڈیمر'' نامی مجسمہ میں بیک وقت تین خصوصیات ہیں۔ پہلی یہ امریکی مجسمہ آزادی کی طرح فنکارانہ حسن کا شاہکار ہے۔ دوسرے مسیح علیہ السلام کی شبیہ کی طرح روحانی بالیدگی کا مظہر ہے اور مشہور عالم سات عجائبات میں سے ایک رہوڈز کے مجسمے کی طرح عظیم الجثہ ہے۔ کارکوواڈو کی پہاڑی چوٹی پر واقع یہ مجسمہ 1931ء میں تعمیر کیا گیا۔ اس پہاڑی سے پورے شہر پر نظر ڈالتے ہوئے شہر کے پار بحرالکاہل کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

اکثر سیاح اس مجسمے تک پہنچنے کے لیے 1884ء میں بنائی گئی کارکوواڈو ریلوے کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ مجسمہ اپنی تعمیر میں حائل ان مشکلات کی وجہ سے بھی ایک عجوبہ ہے جو جدید انجینئروں کو اس کی تعمیر میں پیش آئیں۔ 38 میٹر (125 فٹ) بلند مجسمہ 710 میٹر اونچی

پہاڑی کی چوٹی پر گرینائٹ ڈوم سے بنایا گیا۔ اس کے سر کی لمبائی 3.75 میٹر، ہاتھ کی لمبائی 3.2 میٹر اور ایک ہاتھ کی انگلیوں سے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں تک چوڑائی 28 میٹر ہے۔

1921ء میں برازیل میں ایک ایسی یادگار تعمیر کرنے کا فیصلہ ہوا جو مقامی کیتھولک باشندوں کے لیے روحانی کشش کا باعث ہو اور برازیل کے 100ویں یوم آزادی (7 ستمبر 1922ء) کا تحفہ قرار پائے۔ یہاں کے اہم پادریوں اور نمایاں سیاستدانوں نے جگہ اور مجسمہ کی عمومی ساخت کا تعین کیا۔ مسیح علیہ السلام کے اس مجسمے کے لیے کئی ڈیزائن زیر بحث آئے جن میں کرسچین کراس کا ڈیزائن، ایک مجسمہ جس کے ہاتھ میں گلوب (دنیا کا نقشہ) ہو اور ایک پیڈسٹل جو دنیا کی علامت بنے۔ لیکن آخر میں کھلی بانہوں والے مجسمے کا انتخاب کیا گیا۔ جو بیک وقت کراس کے نشان کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ سب کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لینے کی علامت بھی ہے اور نجات دہندہ، دوبارہ زندہ ہو جانے والے مسیح کی ایک شبیہہ بھی ہے۔

مسیح کی اس یادگار کی تعمیر کے لیے زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے امیر غریب سب افراد نے عطیات کے ذریعے مالی وسائل فراہم کیے۔ پیرس کے ایک مجسمہ ساز پال لینڈوسکی نے اس کا ڈیزائن تیار کیا۔ اس کا آرٹ ڈیکو سٹائل سادگی اور مہارت کا ایک نمونہ تھا جس کی وجہ سے اس کی تعمیر ممکن ہوئی۔ لینڈوسکی کے ساتھ برازیل کے کئی ماہرین تعمیرات اور انجینئروں نے چھوٹے سائز کے پلاسٹر کے ماڈلوں سے اسے اصل شکل میں تعمیر کرنے میں معاونت کی۔ مجسمے کے بہت سے حصے چھوٹے پیمانے کے ماڈل کے ذریعے بنائے گئے۔ البتہ لینڈوسکی نے اس کا سر اور اس کے ہاتھ بڑے اور پورے پیمانے کے ساتھ خود تیار کیے تاکہ مجسمے کے مختلف حصوں کے سائز میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

اس کی بنیاد تیار کرنے میں نگران آرکیٹکٹ ہیئر لیوی کے سامنے یہ مشکل تھی کہ اس کے لیے جگہ کا ڈایا میٹر 15 میٹر یا 50 فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ چنانچہ ایک انجینئر واسیلوا کوسٹا نے ایک داخلی ڈیزائن ایسا تعمیر کیا جو کنکریٹ کے ٹکڑوں کو اپنی جگہ جمنے میں مدد دیتا تھا اور جہاں سے لینڈوسکی نے مجسمے کو اوپر اٹھانا شروع کیا۔ یہ بنیاد ایسی تھی جس نے اتنے بڑے مجسمے کے وزن کو برداشت کیا۔ جس کے کئی حصے کنکریٹ سے تیار کیے گئے تھے اور جو اتنی بلندی پر تیز ہوا کے دباؤ کو برداشت کر سکتے تھے۔

مجسمے کے کپڑوں کے اندرونی حصے میں چار ستون بنائے گئے جو کراس بریسز کے ذریعے ایک دوسرے سے جوڑے گئے تھے اور جنہوں نے پورے مجسمے کو ہوا کے دباؤ کے مقابلے میں ٹھوس اور مضبوط بنا دیا تھا۔ جہاں ضروری محسوس ہوا ان ستونوں کو بیرونی شکل کے مطابق اندر سے تراشا گیا۔ مجسمے کے بازوؤں کو کنکریٹ کا ایسا لباس پہنایا گیا جو ان کے لیے مضبوط سہارا بنا اور لوہے کے سریوں کے ذریعے ہاتھوں کے وزن کو سہارا دیا گیا۔ کراس کی بنیادی شکل میں اس مجسمے کو اتنا مضبوط بنا دیا گیا جو یہاں چلنے والی تیز ترین ہواؤں سے چار گنا تیز ہواؤں کو برداشت کر سکتا ہے۔ مجسمے کے کنکریٹ کے خول کے اوپر سبز رنگ کے سوپ سٹون کی بنی ہوئی تکون اینٹیں لگائی گئیں۔ سوپ سٹون ایک ایسا پتھر ہوتا ہے جس پر نہ تو بجلی اثر انداز ہوتی ہے جس کا نہ رنگ پھیکا پڑتا ہے اور جو نہ ٹوٹتا ہے جو اسے طوفانی بجلیوں کے حملے سے بچا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک اس کی صفائی ستھرائی کا کام ہاتھوں سے کیا جاتا تھا لیکن اب مکینیکل سپرے کے ذریعے یہ مشکل کام بھی آسان ہو گیا۔ 1990ء میں اس کی دوبارہ مرمت کی گئی جس کے بعد یہ پہلے سے کہیں زیادہ پر کشش بن گیا۔

موہنجوڈرو

(Mohenjo Daro)

دنیا کی قدیم ترین نشانی

زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب موہنجوڈرو (Mohenjo Daro) ملکی اور غیر ملکی دونوں قسم کے سیاحوں کے لیے اپنے اندر کشش رکھتا تھا تاہم مقامی انتظامیہ کی غفلت کی وجہ سے اب صورتحال مختلف ہو چکی ہے۔ یونیسکو نے اسے عالمی ورثہ قرار دیا۔ موہنجوڈرو کو سب سے پہلے بنگالی ماہر آثار قدیمہ ایم جے منجادھار نے محکمہ آثار قدیمہ کے افسر سر جان مارشل کی سربراہی میں 1923ء میں دریافت کیا تھا۔ انہوں نے دریائے سندھ کے کنارے اس پرانے شہر کے کھنڈرات دریافت کیے۔ کھدائی کا یہ سلسلہ 1940ء تک جاری رہا تھا۔ 1931ء میں ماہرین آثار قدیمہ نے اعلان کیا کہ موہنجوڈرو کی مزید دریافت یہیں روکنا ہوگی۔ جب سر جان مارشل کی ٹیم نے اپنی کھدائی ادھوری چھوڑی تو ایم جے منجادھار دوسری تاریخی جگہوں کی تلاش میں سندھ چلے گئے جہاں انہیں 1935ء میں قتل کر دیا گیا۔

موہنجوڈرو کی تاریخ کے حوالے سے ماہرین ابھی تک گومگو کا شکار ہیں۔ کچھ کے خیال میں یہ 5 ہزار سال پرانی تہذیب ہے اور کچھ ماہرین کے نزدیک 7 ہزار سال پرانی ہے۔ چند اس کی تاریخ 4 ہزار سال بتاتے ہیں۔ ان کی کھدائی سے پیشتر عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ برصغیر کی تاریخ کی ابتدا آریوں کے حملہ سے ہوئی مگر موہنجوڈرو کے کھنڈرات سے یہ

انکشاف ہوا کہ ہندوستانی تاریخ اس سے بھی پرانی ہے اور آریہ حملہ آوروں سے پیشتر ہندوستانی سرزمین کئی تہذیبوں کا عروج وزوال دکھ چکی ہے۔

اس کی داستان حیات اور تمدن اتنا پرانا ہے جتنا مصرو چین کا۔ موہنجوڈرو کے کھنڈرات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر جس تمدن کا آئینہ دار ہے وہ آریائی تمدن سے بلند معیار کا تھا۔ اس کے تاخت وتاراج ہونے کی داستان ہنوز بے نقاب نہیں ہوسکی اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ قوم جو پختہ اینٹوں کے مکانوں میں رہتی تھی جس کی صاف ستھری گلیاں حفظان صحت کے اصولوں کا پتہ دیتی ہیں۔ جس کے تجارتی جہاز عراق وغیرہ تک جایا کرتے تھے کیونکر اور کب اس صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ قرین قیاس یہ ہے کہ دریائے سندھ کے کنارے بسنے والی یہ قوم کسی غیر متوقع طوفان کی نذر ہوگئی۔

سرجان مارشل (Sir John Marshal) کی کھدائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ موہنجوڈرو کے بسنے والے مذہبی احساس رکھنے کے باوجود اگلی دنیا کی فکر میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اہل مصر اور اہل عراق کی طرح یہ لوگ مندروں اور شاہی مقبروں کی تعمیر پر اپنا سرمایہ اور وقت خرچ کرنے کے بجائے ایسی عمارات کی تعمیر پر صرف کرتے جو مشترکہ مفاد اور تمدنی اغراض کے لیے ہوتیں۔ چنانچہ ان کی بہترین تعمیرات عوامی غسل خانے یا حوض وغیرہ تھے۔ جب موہنجوڈرو کی ترقی یافتہ تہذیب کا نام ونشان صفحہ ہستی سے مٹ گیا تو متاخرین نے اپنا وقت مندروں اور عبادت گاہوں کی تعمیر کی نذر کر دیا اور کسی منصوبے کے تحت آبادی کی تعمیر کا طریقہ ہی ترک کر کے صدیوں تک ایسی گلیاں بنائیں جن میں گندے پانی کے نکاس کا بھی کوئی انتظام نہیں تھا۔

شروع میں موہنجوڈرو کو ''کافرن جوڈرو'' کے نام سے پہچانا جاتا تھا جہاں مسلمان جانا پسند نہیں کرتے۔ لیکن آج ہفتہ کے روز بہت سے لوگ سیر کے لیے آتے ہیں کیونکہ اس کا نام اب موہنجوڈرو ہے۔ مقامی افراد میں ایک روایت مشہور ہے کہ موہنجوڈرو کی سب سے اوپر والی عمارت میں بادشاہ رہا کرتا تھا۔ اس نے تمام شہریوں کو پابند کر رکھا تھا کہ اس کی ریاست میں رہنے والی عورتیں اپنی شادی سے قبل ایک رات اس کے محل میں گزاریں لیکن اس وقت جب بادشاہ نے اپنے حکم پر عملدرآمد کرتے ہوئے اپنی بہن کی شادی سے ایک روز قبل

اسے محل میں طلب کیا تو انسانیت کے اس گھناؤنے روپ پر جلال الٰہی سامنے آیا اور موہنجوڈرو تباہ ہو گیا۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب موہنجوڈرو کے باسی اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ یہ روایت برائے روایت ہے۔

موہنجوڈرو میں جب سیر کے لیے جائیں تو آپ ایک چیز سے سب سے زیادہ حیران ہوتے ہیں خاص طور پر جب آپ پرانے کھنڈرات کے درمیان سے گزرتے ہیں تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد ہزاروں سال قبل کتنی تہذیب یافتہ اور منظم زندگی گزار رہے تھے پھر کیا وجہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ہم کسی قانون اور ترتیب کے بغیر بے ڈھنگے انداز میں شہر پھیلائے جا رہے ہیں۔ جس میں سوائے گندگی اور بے ترتیبی کے کچھ نظر نہیں آتا۔

ممنوعہ شہر

(Forbidden City)

وہ عظیم شہر جہاں عام انسانوں کا داخلہ منع تھا

چین کے دارلحکومت بیجنگ کے وسط میں عظیم الشان اور قدیم عمارتوں کا ایک ایسا مجموعہ واقع ہے جسے ''ممنوعہ شہر'' (Forbidden City) کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ممنوعہ شہر دنیا میں سب سے بڑا اور سب سے بہتر طور پر محفوظ شاہی محلات اور دیگر عمارات کا ایک کمپلیکس ہے۔ اس کی 800 عمارات میں 9999 کمرے ہیں۔ قدیم چینیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک ہزار کا ہندسہ ''الوہی اکملیت'' کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی لیے یہاں کمروں کی تعداد ایک ہزار سے ایک ہندسہ کم رکھی گئی۔

پوری پانچ صدیوں تک یہ محلات اس ملک کا انتظامی مرکز رہے ہیں۔ یوآن، ہنگ اور چنگ بادشاہ اور ان کی ملکائیں و شاہی خاندان یہاں رہائش پذیر رہے ہیں۔ 1421ء میں تعمیر سے لے کر 1925ء تک جب اسے ایک میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا یہ حکومتی و انتظامی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ 24 مینگ اور چنگ حکمرانوں کی پرائیوٹ رہائش گاہ رہا۔ چین کا آخری بادشاہ آئسن گیارو پوئی (11-1908ء) یہاں رہتا رہا جب 1911ء میں چین جمہوریہ بنا۔ اس کے بعد اس بادشاہ کو 1924ء تک اسی رہائش گاہ میں نظر بند رکھا گیا۔ اس سے اگلے سال 1925ء میں ممنوعہ شہر ایک میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔

ممنوعہ شہر آج دنیا کا سب سے بڑا میوزیم ہے جو دنیا کی سب سے بڑی آبادی والی قوم کی ملکیت ہے۔ یہاں چینی آرٹ کے نادر اور قیمتی خزانے موجود ہیں۔ قدیم نوادرات، مصوری اور بادشاہوں کے استعمال میں رہنے والی قیمتی اشیاء اور اس کا تعمیراتی حسن دیکھنے کے لیے ہر سال لاکھوں لوگ یہاں آتے ہیں۔ 1987ء میں یونیسکو (Unesco) نے ممنوعہ شہر کو دنیا کے عظیم، قومی اور ثقافتی ورثوں میں شامل کرلیا۔

ممنوعہ شہر جسے اب پیلس میوزیم کہا جاتا ہے اب ممنوعہ نہیں رہا۔ اس کا نام ممنوعہ شہر اس لیے پڑا تھا کہ عام لوگوں کو خصوصی اجازت کے بغیر یہاں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ 174 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا یہ شہر اپنے اردگرد 10 میٹر اونچی دیوار یا فصیل میں محصور ہے۔ اس دیوار کے چاروں کونوں پر منفرد تعمیر کے حامل ٹاور کھڑے ہیں۔ ان ٹاوروں پر سے محلات اور بیرونی شہر دونوں کا منظر بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ممنوعہ شہر دو حصوں میں منقسم ہے۔ جنوبی حصے یا بیرونی کورٹ میں بادشاہ اپنے اعلیٰ ترین اختیارات استعمال کرتا تھا اور شمالی حصے میں اپنے شاہی خاندان کے ساتھ رہائش رکھتا تھا۔

اس کمپلیکس کی تعمیر روایتی چینی طرز کے مطابق ہوئی ہے۔ لکڑی کے فریم چھتوں کو سہارا دیتے ہیں۔ چونکہ ان عمارتوں میں لکڑی کا استعمال نہایت کثرت سے کیا گیا تھا اس لیے کئی بار یہاں آگ لگنے سے تباہی ہوئی لیکن اس کی 600 سالہ تاریخ میں ہر بار اس کی تعمیر نو اور مرمت کا کام اس کی اصل شکل وصورت کو برقرار رکھتے ہوئے کیا گیا۔ مثلاً شاہ چیانگ لانگ (1736-95ء) کے دور میں اس کی اکثر عمارتیں دوبارہ تعمیر ہوئیں اور کچھ نئی عمارتوں کا بھی اضافہ کیا گیا۔ اس کے ولی عہد جیا کنگ نے بھی 1797ء اور 1799ء کے دوران تین مرکزی پرائیوٹ ہال دوبارہ تعمیر کیے جو اس سے پہلے تباہ ہو چکے تھے۔

جدید محلات اور عمارتوں کے مقابلے میں ممنوعہ شہر شوخ اور رنگا رنگ ڈیزائنوں سے آراستہ ہے۔ سرخ دیواریں، سبز ستون، درمیان سے اونچی چھتیں جن میں چمکتے ہوئے زرد رنگ کی ٹائلیں لگائی گئیں ہیں ان پر آرائشی تصاویر کندہ کی گئی ہیں۔ چونکہ زرد رنگ شاہی خاندان کی خصوصی علامت تھا اس لیے ممنوعہ شہر میں یہ رنگ سب پر حاوی ہے۔ چھتیں چمکتی زرد ٹائلوں سے بنی ہیں۔ محل کی تزئین و آرائش بھی زرد رنگ میں کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ فرش کی

اینٹوں کو بھی ایک خاص عمل کے ذریعے زردی عطا کی گئی ہے۔ تاہم اس میں ایک بات یہ ہے کہ یہاں کی شاہی لائبریری کی چھت سیاہ ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چینیوں کے عقیدے کے مطابق سیاہ رنگ پانی کی نمائندگی کرتا ہے اور پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔

ممنوعہ شہر کی تعمیر کا آغاز 1406ء میں ہوا اور 14 سال بعد 1420ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔ تاریخ دانوں کے مطابق 10 لاکھ کاریگروں اور مزدوروں نے یہاں کام کیا تھا جن میں ایک لاکھ آرٹسٹ اور دستکار شامل تھے۔ یہاں کے لیے پتھر بیجنگ کے قریبی قصبوں سے لایا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ ہر 50 میٹر بعد سڑک کے ساتھ کنویں کھودے گئے تھے جن کا پانی سردیوں میں سڑکوں پر چھڑک کر یہاں کی برف پر پڑے چٹانی پتھروں کو پھسلا کر یہاں لایا جاتا تھا۔

❀ ❀ ❀

کھیوڑہ، ایک عجوبہ
دنیا کی سب سے بڑی نمک کی کانیں

پاکستان کا شمار دنیا کے ان خوش قسمت ممالک میں ہوتا ہے جنہیں قدرت کی بے شمار نعمتیں نصیب ہوئیں۔ انہی میں سے ایک نعمت ''کھیوڑہ'' ہے اسے عجوبہ روزگار بھی کہا جا سکتا ہے۔ کھیوڑہ میں دنیا کی سب سے بڑی نمک کی کانیں ہیں۔ یہ کانیں ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادنخان میں واقع ہیں۔ لاہور سے موٹروے کے ذریعے جائیں تو یہ سفر 260 کلومیٹر ہے۔ لاہر سے کلرکہار انٹرچینج کا راستہ طے کرتے وقت تین گھنٹے لگتے ہیں جہاں سے ایک چھوٹی سڑک آپ کو دنیا کی سب سے بڑی نمک کی کان تک پہنچانے میں معاون بنتی ہے۔ ان کانوں میں تقریباً 220 ملین ٹن نمک محفوظ ہے۔

کھیوڑہ کی لمبائی 300 کلومیٹر (186 میل)، چوڑائی 8 تا 30 کلو میٹر اور اونچائی 2200 فٹ ہے۔ کوہستان نمک کا سلسلہ دریائے جہلم کے قریب بیگنوالہ سے شروع ہو کر دریائے سندھ کے قریب کالاباغ میں ختم ہوتا ہے کوہ سکیسر میں اس ذخیرے کا ارتفاع 4990 فٹ تک ہے۔ ملک میں نمک کا دوسرا بڑا ذخیرہ کوہاٹ میں موجود ہے جو جٹہ اسماعیل خیل سے بہادر خیل ضلع کرک کے پہاڑی علاقوں کے درمیان پھیلا ہوا ہے۔ تاہم کھیوڑہ کو اس اعتبار سے ممتاز مقام حاصل ہے کہ یہاں کروڑوں سال پرانے پری کیمبرین عہد سے لے کر موجودہ دور تک حجری آثار موجود ہیں۔ اس لیے اسے ''ارضیاتی عجائب گھر'' بھی قرار دیا جاتا ہے۔

کھیوڑہ میں نمک کی دریافت 326 قبل مسیح میں اس وقت ہوئی جب دریائے جہلم کے کنارے سکندر اعظم اور راجہ پورس کی فوجوں کے مابین جنگ لڑی گئی۔ سکندر اعظم کے فوجیوں کے گھوڑے اس علاقے میں چرنے کے دوران پتھروں کو چاٹتے پائے گئے جس کے بعد فوجیوں کے ذہن میں اس کی وجہ معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب ان چٹانوں کو چکھا گیا تو یہاں پر نمک کی موجودگی کا انکشاف ہوا۔ تب سے اب تک یہاں سے نمک حاصل کیا جا رہا ہے۔ یہ دنیا میں نمک کا اہم ترین اور بڑا ذخیرہ ہے۔

1849ء میں پنجاب پر انگریزوں کے قبضہ سے قبل جنجوعہ حکمران خاندان اس علاقے سے نمک نکالتا رہا۔ تاہم انگریز عہد میں یہ انتظام انگریز حکومت نے خود سنبھال لیا۔ انگریز انتظامیہ نے نمک کی نکاسی کا کام سائنسی بنیادوں پر شروع کیا قبل ازیں پہاڑ کی سطح سے نمک اکٹھا کیا جاتا تھا۔ 1872ء میں ایک معروف برطانوی مائننگ انجینئر ڈاکٹر وارتھ نے نمک کے ذخائر تک براہ راست رسائی کے لیے پہاڑ میں پہلی بڑی کان کی کھدائی کرائی جو تا حال فعال ہے۔ اس وقت کھیوڑہ کی کانوں میں 17 منزلوں سے نمک نکالا جا رہا ہے۔ سائنسی اصولوں کے مطابق کان سے پچاس فیصد نمک نکال کر پچاس فیصد بطور ستون چھوڑ دیا جاتا ہے جو کہ کان کی مضبوطی کو قائم رکھتا ہے۔ اب حالات یہ ہیں کہ کھدائی کے بعد 17 سرنگیں یہاں پر موجود ہیں گراؤنڈ لیول جہاں پر سیاح جاتے ہیں اس چٹان کی چھٹی منزل ہے جس کے اوپر پانچ منزلیں اور اس کے نیچے گیارہ منزلیں موجود ہیں۔ گراؤنڈ لیول دراصل وہ جگہ ہے جہاں ڈاکٹر وارتھ نے کان کنی کا آغاز کیا تھا اور جہاں پر اب ''پاکستان منرل ڈویلپمنٹ کارپوریشن'' نے لوگوں کی آمدورفت کا بندوبست کر رکھا ہے۔

سرنگ کے آغاز پر بنائے جانے والے راستے کے اوپر جہاں کھیوڑہ سالٹ مائن تحریر ہے وہاں پر 17-1916ء کا سال تحریر کیا گیا ہے۔ سرنگ کے اندر جانے کے لیے الیکٹرک ٹرام استعمال کی جاتی ہے۔ اس سرنگ کے اندر جگہ جگہ بلب لگا کر روشنی کی گئی ہے۔ سرنگ کے آغاز پر ہی جہاں ٹرام پہلے سٹاپ پر رکتی ہے اسے بانو بازار لاہور کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ سرنگ کے اندر موجود کئی جگہوں کو پاکستان کے مشہور شہروں بازاروں اور عمارتوں سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں لاہور کا مال روڈ اور راولپنڈی کا چاندنی چوک شامل ہیں۔

سرنگ کے اندر بادشاہی مسجد، شملہ پہاڑی اور شیش محل بھی بنائے گئے ہیں۔ ایک اسمبلی ہال بھی سرنگ کے اندر موجود ہے جو کہ 240 فٹ اونچا 200 فٹ لمبا اور 50 فٹ چوڑا ہے۔ اس ہال میں کئی ہزار لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ سرنگ کے اندر ہی ایک ہسپتال بھی بنایا گیا جہاں پر دمے کے مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ ان کمروں کے بنانے کے لیے جو اینٹیں استعمال کی گئی ہیں وہ اسی نمک کی بنی ہوئی ہیں جن سے روشنی کا گزر ہوتا ہے تو مختلف رنگ دلکش انداز میں نظر آتے ہیں۔ مسجد جسے بادشاہی مسجد کا نام دیا گیا ہے کے میناروں میں سوراخ کر کے ان کے اندر بلب لگائے گئے ہیں جن کے جلنے سے نمک کے خوبصورت رنگ دکھائی دیتے ہیں۔

جہاں سے بھی نمک نکالا گیا ہے وہاں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا کہ پہاڑ کی مضبوطی متاثر نہ ہو۔ اس لیے ہر منزل پر کمرے کے اوپر کمرہ اور ستون کے اوپر ستون رکھا گیا۔ یہیں پر موجود ایک کمرے کے بارے میں گائیڈ حضرات کہتے ہیں کہ اگر لوگ یہاں پر پتھر پھینک کر کوئی منت مانیں تو پوری ہوتی ہے۔ ان کمروں میں موجود پانی اس قدر شفاف ہے کہ اگر ان میں پتھر پھینکا جائے تو وہ تہہ تک جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑ کے اندر شیش محل کے قریب ہی 30 فٹ لمبا ایک تنگ پل بھی موجود ہے۔ جسے ''پل صراط'' کا نام دیا گیا ہے جسے کسی ستون کے سہارے کے بغیر بنایا گیا ہے۔ پل صراط کو عبور کر کے اندر جائیں تو مینار پاکستان اور علامہ اقبالؒ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

سرنگ کے اندر تازہ ہوا کے اندر آنے کے لیے خاص انتظام ہے۔ اس کے لیے 2500 فٹ لمبا ایک راستہ بنایا گیا ہے جو پہاڑی کی چوٹی تک نکلتا ہے۔ جہاں سے تازہ ہوا کا گزر پہاڑ کے اندر آئے ہوئے سیاحوں کے لیے آکسیجن فراہم کرتا ہے۔

کریملن

(Kremlin)

روس کی ایک پراسرار عمارت

کئی عشروں تک کریملن (Kremlin) کا لفظ روسی کمیونزم کی پراسرار اور ہیبت ناک قوتوں کا مترادف رہا ہے۔ قرون وسطیٰ میں اکثر روسی شہروں کی اپنی ایک کریملن ہوتی تھی جسے ایک محفوظ قلعہ کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن کسی کریملن کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو ماسکو کی کریملن کو حاصل ہوئی۔ یہ عمارت شہر کے وسط میں دریائے ماسکو کے شمالی سرے پر واقع ہے۔ اسے سب سے پہلے 12ویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ اونچی دیواروں سے گھری ہوئی ہے اور اس کے اندر ماسکو کی تاریخی عمارات ہیں جن میں آرک اینجل اور ورجن کا گرجا شامل ہیں۔

قدیم روسی شہروں کے مقابلے میں ماسکو زیادہ قدیم نہیں ہے۔ ماسکو (Moscow) کی بنیاد 1147ء میں رکھی گئی تھی لیکن حالات نے کچھ ایسا رنگ دکھایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا روس اس کے زیرنگیں آ گیا۔ 14ویں صدی عیسوی سے لے کر 1712ء تک یہ روس کا صدر مقام تھا۔ 1571ء میں آتشزدگی سے شہر کو شدید نقصان پہنچا۔ 1739ء-1748ء اور 1753ء میں اسے پھر آگ لگا دی گئی۔ 1812ء میں اس کے شہریوں نے فرانس کے شہنشاہ نپولین بوناپارٹ کی فوج سے بچنے کے لیے شہر کو آگ لگائی۔ 1922ء میں جب سوویت یونین (USSR) کا قیام

عمل میں آیا تو اسے ملک کے دارالحکومت کی حیثیت دوبارہ مل گئی۔

کریملن ماسکو شہر کے قلب میں واقع ایک قلعے کا نام تھا جو دریا کے کنارے تقریباً تین کونہ پلاٹ پر قائم ہوا تھا۔ پہلے یہ ماسکو شہر کے اقتدار کی گدی تھی۔ بعدازاں یہ پورے روس کے اقتدار کی گدی بن گئی۔ کریملن کوئی ایک عمارت نہیں تھی بلکہ یہ حکومتی دفاتر، کیتھڈرل اور شاہی محلات پر مشتمل عمارتوں کا ایک مجموعہ تھی تاہم جب زار پیٹر اعظم نے اقتدار سنبھالا تو اس نے 1711ء میں دارالحکومت کو ماسکو سے سینٹ پیٹرز برگ منتقل کر دیا۔ کریملن درحقیقت روس کی دیومالائی پناہ گاہ ہے۔ خود اپنے وسائل اور بنیاد پر کھڑا ایسا شہر جہاں محلات، اسلحہ خانے، چرچ اور قدیم قلعہ جات ہیں۔

جب پیٹر اعظم نے دارالحکومت ماسکو سے سینٹ پیٹرز برگ منتقل کر دیا تو ماسکو اور کریملن کی اہمیت کم ہو گئی۔ 18ویں صدی عیسوی کے پہلے حصے میں روسی حکمران نئے دارالحکومت کی تعمیر میں مشغول رہے لیکن ملکہ کیتھرین دی گریٹ کے عہد میں کریملن ایک بار پھر شاہی توجہ کا مرکز بن گیا۔ کیتھرین نے اس پورے شہر کو اس کی دیواروں سمیت دوبارہ نیوکلاسیکل سٹائل میں تعمیر کرنے کے منصوبے تیار کیے۔ ملکہ نے اپنے دور کے عظیم ماہر تعمیر اور نیوکلاسیکی فن تعمیر کے ماہر متیوی کازاکوف کو اپنے عہد کی سب سے اہم عمارت یعنی کریملن میں سینٹ کا ڈیزائن بنانے کا حکم دیا۔

کازاکوف نے بڑی مہارت سے کریملن کے شمال مشرقی حصے میں ایک کافی وسیع جگہ پر ایک تین کونہ چار منزلہ عمارت بنائی۔ 19ویں صدی عیسوی میں زار نکولس اول نے گریٹ کریملن پیلس کی دوبارہ تعمیر کا قدم اٹھایا جو 1812ء میں فرانسیسی قبضے کے دوران بری طرح تباہ ہو گیا تھا۔ روس میں 1917ء کے بالشویک انقلاب کے بعد ماسکو کو دوبارہ دارالحکومت قرار دیا گیا اور اس طرح اس کی پرانی اہمیت اور عظمت بحال ہو گئی۔ سوویت حکومت کے دور میں کریملن کو دوبارہ عروج ملا اور وہ اقتدار کا مرکز بن گیا۔

صدیوں پرانی اس عمارت میں روس کے اولین حکمرانوں کے زمانے کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں زار روس دفن کیے گئے ہیں۔ شاہی محل، زار کی گھنٹی (وزن 200 ٹن) اور عجائب گھر جیسی شہرہ آفاق عمارتیں بھی کریملن کے اندر ہی ہیں۔ کریملن کی دیواروں کو

18 ستونوں اور 15 دروازوں سے سجایا گیا ہے۔

درحقیقت کریملن میں بہت سی ایسی عمارتیں، محل، قلعے، اسلحہ خانے، چرچ اور کیتھڈرل شامل ہیں جن کی تعمیراتی انفرادیت اور سیاسی وعسکری اہمیت بیان کرنے کے لیے علیحدہ صفحات درکار ہیں۔ ان میں دی آرسنل (اسلحہ خانہ) جسے پیٹر اعظم نے تعمیر کروایا تھا اور جس عمارت کو یہاں سے نپولین کی عبرتناک واپسی یا شکست کے بعد میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ اب یہ عمارت کریملن گارڈ کے ہیڈکوارٹر کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

ایک اور جدید ترین عمارت ''دی اسٹیٹ کریملن پیلس'' ہے جو 1961ء میں نکیتا خروشیف کے دور میں تعمیر ہوئی۔ جہاں کیمونسٹ پارٹی کے اجلاس منعقد ہوتے تھے۔ اس کا سب سے اہم حصہ اس کا بہت بڑا آڈیٹوریم ہے جہاں 6 ہزار افراد بیٹھ سکتے ہیں۔ اس طرح ایک دلکش نیوکلاسیکل طرز کی سینٹ بلڈنگ ہے۔ جسے ملکہ کیتھرین دی گریٹ نے ایڈوائزری کونسلوں کے اجلاس کے لیے تعمیر کرایا تھا جو فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن کیمونسٹ انقلاب کے بعد یہ عمارت لینن کے دفتر کے طور پر زیادہ مشہور ہوئی۔

یہاں کی دیگر اہم ترین تعمیرات میں کیتھڈرل سکوائر مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح مرکزی اعتبار سے روس میں ماسکو ہے اور ماسکو میں کریملن ہے اسی طرح کریملن میں کیتھڈریل سکوائر ہے۔ یہ سکوائر صدیوں تک زار روس کے اقتدار کا قلب رہا ہے۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ

(Empire State Building)

دنیا کی بلند ترین عمارتوں میں سے ایک

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو 41 سال تک دنیا کی سب سے بلند ترین عمارت ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ یہ عمارت نیویارک سٹی کے علاقہ مین ہٹن میں واقع ہے۔ مین ہٹن نیویارک سٹی کا گنجان آباد ترین علاقہ ہے جو اپنی بلند و بالا اور جدید طرز تعمیر کی شاہکار عمارتوں کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ، نیویارک سٹی اور امریکہ دونوں کی تاریخ میں مضبوطی سے پیوست ہے۔ 1930ء اور 1931ء کی کساد بازاری کے دور میں امریکہ کے دو مشہور اور امیر ترین تاجروں والٹر کرسلر (کرسلر کارپوریشن) اور جان جیکب رسکوب (جنرل موٹرز کا بانی) کے درمیان اس بات پر ٹھن گئی کہ ان میں سے کون دنیا کی بلند ترین عمارت تعمیر کرے گا۔ 1928ء اور 1930ء کے دوران کرسلر (Crysler) بلڈنگ کی تعمیر مکمل ہوئی جبکہ 17 مارچ 1930ء کو ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ عمارت کا سٹیل فریم ساڑھے چار منزلیں فی ہفتہ کی رفتار سے بلند ہونا شروع ہوا۔ تعمیر کی رفتار مزید تیز کرنے کے لیے عمارت کے کھمبے، بیم، الماریاں اور ان کے فریم فیکٹریوں میں تیار ہوتے اور فوراً ہی سائٹ پر آویزاں کر دیئے جاتے۔

سلوانیا کی سٹیل ملوں سے 310 میل دور عمارت کی جگہ پر 60 ہزار ٹن سٹیل ٹرینوں اور

ٹرکوں کے ذریعے لایا گیا۔ اس عمارت کا ڈیزائن اس کی منصوبہ بندی اور تعمیر کے دوران 16 مرتبہ تبدیل کیا گیا لیکن اس کے باوجود تین ہزار افراد نے ریکارڈ مدت یعنی صرف ایک سال اور 45 دنوں میں اس کی تعمیر مکمل کر لی۔ یہ عمارت اس وقت کی سب سے بلند عمارت کرسلر بلڈنگ سے 204 فٹ بلند تھی۔ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ میں 60 ہزار ٹن لوہا (سٹیل) دو لاکھ کیوبک فٹ انڈیانا کا لائم سٹون اور گرینائٹ، 10 ملین اینٹیں اور 730 ٹن ایلومینیم اور سٹین لیس سٹیل کا استعمال کیا گیا۔

سطح زمین سے ٹیلی ویژن مینار کی چوٹی تک اس کی بلندی 1472 فٹ ہے جبکہ عمارت کی 102 منزلیں ہیں۔ جن کی کل اونچائی 1250 فٹ ہے۔ اس کی بالائی منزل تک پہنچنے کے لیے 1860 سیڑھیاں تعمیر کی گئیں۔ ان کے علاوہ 63 رافعے بھی نصب کیے گئے۔ ان رافعوں کی مجموعی لمبائی 7 میل بنتی ہے۔

شریو ولیمپ اینڈ ہرمین نامی تعمیراتی فرم کے ماہر تعمیرات ولیم لیمپ (William Lamp) نے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کا ڈیزائن تیار کیا۔ وہ انگریزی گوتھک (Gothic) طرز کی بالکل سیدھی اور افقی عمارتوں کے سٹائل سے متاثر تھا۔ وہ پہلے سادہ پنسل سے ڈیزائن بناتا۔ سیدھی اور صاف لائنیں اسے متاثر کرتیں اور پھر وہ ان پر عمارت کا ماڈل تیار کرتا۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پتھر کے کالم اگر دھاتی کھڑکیوں سے جدا کر کے بنائے جائیں تو ان کی تعمیر آسان ہو گی۔ پتھر کا کام (Stone Work) جون 1930ء میں شروع ہوا اور نومبر میں مکمل ہو گیا۔ پتھر کے کالموں کے درمیان دھاتی بریکٹوں کے ساتھ کھڑکیاں لگائی گئیں جن کے اوپر اور نیچے کی سطحوں پر ایلومینیم کی چادریں آ گئیں۔

1931ء میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ 28 جولائی 1945ء کو امریکہ کا ایک بی 25 بمبار طیارہ نیوجرسی کے ایئر پورٹ پر جاتے ہوئے اس کی 78 ویں منزل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا لیکن حیرت انگیز طور پر عمارت کو بہت معمولی نقصان پہنچا۔ اس کا صرف ایک رافع تباہ ہوا۔ اس عمارت میں 31 لاکھ 94 ہزار 545 بجلی کے بلب لگے ہوئے ہیں۔ اس میں 50 میل لمبا ریڈی ایٹر پائپ۔ 70 میل لمبا پانی کا پائپ۔ ایک ہزار 60 میل لمبی ٹیلی فون کی تاریں اور 7450 ٹن وزنی ریفریجریشن کی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔

پوری عمارت میں 940 تجارتی اداروں اور کمپنیوں کے دفاتر ہیں جن میں کام کرنے والے افراد کی تعداد 30 ہزار سے زائد ہے۔ ان میں سے ایک ہزار افراد ایسے ہیں جو ہر وقت اس عمارت کی 6500 کھڑکیوں کی صفائی اور عمارت کے دیگر حصوں کی مرمت و پالش کے کام میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ ہر ماہ ایک سوٹن کوڑا کرکٹ عمارت سے باہر نکالا جاتا ہے۔ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ پورے 41 سال تک دنیا کی سب سے بلند ترین عمارت رہی۔ 1972ء میں یہ اعزاز ورلڈ ٹریڈ سنٹر کو حاصل ہو گیا۔

عمارت کی لابی سے لے کر 86 ویں منزل تک 1575 سیڑھیاں ہیں جن پر ہر سال تیز رفتاری سے چڑھنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ایک شخص پال کریک (Paul Creek) نے 10 منٹ 15 سیکنڈ میں یہ سیڑھیاں دوڑ کر عبور کرنے کا ریکارڈ قائم کر رکھا ہے۔ یہ ایسی مخصوص، خوبصورت اور جدید عمارت ہے جس کی لوکیشن پر اب تک سینکڑوں دستاویزی اور فیچر فلمیں فلمائی جا چکی ہیں۔ آج اگرچہ اس سے بلند چھ عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں لیکن ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو ابھی تک فنِ تعمیر کا ایک امتیازی نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔

ماؤنٹ رشمور

(Mount Rushmore)

امریکہ کی قومی زیارت گاہ

امریکہ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کے چار ابتدائی صدور نے اپنی قوم اور ملک کی تعمیر وترقی اور عروج کے لیے سمت اور راستے کا تعین کیا۔ امریکی قوم نے اپنے ان محسنوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک انوکھا طریقہ نکالا اور ساؤتھ ڈکوٹا کی سیاہ پہاڑیوں پر چار امریکی صدور جارج واشنگٹن، تھامس جیفرسن، ابراہام لنکن اور تھیوڈور روز ویلٹ کے چہرے تراش کر ''ماؤنٹ رشمور نیشنل میموریل'' کے نام سے ایک قومی زیارت گاہ بنائی۔ یہ ایک بہت بڑا منصوبہ تھا جسے 1927ء سے 1941ء کے دوران 14 سال کے عرصے میں مکمل کیا گیا۔

یہ قومی یادگار بنانے کا خیال جنوبی ڈکوٹا کے تاریخ دان رابنسن نے پیش کیا تھا جسے امریکہ میں ڈنمارک کے ایک تارک وطن مجسمہ ساز گٹزان بورگلم کی نگرانی میں مکمل کیا گیا۔ رابنسن کا خیال تھا کہ مغربی ہیرو کے طور پر منتخب سرکردہ افراد کے مجسمے یہاں تیار کیے جائیں جو تاریخ کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں آنے والے سیاحوں کے لیے بھی کشش کا باعث بنیں۔ بعد میں یہ مجسمے بنانے کے لیے چار امریکی صدور کا انتخاب کیا گیا جو اس ملک کے قیام اور اس کی امنگوں اور خوابوں کے ترجمان قرار پائے تھے۔

1925ء میں وفاقی اور ریاستی حکومتوں نے اس منصوبے کی منظوری دی اور دو سال

بعد صدر کیلون کولج نے ماؤنٹ رشمور (Rushmore) پر تیار ہونے والے ان مجسموں کو قومی زیارت گاہ کا نام دیا۔ 1745 میٹر بلند رشمور کی پہاڑی کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کہ یہ بہترین گرینائٹ کی چٹان تھی جسے عمدہ طریقے سے تراشا جا سکتا تھا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جسے مکمل ہونے میں 14 سال لگے اور جس پر 350 افراد نے کام کیا۔ اس منصوبے پر 9 لاکھ 90 ہزار ڈالر لاگت آئی۔ اس رقم کا 84 فیصد وفاقی حکومت نے فراہم کیا اور باقی رقم پرائیوٹ عطیات کے ذریعے جمع کی گئی۔

بورگلم نے فیصلہ کیا کہ ایک وقت میں ایک چہرہ تراشا جائے اور اس کے لیے اس نے اپنے سٹوڈیو میں اصل سائز سے بارہ گنا چھوٹے پلاسٹر کے ماڈل تیار کیے اور اس کے ذریعے اصل مجسمے کی بالکل درست پیمائشیں حاصل کیں۔ بورگلم نے اس کے لیے ضروری پیمانے تیار کر کے پہاڑی پر نصب کیے اور اس کے مطابق پہاڑی پر چہرے کو تراشنا شروع کر دیا۔ بورگلم نے اس تیار کردہ پیمانے کو "پوائنٹنگ مشین" کا نام دیا اور جو افراد پہاڑی پر اس تراش خراش کے لیے موزوں پوائنٹ یا نشان لگاتے تھے انہیں پوائنٹر کا نام دیا۔

پوائنٹ لگانے کے بعد پہاڑی کو پیمائشی گہرائی تک ڈرل کیا جاتا اور پہاڑی کے بیرونی حصوں کو ڈائنامائٹ کے ذریعے کھودا جاتا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کام کے لیے کس قدر تکنیکی مہارت ایک آرٹسٹ کے وژن کے ساتھ درکار تھی۔ خوش قسمتی سے بہت سے لوگ جو بورگلم کے ساتھ اس منصوبے پر کام کر رہے تھے انہیں پہلے سے مقامی مائنوں میں کام کرنے کا تجربہ تھا اگرچہ پہاڑی کی چوٹی پر اس طرح کا کام کرنے میں کہیں زیادہ مشکلات حائل تھیں۔

سب سے پہلے جارج واشنگٹن کا چہرہ مکمل کیا گیا اور 4 جولائی 1930ء کو اس کا افتتاح کر دیا گیا۔ اس کے بعد تھامس جیفرسن کا چہرہ تراشنا شروع کیا گیا۔ اسے واشنگٹن کے چہرے کے بائیں جانب جانا تھا لیکن یہاں چٹان اچھی حالت میں نہ تھی۔ اسے دوسری طرف بنایا گیا تو جہاں جیفرسن کی ناک بنتی تھی وہاں پہاڑی میں ایک شگاف ظاہر ہو گیا۔ چار سال کے کام کے بعد اسے ڈائنامائٹ سے اڑانا پڑ گیا اور چہرے کا رخ بدل کر پھر سے اسے تیار کیا گیا۔ 1936ء میں تھامس جیفرسن کا چہرہ مکمل ہوا اور اس کی افتتاحی تقریب میں صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے شرکت کی۔ اگلے سال ابراہام لنکن کا چہرہ تراشا گیا اور آخر کار 2 جولائی 1939ء کو

تھیوڈور روز ویلٹ کا چہرہ بھی مکمل کر لیا گیا۔

بورگلم نے یہاں ایک ہال آف ریکارڈز بھی ڈیزائن کیا تھا جس تک ایک 33 میٹر لمبی سرنگ کے ذریعے پہنچا جا سکتا تھا لیکن اس کے مکمل ہونے سے پہلے ہی 6 مارچ 1941ء کو بورگلم کی وفات ہو گئی۔ اس کے بعد یہ منصوبہ اس کے بیٹے لنکن نے مکمل کیا جو 15 برس کی عمر سے ہی اپنے باپ کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ پہلے وہ پوائنٹر تھا لیکن باپ کی وفات کے بعد وہ پورے منصوبے کا انچارج بن گیا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہو جانے کی وجہ سے دنیا کے اس سب سے بڑے مجسمے کی تقریب رونمائی مسلسل ملتوی ہوتی رہی اور بالآخر 4 جولائی 1991ء کو ماؤنٹ رشمور نیشنل میموریل کے بننے کے 50 سال بعد اس کی ڈیڈیکیشن تقریب منعقد کی گئی۔ چاروں صدور کے چہروں کے یہ مجسمے تھوڑی سے سر تک 18 میٹر لمبے ہیں جو 1745 میٹر بلند چوٹی پر بنائے گئے ہیں۔

بگ بن

(Big Ben London)

برطانیہ عظمیٰ کی عظمت کا نشان

عالمی شہرت رکھنے والا دنیا کا سب سے بڑا گھڑیال بگ بن (Big Ben) عظمت اور افادیت کے لحاظ سے دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے جو برطانیہ کے دارالعوام (ہاؤس آف کامن) کے گھنٹہ گھر پر نصب ہے۔ بگ بن اس گھنٹہ گھر یا گھڑی کی آواز سے منسوب ہے جو لندن والوں کو اس دور میں بھی سکون و طمانیت کا درس دیتی تھی جب نازی جرمنی کی فوجیں دوسری جنگ عظیم میں لندن کی اینٹ سے اینٹ بجا رہی تھیں اور لندن والے سرنگوں اور زیر زمین عمارتوں میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اس گھڑیال کا اس عالمی جنگ کے دوران لندن پر کی جانے والی لامتناہی بمباری کے دوران بھی کچھ نہیں بگڑ سکا تھا۔

1857ء میں اس کی گھنٹی جس کا وزن 16 ٹن اور گیارہ ہنڈرڈ ویٹ تھا تڑخ گئی تھی۔ اس وقت بگ بن کی جو گھنٹی ہے وہ شکستہ گھنٹی کو دوبارہ ڈھال کر بنائی گئی تھی اور اسے جولائی 1859ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ کے مینار میں لگایا گیا تھا۔ اس کی آواز سب سے پہلے 31 دسمبر 1914ء کو پہلی جنگ عظیم کے دوران ریڈیو سے نشر کی گئی تھی۔

اس دیو ہیکل گھڑیال کو ''بیرن آف گرم تھارپ'' ایڈمنڈ بیکٹ (Edmund Beckett) نے ڈیزائن کیا۔ یہ وائٹ چیپل (White Chappel) فاؤنڈری میں 40 ہزار پونڈ کی

لاگت سے تیار ہوا۔ موجودہ گھنٹی کا وزن ساڑھے 15 ٹن ہے۔ گھڑیال کے چہرے یا ڈائل کا قطر 23 فٹ جبکہ گھنٹے اور منٹ کی سوئیوں کی لمبائی علی الترتیب 9 فٹ اور 14 فٹ ہے۔ پورا نصف اور ربع گھنٹہ بجانے کے لیے 400 پونڈ وزنی ہتھوڑا گھنٹی پر ضرب لگاتا ہے۔

گھنٹہ گھر کے مینار کی اونچائی 320 فٹ ہے جو 40 فٹ مربع پائے پر تعمیر کیا گیا۔ لندن کے لوگ عام طور پر اسی بگ بن سے اپنی گھڑیوں کے اوقات درست کرتے ہیں۔ اسے رات بھر روشن رکھا جاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس کا مینار بھی بمباری کا نشانہ بنا اور گھنٹے کے سامنے والی بالکونی کو نقصان پہنچا۔ 1963ء میں انکشاف ہوا کہ یہ ایک طرف 15 انچ کے قریب جھک گیا ہے۔

بگ بن کی آواز بی بی سی (BBC) سے دنیا بھر میں سنی جاتی ہے۔

❀ ❀ ❀

سڈنی کا اوپیرا ہاؤس

(Opera House Sydney)

جدت اور حسن کی حامل ایک سحر انگیز عمارت

سڈنی اوپیرا ہاؤس ایک غیر معمولی عمارت ہے جو اپنے منفرد ڈیزائن اور بالکل غیر روایتی طرز تعمیر کے سبب دنیا بھر میں مشہور ہے۔ غالباً یہ عمارت آسٹریلیا کی پہچان بن چکی ہے اور سب سے زیادہ تصاویر اس عمارت کی لی جاتی ہیں۔ سڈنی اوپیرا ہاؤس اگرچہ 1973ء میں تعمیر ہونے والی جدید عمارت ہے لیکن اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آسٹریلیا کی اس طرح پہچان ہے جس طرح مصر کی پہچان اس کے اہرام اور روم کی پہچان وہاں کا قدیم کلوزیم ہے۔

اوپیرا ہاؤس کا تعلق شعبہ آرٹ یعنی ''پرفارمنگ'' آرٹ سے ہے اور اس کی تعمیر بھی نہایت آرٹسٹک اور منفرد انداز میں کی گئی ہے۔ یہاں کرسمس اور گڈ فرائیڈے کے علاوہ پورا سال۔ ہفتے میں سات دن اور دن میں 24 گھنٹے پروگرام ہوتے رہتے ہیں جن سے لاکھوں لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اوپیرا ہاؤس آسٹریلیا کے شہر سڈنی کی بندرگاہ پر بینلانگ پوائنٹ پر واقع ہے۔ اس کا ڈیزائن اور شکل ایسی ہے کہ یہ سمندر میں چلتے ہوئے جہاز کی طرح نظر آتا ہے جس کے کئی ایک بادبان کھلے ہوئے ہیں۔ بظاہر سیپیوں کی طرح نظر آنے والی اس کی چھتوں کے نیچے

دراصل بہت سے بڑے بڑے ہال اور کمرے ہیں جہاں میوزک، آرٹ، ڈرامہ وغیرہ کے پروگرام ہوتے ہیں۔ اس کا منفرد ڈیزائن ڈنمارک کے مشہور ماہر تعمیرات جارن اٹزان نے بنایا تھا۔

1950ء کی دہائی میں نیوساؤتھ ویلز حکومت نے سڈنی اوپیرا ہاؤس کی تعمیر کے لیے ایک اپیل فنڈ قائم کیا اور اس کا ڈیزائن تیار کرنے کے لیے ایک مقابلہ منعقد کرایا۔ اس مقابلے میں 38 سالہ انجینئر جارن اٹزان کا ڈیزائن منتخب کر لیا گیا۔ اس ڈیزائن پر اپنے وقت کی ممتاز انجینئرنگ کمپنی نے کئی سال مزید کام کیا اور 1961ء میں یہ مسئلہ حل کر لیا کہ اس بلڈنگ کا سب سے ممتاز فیچر یعنی بادبان اور سیپی کی طرح کی چھتیں کیسے تیار کی جائیں گی۔ کام کا آغاز ہوا تو اس پر اندازے سے زیادہ اخراجات اٹھنے لگے اور کئی ایسے مواقع آئے کہ نیوساؤتھ ویلز کی مقامی حکومت نے کام روک دینے کا مطالبہ کیا۔ 1966ء میں لاگت اور داخلی ڈیزائن پر اختلاف کے باعث حکومت نے کئی ادائیگیاں روک لیں۔ اس پر بحران بڑھ گیا اور جارن اٹزان نے اس منصوبے سے استعفیٰ دے دیا۔

اٹزان کے استعفیٰ سے سڈنی کے فن تعمیر اور آرکیٹکچر کے پیشے سے وابستہ افراد میں بے چینی پھیل گئی۔ چنانچہ معروف ماہرین کی قیادت میں مظاہرے اور ریلیاں شروع ہو گئیں۔ انہی ہنگاموں اور بحران کے دوران 19 اپریل 1966ء کو نئی تعمیراتی ٹیم نامزد کر دی گئی۔ اس وقت تک اٹزان عمارت کا بنیادی ڈھانچہ اور فریم بنانے اور کچھ داخلی ڈیزائن تیار کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے بنیادی ڈیزائن کے مطابق نئی ٹیم نے مسٹر پیٹر ہال (Peter Hall) کی سربراہی میں 1973ء میں اس کی تعمیر مکمل کی اور بالآخر 20 اکتوبر 1973ء کو ملکہ برطانیہ الزبتھ دوم نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔

تین اطراف میں پانی سے گھری اوپیرا ہاؤس دنیا کی خوبصورت ترین بندرگاہوں میں سے ایک بندرگاہ پر قائم سحر انگیز عمارت ہے۔ اس کی چھتیں بیضوی شکل میں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ وہ ایک سطح مرتفع پر بلندی سے نیچے کی طرف جھولتی نظر آتی ہیں۔ یہ اوپیرا ہاؤس دراصل تھیٹروں اور ہالوں کا ایک بڑا مجموعہ ہے اور یہ دنیا میں پرفارمنگ آرٹ کا سب سے معروف مرکز بن چکا ہے جہاں سال میں اوسطاً تین ہزار پروگرامز ہوتے ہیں۔

اوپیرا ہاؤس کی تعمیر سولہ سال میں مکمل ہوئی جس کی تاریخی تفصیل پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ حال ہی میں اس کے داخلی ڈیزائن پر مزید کام کے لیے دوبارہ اٹزان کو ذمہ داری سونپی گئی۔

وہائٹ ہاؤس

(White House)

امریکی قوم کا خزانہ

وہائٹ ہاؤس جس کے سینے میں امریکہ کے کئی راز دفن ہیں دنیا کے سب سے طاقتور صدر کی رہائش گاہ اور دفتر کی حیثیت سے امریکی قوم کے امتیازی نشان کا درجہ حاصل ہے۔ جس کی اونچی اونچی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے اقوام کی تقدیر کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ بساط سیاست کے مہروں کا الٹ پھیر عمل میں آتا ہے۔ سازشوں کے تانے بانے بنے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ''گھر'' ہے جس کے مکین بدلتے رہتے ہیں لیکن یہ ہر آنے والے کا ایسے استقبال کرتا ہے کہ وہ اسے اپنا ذاتی گھر سمجھنے لگتا ہے۔

وہائٹ ہاؤس کی تاریخ بہت منفرد اور متاثر کن ہے۔ 12 اکتوبر 1442ء کو کرسٹوفر کولمبس نے امریکہ دریافت کیا۔ اس کے ٹھیک 300 سال بعد یعنی 12 اکتوبر 1792ء کو واشنگٹن ڈی سی میں امریکہ کے قصرِ صدارت وہائٹ ہاؤس کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ امریکہ کی آزادی کے دن سے ہی تمام امریکی ریاستوں کے درمیان دارالحکومت کے مسئلہ پر رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔ ہر ریاست چاہتی تھی کہ امریکہ کا صدر مقام اس کی ریاست کا کوئی مقام ہو۔ بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ کسی نئے مقام پر دارالحکومت تعمیر کیا جائے جو کسی بھی ریاست کا علاقہ نہ ہو۔

وہائٹ ہاؤس کی تاریخ کا آغاز دسمبر 1790ء میں کانگریس کے ایک ایکٹ پر صدر

جارج واشنگٹن کے دستخطوں سے ہوا۔ فیصلہ کیا گیا کہ وفاقی دارالحکومت ڈسٹرکٹ میں دریائے پوٹومیک کے کنارے ہوگا۔ صدر واشنگٹن نے شہر کے منصوبہ ساز ''پائرے ایل اینفی نیٹ'' کے ساتھ صدارتی رہائش گاہ کے لیے جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ جگہ اب ''1600 پنسلوینیا ایونیو'' کہلاتی ہے۔

وفاقی دارالحکومت کی تعمیرات کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس کے بعد صدارتی محل کی تعمیر کے لیے ماہر تعمیرات کے درمیان مقابلہ ہوا۔ کانگریس نے ڈسٹرکٹ آف کولمبیا کے قیام کا اعلان کیا اور اس شہر کو دارالحکومت قرار دے کر پہلے صدر کے اعزاز میں واشنگٹن کا نام دیا گیا۔ ڈسٹرکٹ آف کولمبیا، ریاست میری لینڈ اور ورجینیا کے درمیان واقع ہے۔ وہائٹ ہاؤس کے لیے جگہ کا انتخاب جارج واشنگٹن کے جنگ آزادی کے دنوں کے ساتھی میجر پیٹر چارلس نامی ایک فرانسیسی انجینئر نے کیا اور عمارت کا نقشہ جیمز ہوبن نامی ایک آئرش ماہر تعمیرات نے تیار کیا جسے شاندار ڈیزائن پر گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔

اکتوبر 1790ء میں عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور ساتھ ہی تعمیر کا آغاز ہوا۔ صدارتی رہائش گاہ کی تعمیر میں صدر واشنگٹن نے ذاتی دلچسپی لی۔ مگر جب عمارت بن کر مکمل ہوئی تو ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ یوں امریکہ کے پہلے صدر کو وہائٹ ہاؤس میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ جان ایڈمز پہلا امریکی صدر تھا جس نے وہائٹ ہاؤس میں رہائش اختیار کی۔

1800ء میں جب یہ تکمیل کے آخری مراحل میں تھا تو صدر جان ایڈمز اور ان کی بیگم ابیگیل ایڈمز نے یہاں رہائش اختیار کی۔

اس وقت یہاں دیواروں پر پلاستر ہو رہا تھا اور ایک حصہ بھی مکمل نہیں تھا۔ وقت کے ساتھ عمارت میں جدتیں پیدا کی جاتی رہیں۔ 1830ء میں یہاں پائپوں کے ذریعے پانی کی سپلائی شروع ہوئی۔ 1835ء میں عمارت کو گرم رکھنے کا انتظام مکمل ہوا۔ 1891ء میں بجلی کی سپلائی شروع ہوئی۔

یہاں ایک بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب وہائٹ ہاؤس تعمیر ہوا نہ تو اس کا رنگ سفید تھا اور نہ ہی اسے وہائٹ ہاؤس کہا جاتا تھا بلکہ یہ ''پریذیڈنٹ مینشن'' کہلاتا تھا۔ جب انگریزوں نے واشنگٹن پر حملہ کیا تو انہوں نے اس عمارت کو نذر آتش کر دیا۔ آگ نے عمارت

کو بری طرح نقصان پہنچایا۔ بعدازاں جب اس کی مرمت کی گئی تو آگ کے نشانات مٹانے کے لیے پوری عمارت پر سفید رنگ کر دیا گیا اور یوں یہ عمارت وہائٹ ہاؤس کہلانے لگی۔

1800ء میں جب صدر جان ایڈمز وہائٹ ہاؤس میں مقیم ہوئے تو اس وقت تک اس کی تعمیر مکمل نہیں ہوئی تھی۔

صدر اس وقت مشرقی کمرہ استعمال کرتے تھے۔ صدر تھامس جیفرسن کی انتظامیہ کے دور میں وہائٹ ہاؤس زیادہ آرام دہ اور خوبصورت عمارت کے طور پر سامنے آیا جب انجینئر بنجمن ایچ لاٹروبے نے اسے مزید خوبصورتی بخشی۔ برطانوی افواج نے اسے 24 اگست 1814ء کو آگ لگا دی جب 1812ء کی امریکہ برطانیہ جنگ لڑی گئی۔

اس آتشزدگی کے دوران صدر جیمز میڈیسن اور ان کی بیوی ڈولی (Dolley) کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا اور 1817ء میں صدر جیمز مونرو اور ان کی بیگم ازسرنو تعمیر شدہ وہائٹ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔

1902ء میں صدر تھیوڈور روزویلٹ کے عہد میں عمارت کی پھر مرمت کی گئی۔ انہوں نے مشرقی ٹیریس تعمیر کرایا۔ صدر فرینکلن روزویلٹ نے مغربی حصے کو وسیع کرایا اور اندرونی حصے میں ایک سوئمنگ پول کا بھی اضافہ کیا گیا اور مشرقی حصے کو مزید وسیع کر دیا گیا۔

وہائٹ ہاؤس کی شاندار عمارت 175 فٹ (53 میٹر) لمبی اور 85 فٹ (26 میٹر) اونچی ہے۔ اس کی پہلی منزل صدارتی دفاتر کے لیے مخصوص ہے جبکہ دوسری اور تیسری منزل صدر اور ان کے اہلِ خانہ کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

رہائشی منازل پر 16 بیڈ رومز ہیں۔ ان کے علاوہ لونگ روم، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، سٹڈی رومز، مہمانوں کے لیے ہالز اور ہر طرح کی سہولتیں موجود ہیں۔

آئرش طرز کی اس عمارت میں تفریح کے لیے انڈور سینما اور عجائب گھر بھی ہے۔ عجائب گھر میں ہر روز 6 ہزار سیاح آتے ہیں۔ وہائٹ ہاؤس کا نظام فائیو سٹار لگژری ہوٹل کی طرز پر چلایا جاتا ہے۔ وہائٹ ہاؤس کسی سربراہ حکومت کی واحد نجی رہائش گاہ ہے جو عوام کے لیے بھی کھلی ہے اور وہ منگل سے ہفتے تک بغیر کسی ٹکٹ کے یہاں آ سکتے ہیں۔

❀ ❀ ❀

لینن گراڈ

(Leningrad)

روس کا اہم ترین شہر

لینن گراڈ روس کا ایک اہم شہر ہے جو خلیج فن لینڈ پر دریائے نیوا کے دہانے پر واقع ہے۔ اس کا پرانا نام سینٹ پیٹرز برگ تھا کیونکہ اس کا سنگ بنیاد 1703ء میں زار روس پیٹر اعظم نے رکھا۔ اس شہر کا شمار دنیا کے حسین ترین شہروں میں ہوتا ہے۔

17 ویں صدی عیسوی میں روس کا شمار یورپ کی چند پسماندہ اقوام میں ہوتا تھا لیکن اس وقت تک یہاں مغربی اثرات آنا شروع ہو چکے تھے جب 1689ء میں پیٹر اعظم روس کا حکمران بنا۔ وہ پہلا روسی حکمران تھا جس نے غیر ممالک کا دورہ کیا۔ 1697ء میں انگلینڈ، فرانس اور ہالینڈ کا دورہ کر کے واپسی پر اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ روس کو جدید ممالک کی صف میں کھڑا کرے گا۔ اس کے پروگرام کا ایک اہم حصہ ایک بہت بڑی بندرگاہ بنا کر روسی بحریہ کو مضبوط تر بنانا تھا اور اس کے ساتھ ایک نیا شہر بھی بسانے کا منصوبہ تھا۔

بحریہ کی ضروریات کے نقطہ نظر سے خلیج فن لینڈ میں نیوا ڈیلٹا کا دلدلی علاقہ اس شہر کی تعمیر کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس شہر کو دارالحکومت بنانے کا فیصلہ 1712ء میں کیا گیا۔ یہ شہر ادب وفنون کا بہت بڑا مرکز بنا اور اس پر مغربی تہذیب کا گہرا اثر پڑا۔ اس شہر کے لیے جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد زار پیٹر کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کس قسم کا شہر تعمیر کروایا جائے۔ وہ چاہتا تھا

کہ ایسا شہر تعمیر ہو جو روس کے کسی بھی شہر سے مشابہ نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے اس نے یورپ میں اٹلی اور جرمنی کے بہترین ماہرین تعمیرات کو روس بلوایا۔ اگر چہ پیٹرز برگ کی تعمیر میں روس کے ماہرین تعمیرات کا بہت اہم حصہ ہے لیکن اس شہر کی عمارتوں کے ڈیزائن اور انداز میں غیر ملکی ماہرین تعمیرات کی سوچ اور انداز جھلکتا ہے۔

1725ء میں پیٹر اعظم کی موت کے بعد بھی اس شہر کی شاندار عمارات کی تعمیر جاری رہی۔ ان عمارتوں میں قلعہ پیٹر پال، مین شیکو پیلس، سمر پیلس اور ونٹر پیلس شامل ہیں۔ سینٹ پیٹرز برگ اہل روس اور بہت سے غیر ملکیوں کی کوششوں سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ تاجروں اور مختلف ماہر فنون کو مجبور کیا گیا کہ وہ یہاں اپنے گھر تعمیر کریں۔ چونکہ اس علاقہ میں پتھر نہیں تھے اس لیے شہر میں داخل ہونے والی ہر سواری یا گاڑی میں تین پتھر۔ ہر کشتی میں میں دس پتھر اور ہر بحری جہاز میں کم از کم 30 پتھر لدے ہوتے تھے۔

سینٹ پیٹرز برگ میں اتنے تعمیراتی سٹائل نظر آتے ہیں کہ یہ شہر فن تعمیر کی سمفنی (Symphony) نظر آتا ہے۔ دو سٹائل خاص طور پر چھائے ہوئے ہیں۔ سینٹ پیٹرز برگ کی شاندار عمارتوں کے ساتھ ساتھ اس شہر کا کشادہ لے آؤٹ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کی ایک سب سے بڑی سڑک سینٹ پیٹرز برگ کے درمیان سے گزرتی ہے۔ یہ سڑک دریائے نیوا کے کنارے واقع ایڈ مائی رہائی سے شروع ہوتی ہے اور مشرق کی جانب الیگزنڈر نیوسکائی ایبے پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس سڑک کا اپنا ایک منفرد حسن ہے۔ اس کے اطراف میں باوقار اور شاندار عمارتیں بنی ہیں جن میں سڑوگونوف اور ارچ کوف محلات، شودالوف اسٹیٹ اور کرزن کیتھڈرل شامل ہیں۔

جس عمارت میں سینٹ پیٹرز برگ کی مکمل تاریخ جمع ہے وہ یہاں کا سرمائی محل ہے جسے 1711ء میں بنایا گیا تھا۔ اس محل میں پانچ مرتبہ تبدیلیاں کی گئیں۔ آخری چھٹا سرمائی محل ریسٹ ایلی نے ڈیزائن کیا جو 1760ء میں مکمل ہوا۔ اس محل کا تناسب اتنا شاندار ہے کہ اس کی چاروں سمتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس عمارت کے سامنے کے حصے میں ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے ستون زمین سے لے کر چھت تک چلے گئے ہیں۔ اس کے اوپر کانسی کے بنے بڑے بڑے ایسے مجسمے لگے ہیں جو اصل میں خاکدان ہیں۔ قدیم زمانے کے لوگ ان

خاکدانوں میں مردے کی راکھ رکھا کرتے تھے۔ اس محل کی 3 منزلوں میں 1500 کمرے ہیں۔ سب سے نچلی منزل میں محل کے ملازمین رہتے تھے۔ دوسری منزل پر سرکاری دفاتر تھے۔ تیسری منزل پر بیڈ رومز اور درباریوں کے رہنے کی جگہ تھی۔ 1837ء میں اس سرمائی (Winter) محل کو ایک آگ کی وجہ سے کافی نقصان پہنچا لیکن اسے جلد ہی ماہر تعمیرات وہی آئی اسکاسوف نے دوبارہ درست کر دیا۔

1917ء میں جب روس میں بالشویک انقلاب آیا تو اسی سرمائی محل میں زار روس نکولس دوم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب جرمن افواج نے لینن گراڈ کا 900 دن تک محاصرہ کیے رکھا اس وقت بھی اس محل کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ اس کے بعد شہر کی دیگر عمارتوں کی طرح اس عمارت کی مرمت بھی بڑی احتیاط اور توجہ سے کی گئی۔ آج کل اس عمارت کا ایک بہت بڑا حصہ آرٹ کے نادر نمونوں کو جمع کرنے کے لیے وقف ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں سینٹ پیٹرز برگ کا نام تبدیل کر کے پیٹروگراڈ رکھ دیا گیا۔ 1845ء کے انقلاب سے لے کر 1917ء کے بالشویکی انقلاب تک یہ شہر بڑی انقلابی تحریکوں کا مرکز رہا۔ 1918ء تک یہ شہر روس کا دارلحکومت تھا۔ 1924ء میں روسی انقلاب کے قائد لینن کے انتقال کے بعد اس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اس کا نام تبدیل کر کے لینن گراڈ رکھ دیا گیا۔ لینن گراڈ ایک اچھی بندرگاہ بھی ہے مگر سردیوں میں پانی جم جانے کی وجہ سے ناقابل استعمال ہے۔

❁ ❁ ❁

پیٹرا

(Petra Jordan)

دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک

1812ء میں سوئٹزر لینڈ کا ایک مہم جو جان برک ہارڈ (John Brickhard) ایک عرب سوداگر کا بھیس بدل کر اردن کے قدیم شہر میں سے گزرا۔ جب وہ قدیم آدم کی پہاڑیوں کے نزدیک پہنچا تو اس نے ان کہانیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایک حقیقت کی شکل میں دیکھا جو اُس نے بدوؤں سے زمین میں دفن ہو جانے والے شہر کے متعلق سنی تھیں۔

برک ہارڈ اس جگہ جانے کی خواہش کا کھلم کھلا اظہار نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ اس جگہ سے وابستہ قدیم داستانوں سے واقف تھا اس لیے اس نے اس بنا پر اجازت حاصل کی کہ وہ ایرون کے مندر میں ایک قربانی دینا چاہتا ہے۔ پہاڑوں کے ایک تنگ درے سے گزر کر ''برک ہارڈ'' مندروں اور گنبدوں کے اس خوبصورت شہر میں پہنچا جو چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ اس شہر کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا اور یوں اس نے پیٹرا (Petra) کا قدیم شہر دوبارہ دریافت کیا جس کے اصل مقام کو مغربی دنیا کے لوگ ایک ہزار سال قبل بھلا چکے تھے۔

پیٹرا جنوبی اردن کے چٹانی علاقوں میں واقع ہے۔ یہ شہر ایک آؤٹ ڈور میوزیم کی مانند لگتا ہے۔ قسطنطنیہ، مصری، رومی اور یونانی طرزِ تعمیر کا امتزاج یہ شہر دیگر قدیم شہروں سے بڑا

منفرد نظر آتا ہے۔ اس کی بنیاد نباتینز نے رکھی جو کہ عرب تھے۔ دیگر قدیم شہروں کی طرح پیٹرا کی معیشت کا دارومدار بھی تجارت پر تھا۔ قدیم نباتینز نے تقریباً 300 قبل مسیح میں اس شہر کو چٹانوں کو تراش کر بنایا۔ اس وقت پیٹرا پہاڑ کی نوکیلی چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اصل میں یہ شہر مشرق وسطیٰ کے قدیم راستوں کے سنگم پر واقع ہے۔ اونچے پہاڑوں میں سے گزر کر یہ ہی وہ راستہ تھا جہاں سے گزر کر عربوں کے تجارتی قافلے بحیرہ روم اور بحیرہ اسود پہنچا کرتے تھے اور ان عربوں (نباتینز) کی کمائی کا اصل ذریعہ تجارتی راستوں کی حفاظت سے حاصل ہونے والا ٹول ٹیکس تھا۔

پیٹرا کی ایک اور اہمیت یہ تھی کہ یہاں پانی کثیر تعداد میں تھا جو ان قافلوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ جلد ہی یہ شہر ایک عظیم تجارتی مرکز اور نباتی سلطنت کا دارالحکومت بن گیا۔ یہ سلطنت 106ء تک قائم رہی پھر رومیوں نے پیٹرا کو فتح کرلیا۔ رومی سلطنت کے ایک صوبے کی حیثیت سے پیٹرا کی اہمیت کچھ عرصہ قائم رہی۔ اس لیے اس کے طرز تعمیر پر رومیوں کا بہت گہرا اثر نظر آتا ہے۔ جب رومیوں نے دیگر تجارتی راستوں کو ترقی دی تو اس شہر کی اہمیت آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں یہ شہر بالکل ویران ہو گیا۔ آخرکار 8ویں صدی عیسوی کے وسط میں ایک خوفناک زلزلے کے نتیجے میں یہ عظیم الشان شہر مکمل طور پر زمین کے نیچے دفن ہو گیا۔

اب اس شہر کے جو کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے مطابق اس میں داخلے کے لیے ایک تنگ گھاٹی سے گزرنا پڑتا ہے جو کہ 5 میٹر چوڑی اور 200 میٹر بلند ہے۔ ان کھنڈرات میں وہ عمارتیں ہیں جو شہر کے مرکز میں واقع تھیں۔ بہت سے مندر اور گنبد جو پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے اب تک اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ''کیشنی'' ہے جو پیٹرا تک جانے والے تنگ درے ''سق'' کے اندرونی سرے کی مخالف سمت میں بنا ہے۔

پہلی صدی قبل مسیح میں بننے والی یہ عمارت کیشنی کی دو منزلیں ہیں۔ نچلی منزل کی طرز تعمیر یونانی مندروں جیسی ہے جس کے اوپر کے حصے میں مثلث نما ستون نظر آتے ہیں۔ چٹانوں کو کھود کر اس یادگار پر دلکش نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ کیشنی کی مرکزی عبادت گاہ

202 مربع میٹر (40 مربع فٹ) رقبہ پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ دو چھوٹے کمرے ہیں جو راہبوں کے رہنے کے لیے مخصوص تھے۔

کیشنی ایک مندر ہے اور اس کا ایک گنبد بھی ہے۔ اس لفظ کا عربی مفہوم ''خزانہ'' ہے۔ مقامی بدوؤں کا خیال تھا کہ اوپر کے مرکزی ہال میں جو خاکدان بنا ہوا ہے اس میں ایک مصری فرعون کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ کئی بدوؤں نے خزانہ حاصل کرنے کے لیے اس خاکدان پر گولیاں چلائیں تا کہ اسے توڑا جا سکے۔ پیٹرا میں داخلے والی تنگ گھاٹی سے آگے کئی ستونوں والے مقبرے ہیں۔ آگے کی طرف جائیں تو ایک تھیٹر آتا ہے جو چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر پہلی صدی قبل مسیح میں ہوئی۔

تھیٹر سے آگے کئی مقبرے ہیں۔ یہاں ایک تنگ پہاڑی راستے سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹہ کی پیدل مسافت پر قدیم عبادت گاہ ہے جو رومیوں کے عہد میں بنائی گئی تھی۔ اس سے بھی اوپر قربان گاہ ہے جہاں کئی درزیں بنی ہیں جن کے ذریعے قربانی کے جانوروں کا خون نیچے گرایا جاتا تھا۔ پیٹرا سے جنوب کی طرف وسیع و عریض صحرائی لینڈ سکیپ ہے جسے وادی روم کہا جاتا تھا۔ یہاں بدو قبائل آباد ہیں جو آنے والے مہمانوں کی قہوے سے تواضع کرتے ہیں۔

صحرائے اعظم

(Sahara Desert)

دنیا کا سب سے بڑا ریگستان

قدرت نے کائنات کے بعض خطوں میں کچھ ایسے سربستہ راز پوشیدہ کر رکھے ہیں جو انسانی نظر سے باہر ہیں وہ اپنی تمام تر ترقی کے باوجود ان سے بے خبر رہا ہے۔ ان میں ایک صحارا کا لق و دق ریگستان ہے۔ دنیا کے اس سب سے بڑے صحرا کا زیادہ تر حصہ شمالی افریقہ کے علاقوں پر مشتمل ہے جو تقریباً 5149 کلومیٹر ہے۔ یہ علاقہ مصر سے سوڈان تک جبکہ مغرب میں ماریطانیہ اور سپین کی سرحدوں تک چلا جاتا ہے۔ درمیان میں کئی اور ممالک آتے ہیں جیسے الجزائر، چاڈ و نائیجر وغیرہ۔

صحرائے صحارا کا رقبہ 86 لاکھ مربع کلومیٹر (33 لاکھ 20 ہزار مربع میل) ہے۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا رقبہ پورے ریاستہائے متحدہ امریکہ کے برابر ہے۔ ایک طرف اس کی سرحد بحیرہ روم سے ملتی ہے۔ شمال میں یہ صحرا اطلس کی پہاڑیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں اس کی سرحد بحرالکاہل تک ہے اور مشرق میں یہ بحیرہ احمر تک جاتا ہے۔ صحرائے صحارا کی سرحدی پٹی 3200 میل (5150 کلومیٹر) لمبی ہے۔ شمال اور جنوب میں اس صحرا کی کوئی واضح سرحدی لائن نہیں ہے لیکن یہاں 62 میل چوڑا ایک ایسا چٹیل میدان ہے جو آہستہ آہستہ صحرا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جنوب میں صحارا اور سوانا کے سرسبز میدان کے

درمیان سوڈان کا وہ علاقہ ہے جو ''ساحل'' کہلاتا ہے۔

اس بے آب و گیاہ بنجر زمین پر نہ صرف خشک پہاڑ ہیں بلکہ اس کی سنہری ریت پر موجود چند نخلستان یوں دیکھتے ہیں جیسے زیورات پر سبز پتھر جڑے ہوں۔ صحرائے صحارا مختلف ہموار میدانوں پر مشتمل ہے جو سطح سمندر سے 590 سے 1181 فٹ تک بلند ہیں۔ اس ریگستان میں ایسے میدان اور نشیب بھی ہیں جو سطح سمندر سے بہت نیچے ہیں۔ سب سے بڑا نشیبی میدان ''قطارا'' ہے جو سطح سمندر سے 436 فٹ نیچے ہے۔ مجموعی طور پر صحارا باقی براعظم افریقہ سے نشیب میں واقع ہے۔

اس ریگستان میں پہاڑوں کے دو سلسلے ہیں۔ ایک 11,204 فٹ بلند اور دوسرا 9852 فٹ بلند ہے۔ صحارا عربی لفظ ''صحرا'' کی جمع ہے جس کے معنی ''ریگستان'' کے ہیں لیکن اس صحرا کے مختلف حصوں کے اپنے علیحدہ علیحدہ نام ہیں۔ مثلاً جنوب مغربی الجزائر اور شمال مشرقی مالی میں یہ ''تینزرنٹ'' کہلاتا ہے۔ صحارا کا مشرقی حصہ ''تیزی'' یعنی خوفناک میدان کہلاتا ہے۔ یہ صحرا افریقہ کے دس ملکوں میں منقسم ہے۔ شمال میں مراکش، الجزائر، تیونس، لیبیا اور مصر ہیں۔ جنوب میں ماریطانیہ، مالی، نائیجر، چاڈ اور سوڈان ہیں۔ اس صحرا کا ایک 11 واں علاقہ بھی ہے جس کے بارے میں ماریطانیہ اور مراکش میں تنازعہ ہے۔ یہ علاقہ ''مغربی صحارا'' ہے۔

اکثر لوگ صحارا کو ریت کا ایک نہ ختم ہونے والا سمندر سمجھتے ہیں جس میں اڑتی ہوائیں اس ریت کو ٹیلوں میں تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ درحقیقت ہوا جس انداز میں ریت کو ٹیلوں میں تبدیل کرتی ہے۔ اس سے یہ ایک حسین منظر بن جاتا ہے۔ یہ ٹیلے 755 فٹ کی بلندی تک ہوتے ہیں۔ ان کی اشکال بھی مختلف ہوتی ہیں۔ زیادہ تر علاقے کا موسم گرم اور خشک ہے جہاں ریت کے ٹیلے آگ کی مانند تپتے رہتے ہیں۔ خاص کر باہر سے داخل ہونے والی نسبتاً ٹھنڈی ہوائیں، خشک اور مربوط ماحول کے باعث گرم جھکڑوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ دن کے وقت یہاں درجہ حرارت 183 فارن ہائیٹ ہو جاتا ہے۔

صحارا میں سب سے گرم مہینے جولائی اور اگست کے ہوتے ہیں جبکہ جنوبی حصے میں مئی اور جون سب سے زیادہ گرم ہوتے ہیں۔ ایک طرف دن کے وقت موسم اتنا گرم ہوتا ہے

تو دوسری طرف راتیں انتہائی ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ رات کو درجہ حرارت غیر معمولی طور پر گر جاتا ہے اور شمال کے بلند علاقوں میں کہرا اور برف تک جم جاتی ہے۔ تیز دھوپ کے علاوہ صحارا کے موسم کی ایک اہم خصوصیت وہ تیز ہوا ہے جو روز چلتی ہے اور اپنے ساتھ ریت اور مٹی لے کر آتی ہے۔ اس ریگستان میں ایسے مقامات بھی ہیں جو سال میں 70 دن تک طوفان کی زد میں رہتے ہیں۔

یہاں موجود پہاڑوں اور دریاؤں کے باعث کچھ علاقوں پر بادل بھی برستے ہیں جو بادل نخواستہ بارش کے چند قطرے گراتے ضرور ہیں لیکن ہوا میں موجود نمی اور سخت گرمی انہیں زمین تک پہنچنے سے قبل ہی خشک کر دیتی ہے۔ جبکہ ایک بڑے علاقے پر بادل نہ ہونے کی وجہ سے سورج کی تیز شعاعیں آسمان سے ریتلی زمین پر براہ راست پڑتی ہیں تو تپش کو مزید بڑھا دیتی ہیں۔ اس کے برعکس جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صحرا کی ریت بھی ٹھنڈی ہوتی چلی جاتی ہے۔

صحارا میں سب سے زیادہ درجہ حرارت کیبلی (Kibili) کے علاقے میں ہوتا ہے جو عام طور پر 55 ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ زیادہ درجہ حرارت کی وجہ سے اس حصے میں داخل ہونے والی ہوائیں (Sirocco) ہیں جو یہاں کے مرطوب اور خشک و گرم موسم کے ذریعے ہوا کا مخصوص دباؤ بناتی ہیں۔ یہ ہوائیں گرم ریت کا طوفان (Tornado) کا باعث بنتی ہیں۔ صحارا کے کچھ علاقے میں ریت کے طوفان باقاعدگی سے آتے ہیں۔ ہوا کے تیز جھکڑوں کے باعث ریت کے ٹیلے کچھ دیر بعد اپنا مقام تبدیل کرتے رہتے ہیں جہاں مسافروں کے بھٹکنے کے بہت زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں شمالی افریقہ میں صحارا ریگستان کا یہ علاقہ فوجی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل تھا جہاں دشمن کی فوج کو بآسانی دھوکہ دیا جاتا تھا جسے بہت شہرت ملی۔

صحارا بالکل چٹیل بھی نہیں ہے اس میں کہیں کہیں پودے بھی اُگتے ہیں۔ ایسے پودے جو صحرا میں پرورش پا سکتے ہیں اور جنہیں زیادہ پانی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صحارا کے شمالی علاقے میں کھجور کے درخت ہوتے ہیں جبکہ جنوبی حصہ میں کیکر اور مختلف قسم کی جھاڑیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں عام طور پر ایسے کیڑے ہوتے ہیں جو زمین کھود کر اپنا گھر بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے جانوروں میں ایک خاص قسم کا کینگرو اور ہرن بھی پائے جاتے ہیں۔

صحارا کا علاقہ صدیوں سے قافلوں کے لیے گزرگاہ بنا ہوا ہے۔ یہ علاقہ ہمیشہ سے ہی ایک ریگستان نہیں تھا۔ اس کے موسم میں مختلف ادوار میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ اس کا موجودہ موسم 3 ہزار قبل مسیح سے شروع ہوا۔ ابتداء میں صحرائے صحارا اس سے کہیں طویل علاقہ میں پھیلا ہوا تھا جتنا کہ آج ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کو یہاں ایسے آثار ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے یہاں کبھی انسان کے علاوہ بڑے جانور، بھینس، ہاتھی وغیرہ بھی پائے جاتے تھے۔

بے آب و گیاہ اس صحرا میں یوں تو زندگی کا تصور خام خیالی محسوس ہوتا ہے لیکن یہاں صدیوں سے خانہ بدوش آباد ہیں۔ یہاں چار قسم کے لوگ آباد ہیں۔ ان میں زیادہ تر ''بربر'' نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ شمالی علاقہ میں عرب بربروں کی تعداد زیادہ ہے۔ مغرب میں مورز (Moors) نسل کے افراد رہتے ہیں۔ جنوبی وسطی پہاڑیوں کے نزدیک توریگ (Tuareg) آباد ہیں۔ جبکہ تبتی پہاڑیوں اور جنوبی صحارا میں ٹیڈا کی تعداد زیادہ ہے۔ ان لوگوں نے یہاں کے موسم اور حالات سے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔

زمانہ قدیم میں صحارا کے رہنے والے اونٹ، بھیڑ بکریاں پالتے اور اُن سے ہی اپنی گزر بسر کیا کرتے تھے۔ طاقتور قبیلے ہی صحرا پر حکمرانی کرتے۔ نخلستانوں کا تمام انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتے اور صحرا سے گزرنے والے قافلوں سے تمام کاروبار کرتے۔ خاص طور پر ''توریگ'' اپنی بہادری، شجاعت اور جنگجویانہ خوبیوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ صدیوں تک صحارا کا راستہ ہی ایسا ذریعہ تھا جس سے گزر کر افریقہ کے باشندے افریقہ کی شمالی بندرگاہوں تک پہنچتے اور اپنے ساتھ سونا، ہاتھی دانت اور نمک لاتے اور اس کی تجارت کرتے تھے۔

❀ ❀ ❀

دریائے نیل

(Nile River)

دنیا کا سب سے بڑا اور لمبا دریا

دنیا میں قدیم تہذیبوں کے آثار زیادہ تر مختلف دریاؤں کے کنارے پائے گئے ہیں۔ جنوب مغربی ایشیا میں دجلہ اور فرات۔ چین میں دریائے ینگیز ئے زی اور برصغیر پاک و ہند میں دریائے سندھ کے کنارے قدیم تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں۔ گویا دریا اور تہذیب کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اسی طرح دریائے نیل اور مصر کا بھی آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔

دریائے نیل دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اس دریا کا منبع برونڈی (Burundi) میں دریائے کاگیرا کی شاخ ''لوی رونزو'' (Lavironzo) ہے۔ یہ دریا مشرقی وسطی افریقہ کے آخری سرے پر بحیرہ روم سے نکلتا ہوا شمال کی جانب 6671 کلومیٹر (4145 میل) تک بہتا ہے۔ یہ جنوب مغرب کی طرف بہتا ہوا جھیل وکٹوریہ میں جا شامل ہوتا ہے اور آخرکار بحیرہ روم میں جا گرتا ہے۔ یہ 11 لاکھ مربع میل رقبے کو سیراب کرتا ہے۔

دریائے کاگیرا برونڈی کی پہاڑیوں سے بہتا ہوا روانڈا اور تنزانیہ کو عبور کرتا ہے اور پھر وسیع و گہری جھیل وکٹوریہ میں گر جاتا ہے اور اس جگہ سے دریائے نیل صحیح معنوں میں برآمد

ہوتا ہے۔

یوگنڈا کا شہر ''جنجہ'' (Jinja) وہ مقام ہے جہاں دریائے نیل جھیل وکٹوریہ سے نکلتا ہے۔اس جگہ دریا 400 میٹر (1312 فٹ) چوڑا ہے۔

جیسے جیسے یہ دریا جھیل بوگا اور جھیل موبوتو (سابقہ البرٹ) سے بہتا ہوا سوڈان کے میدانوں تک پہنچتا ہے تو اس سارے راستے میں مختلف مقامات پر اس دریا کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ یہاں سے دریا کے بہاؤ میں کمی آجاتی ہے اور وہ مختلف شاخوں اور نہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

جھیل وکٹوریہ کے بعد دریائے نیل کی گزرگاہ کا اکثر حصہ پہاڑی ہے اس لیے جھیل موبوتو تک پہنچتے پہنچتے راستے میں کئی آبشاریں بن جاتی ہیں۔جھیل موبوتو کے بعد کی گزرگاہ میدانی ہے۔

یہاں دریا پھیل جاتا ہے اور کئی جھیلیں بناتا ہے۔جھیل نو کے قریب یہ بحرالغزل سے مل جاتا ہے اور یہاں سے لے کر سوڈان کے دارالحکومت خرطوم تک اسے ''سفید نیل'' (نیل الابیض) کے نام سے پکارتے ہیں۔

خرطوم کے مقام پر سفید نیل ایتھوپیا کے جنوب مشرقی پہاڑوں سے آنے والے معاون دریا نیلا نیل (نیل ازرق (Blue) میں ملتا ہے جو شمال مغربی ایتھوپیا کی جھیل تانا کی طرف بڑھتا ہے اور یہاں پر دریائے نیل 5905 فٹ کی بلندی پر 1368 کلومیٹر (850 میل) تک بہتا ہے۔

خرطوم سے 200 میل شمال سے کالا نیل (نیل اسود) بھی اس سے آملتا ہے۔وادی حیفہ سے یہ دریا مصر میں داخل ہوتا ہے۔ یہ دونوں دریا مل کر دریائے نیل کی طغیانی کا باعث بنتے ہیں۔

دریائے اتبارا (کالا نیل) میں شامل ہونے کے بعد دریائے نیل نیوبن کے ریگستان میں 2700 کلومیٹر (1678 میل) تک بہتا ہے اور مصر کی سرحد تک پہنچتے ہوئے انگریزی کے حرف (S) کی شکل کا ایک خم بناتا ہے۔

جنوبی مصر میں خرطوم سے اسوان تک دریائے نیل کا پاٹ تنگ ہو جاتا ہے۔

نیل میں تقریباً ایک ہزار میل تک جہاز رانی ہوسکتی ہے۔ نیل کا ڈیلٹا تقریباً ایک سو میل چوڑا ہے جو بہت زرخیز ہے۔ مصر اور ملحقہ علاقوں کی پیداوار اور خوشحال کا دارومدار نیل پر ہے۔

روس کی مدد سے مصر نے اسوان ڈیم تعمیر کیا۔ یہ ڈیم 111 میٹر (364 فٹ) اونچا اور دو میل چوڑا ہے۔ اس کے پیچھے مشہور جھیل ناصر ہے جو انسانی ہاتھوں سے بنائی گئی دنیا کی سب سے لمبی جھیل ہے۔

اس کی لمبائی 480 کلومیٹر (298 میل) ہے جو شمالی سوڈان تک جاتی ہے۔ جھیل ناصر کیوجہ سے بہت سے آثار قدیمہ مستقل طور سے زیرِ آب آ گئے لیکن ان میں سے بعض جن میں مشہور مندر ابوسمبل بھی شامل ہے جھیل کی سطح سے اونچا کر دیا گیا۔

ہر سال اس دریا میں آنے والی طغیانی اپنے ساتھ سرخی مائل سرمئی مٹی کی ایک ایسی تہہ لاتی ہے جو فصلوں کے لیے بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ طغیانی کا پانی اترتا ہے تو دور دور کا علاقہ زرخیز ہو جاتا ہے۔

اسوان کے بعد یہ دریا وادی نیل تک پہنچتا ہے جہاں اس کے وہ میدان جو طغیانی کی مٹی سے زرخیز ہیں واقع ہیں۔ یہ میدان 8 سے 10 میل تک چوڑے ہیں۔ مصر سے آگے دریائے نیل ایک مثلث نما نشیبی میدان میں داخل ہوتا ہے اور یہیں پر نیل کا ڈیلٹا بنتا ہے۔ زمانہ قدیم میں نیل کے ڈیلٹا کی سات شاخیں تھیں اور اب اس کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ مغربی شاخ اروسٹا جبکہ مشرقی شاخ ڈامیٹا کہلاتی ہے۔

زمانہ قدیم میں لوگ سوال کرتے تھے کہ نیل کا منبع کہاں ہے؟ اس کے بارے میں بڑی پراسرار کہانیاں مشہور تھیں۔ دوسری صدی عیسوی میں لوگوں کا خیال تھا کہ یہ دو جڑواں جھیلیں ہیں جو چاند کی پہاڑیوں سے نکل کر آتی ہیں۔ آخر 19 ویں صدی میں اس حقیقت کو تلاش کر لیا گیا۔

جان ہینگ اسپاک نے 1858ء میں جھیل وکٹوریہ دریافت کی اور 1861ء میں اُسے نیل کی مناسبت سے شناخت کیا۔ سیموئیل بیکر نے جھیل موبوتو دریافت کی۔ ہنری مورٹن سٹینلے نے اپنے دو سفروں کے دوران جھیل ایڈورڈ اور ریوون راوی کے پہاڑ دریافت کیے۔

یکم اپریل 2006ء کو برطانوی و نیوزی لینڈ کے ماہرین نے دریائے نیل کا منبع تلاش کرلیا۔ مصر سے سفر شروع کرنے والے دونوں ممالک کے ماہرین نے 80 دن کی جستجو کے بعد دریائے نیل کا منبع روانڈا میں تلاش کرلیا۔ تین ماہرین نے 80 دن کے طویل سفر کا آغاز مصر میں اس مقام سے شروع کیا جہاں دریائے نیل سمندر میں گرتا ہے۔

یہ ماہرین مصر سے سوڈان، پھر سوڈان سے یوگنڈا اور وہاں سے جھیل وکٹوریہ کراس کرتے ہوئے تنزانیہ پہنچے۔ تاہم انہیں دریائے نیل کا منبع روانڈا میں ملا۔ تین کشتیوں میں سوار ان ماہرین نے 6007 کلومیٹر (4163 میل) کا فاصلہ طے کیا اور 5 ملکوں سے گزرے اور روانڈا کے گہرے جنگلات میں دریائے نیل کا منبع تلاش کرلیا۔

❁ ❁ ❁

دریائے ایمیزون

(Amazon River)

دنیا کا دوسرا بڑا دریا

ایمیزون (Amazon) جنوبی امریکہ کا سب سے لمبا اور دریائے نیل کے بعد دنیا کا دوسرا بڑا دریا ہے۔ یہ جنوبی امریکہ کے عرض کے طویل ترین حصہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا ہے۔ یہ دریا تقریباً 6337 کلومیٹر (4000 میل) لمبا ہے اور 25 لاکھ مربع میل رقبے کو سیراب کرتا ہوا بحرالکاہل میں جا گرتا ہے۔ منطقہ حارہ کے مرطوب جنگلوں سے گھرا دریائے ایمیزون اور اس کے بہت سے معاون دریا مل کر ایک ایسا حسین قدرتی منظر پیش کرتے ہیں جس سے اس علاقے کا شمار دنیا کے عظیم قدرتی مناظر میں ہوتا ہے۔

ایمیزون میں کئی ایک دریا آ کر ملتے ہیں جن میں سے 20 ایسے ہیں جن کا اپنا طول ایک ہزار میل سے زیادہ ہے۔ سمندر کے قریب اس کا دہانہ 200 میل چوڑا ہے اور اس سے پیدا شدہ رو سمندر میں 150 میل دور تک اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ تین ہزار میل تک جہاز رانی کے قابل ہے۔

دریائے ایمیزون پیرو کے انڈس سے نکل کر جنوبی امریکہ میں 3977 میل تک بہتا ہے اور بحرالکاہل میں گرنے سے پہلے اس میں ایک ہزار سے زائد معاون دریاؤں کا پانی جمع ہوتا ہے۔ یہ دریا جتنے بڑے علاقے کو سیراب کرتا ہے اور کوئی دریا اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

اس دریا میں جتنا پانی جمع ہوتا ہے وہ دنیا کی سطح پر بہنے والے کل پانی کا 5واں حصہ ہے۔
ایمیزون سے جتنا پانی خارج ہوتا ہے اس کا حجم ایک سیکنڈ میں 6568492 مکعب فٹ ہے۔

ایمیزون کے جنگلات بحراوقیانوس میں برازیل کے دلدلی ساحل سے لے کر انڈس کے مشرق تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان جنگلات کا رقبہ یورپ کے رقبے سے زیادہ ہے۔ یہ جنگلات تقریباً 70 لاکھ مربع کلومیٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دریائے ایمیزون کے دہانے پر بہت بڑا ڈیلٹا بنتا ہے۔

ڈیلٹا کے گردونواح میں وسیع اور گھنے جنگل ہیں جہاں ربڑ کے درخت بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان درختوں سے ربڑ کی کثیر مقدار حاصل کر کے بیرون ممالک کو بھیجی جاتی ہے۔
اس جنگل میں لاتعداد اقسام کے درخت موجود ہیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ماہرین نباتات نے صرف ایک مربع میل کے اندر 60 اقسام کے درختوں کا شمار کیا ہے۔ اس جنگل میں دیو پیکر درختوں کی بہتات ہے۔

ایمیزون کے جنگلات میں حشرات الارض، درندوں، جانوروں اور پرندوں کی لاتعداد اقسام موجود ہیں۔ یہاں سے اب تک کیڑے مکوڑوں کی تقریباً 800 اقسام کو جمع کیا جا چکا ہے۔ جانوروں میں کئی اقسام کے بندر ہیں جنہیں مقامی انڈین باشندے شکار کرتے اور خوراک کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ایمیزون اور اس کے معاون دریاؤں میں سینکڑوں قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔

مچھلیوں کے علاوہ یہاں بحری گائے، کچھوے اور اژدھے بھی پائے جاتے ہیں۔
ایک قسم کا اژدھا جسے یہاں کے رہنے والے انڈین بہت شوق سے کھاتے ہیں اس کا گوشت مرغی کے چوزے کے گوشت سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ایمیزون کے جنگلات ایک بہت بڑے سرسبز پھیپھڑے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ جنگلات نہ ہوتے تو دنیا میں رہنے والوں کے لیے سانس لینا ممکن نہ ہوتا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کرہ ارض پر موجود آکسیجن میں سے آدھی آکسیجن ایمیزون کے جنگلات خارج کرتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یہ جنگلات کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر کے ماحول میں ایک مناسب توازن قائم رکھتے ہیں۔

ایمیزونا (Amazonas) جنوبی امریکہ کے تین خطوں پر مشتمل ہے۔ شمال میں سب سے بڑی ریاست برازیل جو دریائے ایمیزون کی وادی کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس کے شمال اور مغرب میں وینیزویلا، کولمبیا اور پیرو واقع ہیں۔ یہ ریاست تمام کی تمام خط سرطان پر واقع ہے۔ اس میں بڑے گھنے جنگلات ہیں جن میں ربڑ، لکڑی، کوکو اور خاص قسم کے خشک پھل وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔

انکا

(Incas)

جنوبی امریکہ کا ایک قدیم قبیلہ

انکا (Inca) بحرالکاہل کے کنارے جنوبی امریکہ کا ایک قدیم قبیلہ۔ یہ لوگ 11ویں صدی عیسوی میں جنوب مشرق کی طرف سے پیرو (Peru) میں داخل ہوئے۔ انکاس سورج کی پرستش کیا کرتے اور اپنے مردوں کی لاشیں کوئی خاص مصالحہ لگا کر دفن کرتے تاکہ وہ خراب ہونے سے بچ سکیں۔ فن تحریر سے وہ لوگ قطعی ناآشنا تھے لیکن فن تعمیر، برتن سازی اور کپڑا بُننے میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ اپنے عہد میں انکا کے باشندوں کی تہذیب وہاں کافی عروج پر تھی۔ ان کے فن تعمیر کے نمونے آج بھی پیرو میں کھنڈرات کی شکل میں موجود ہیں۔

1200ء میں ان جنگجو لوگوں نے جنوبی پیرو میں ایک طاقتور بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ 1438ء میں انکا سلطنت وجود میں آئی۔ ابتدائی دور میں پیرو، بولیویا اور ایکویڈور اسی سلطنت کے حصے تھے۔ 16ویں صدی کے آغاز پر انکا سلطنت پھیل کر مشرقی بحرالکاہل سے پیراگوئے اور دریائے ایمیزون تک پھیل گئی۔ بعدازاں یہ ایکویڈور کے جدید کیوٹو کے علاقے سے جنوب میں چلی کے دریائے مالے تک وسعت اختیار کر گئی۔ یہ وسیع عریض سلطنت ایک مذہبی حکومت تھی۔ یہ فن معماری، انجینئرنگ اور کپڑا سازی میں ماہر تھے اور اپنے شہنشاہ کو خدا کی طرح مقدس مانتے تھے۔

انکا سلطنت کے پاس سونے و چاندی کے بڑے وسیع ذخائر موجود تھے۔ اس دولت کے لالچ نے یورپی قوموں کو اپنی طرف کھینچا۔ سپین کے حکمران ان خزانوں میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ 1527ء میں ہسپانوی مہم جو فرانسسکو پیزارو اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ پیرو کے شمالی ساحل پر انکا کے شہر Tumbes پر لنگرانداز ہوا۔ یہ پہلا سفید فام تھا جس نے پیرو کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اس نے دیکھا کہ یہاں سونے چاندی کے انبار لگے ہیں۔ وہ انکا کی عظیم الشان بادشاہت دیکھ کر حیران رہ گیا۔

15 نومبر 1532ء کو پیرو میں واقع انکا کا بادشاہ ''آ تا ہوالپا'' اپنے چار ہزار غیر مسلح ساتھیوں کے ساتھ فرانسسکو پیزارو سے ملنے آیا۔ ان غیر مسلح امریکن انڈینوں کا استقبال اس مکار یورپی نے بالکل جنگی انداز میں کیا۔ انہیں پہلے عیسائیت کی دعوت دی گئی جب آ تا ہوالپا نے عیسائیت کو رد کر کے انجیل کو زمین پر پھینکا تو عیسائی جنگجو پیزارو کے حکم پر ان امریکیوں پر ٹوٹ پڑے اور ان نہتوں کو تہ تیغ کرنے کے بعد ان کے شہنشاہ کو گرفتار کر لیا۔ بعدازاں انکا بادشاہ سے اس کی رہائی کے بدلے میں 40 لاکھ پاؤنڈ سونا حاصل کر کے بھی اسے رہا نہ کیا گیا۔ بلکہ اسے عیسائیت قبول کرنے کے باوجود قتل کر دیا گیا۔

بعدازاں فرانسسکو پیزارو 180 آدمیوں کے ساتھ دوبارہ پیرو آیا۔ اس دفعہ اس کے ساتھ ہسپانوی فوجوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ اس فوج کی مدد سے پیزارو نے انکا سلطنت پر حملہ کر دیا اور انکا شہنشاہ ''اٹا نالپا'' (Atanuaalpa) کو قتل کر دیا۔ پیزارو کو یہاں سونے سے بھرا ایک بڑا کمرہ ہاتھ لگا۔ 1533ء میں اس نے پیرو کے بیشتر علاقے بآسانی فتح کر لیے جس میں ان کا دارالحکومت Cusco بھی شامل تھا۔ 1535ء میں پیزارو نے دریائے رماک کے کناروں پر ایک شہر کی بنیاد رکھی جسے ''بادشاہوں کا شہر'' کا نام دیا گیا۔ یہی شہر بعد میں لیما (Lima) کہلایا۔ بعدازاں لیما جنوبی امریکہ میں ہسپانوی حکومت کا مرکز بنا۔

❀ ❀ ❀

اشکالون

(Ashkelon)

یہاں 5 ہزار سال پرانی تاریخ دفن ہے

پانچ ہزار سال قبل اشکالون بحیرہ روم کی بڑی بندرگاہوں میں سے ایک تھی۔ اس کے گردونواح کے علاقے اردن وغیرہ پر اس کا دبدبہ ہمیشہ سے قائم تھا۔ بڑی جنگیں اس کی تباہی کا باعث بنیں اور یہ واقعہ ایک دوصدیوں پہلے کا نہیں بلکہ پانچ صدیوں پہلے رونما ہوا۔ اس بڑے شہر کو دنیا کے نقشے سے ختم کرنے کے لیے کافی بڑے پیمانے پر تباہی مچائی گئی اور اس کے وجود کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔

اشکالون اب موجودہ اسرائیل کا حصہ ہے۔ کچھ انتہا پسند یہودیوں کے گروپ اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ مرے ہوئے لوگوں کا خاص مقام ہوتا ہے اور ان کے جسموں بلکہ ڈھانچوں کو بالکل بھی تنگ نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے نزدیک یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ مردوں کو اذیت دے رہے ہیں۔ آج اشکالون کا نام کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس کو مکمل طور پر بھلایا جا چکا ہے لیکن اسرائیل میں کچھ لوگ اس کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ ان کی پچھلی نسلوں کو ان کی مقدس قبروں سے نکال کر ان پر کسی قسم کی تحقیق کی جائے۔

یہ عظیم الشان شہر قدیم زمانے میں ایک مشہور ساحل سمندر کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں کی تفریح گاہیں لوگوں کے ہجوم سے بھری رہتی تھیں۔ پکنک منانے کے لیے لوگ یہاں

پر ویک اینڈ کو بھرپور طریقے سے گزارتے تھے اور یہ شہر اپنی زندہ دلی اور لوگوں کی بھرپور طریقے سے زندگی گزارنے کے حوالے سے مشہور تھا۔

3500 قبل مسیح میں اشکالون ایک بڑی بندرگاہ تھا اور ترکی اور شام سے مصر تک کے تجارتی راستے میں واقع تھا۔ یہ شہر بہت سی دوسری تہذیبوں کے عروج و زوال کا گواہ بھی تھا۔ یعنی یہاں کے لوگوں نے دنیا کے بہت سے واقعات اور اتار چڑھاؤ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن وقت کی دھول نے اس پر ایسا پردہ ڈالا کہ وہ لوگ اور شہر دنیا کے نقشے سے غائب ہو گیا۔ سب سے پہلے 604 قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ نے اس شہر پر چڑھائی کی اور اسے کافی نقصان پہنچایا۔ آخری دفعہ 1270ء میں مسلم دور کے مملوک حکمرانوں نے جو کہ اس دور میں مصر پر حکمران تھے اس کو تباہ کر دیا۔ کئی صدیوں تک زمین میں دفن رہنے والا شہر جو کہ ملبے کے ڈھیر تلے دبا رہا اور کسی کو ذرہ برابر شبہ نہ رہا کہ نیچے ایک پوری ترقی یافتہ قوم دفن ہے۔ یہ شہر تقریباً 150 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔

اشکالون ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی گمنامی کے پردوں سے نکلا ہے۔ 1985ء میں ایک ٹیم جو کہ ماہرین آثار قدیمہ پر مشتمل تھی یہاں آئی۔ ہاورڈ یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والی اس ٹیم کے سربراہ کا نام لارنس سیگر تھا۔ لارنس کی زندگی کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اس کھوئی ہوئی دنیا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کریں گے۔ کافی تحقیق اور جستجو کے بعد انہوں نے اشکالون کے لوگوں کے رہن سہن، تہذیب و تمدن اور دفن کرنے کی رسومات کا پتہ چلا لیا۔

کنعانی (The Canaaites) وہ لوگ تھے جو کہ شاید مشرقی شام سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے بحیرہ روم کے ساحل کی طرف ہجرت کی۔ یہ شاید کشتیوں کی مدد سے گروپوں کی صورت میں یہاں داخل ہوئے اور پھر یہیں بس گئے۔ یہ لوگ فن صنعت و حرفت میں ماہر تھے اور بہتر طور پر جانتے تھے کہ اپنے شہر کے گرد حصار بندی کرنی ہے۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ کس طرح کی عمارت کیسے تعمیر کرنی ہے۔ اس بات کا ثبوت وہ بلند و بالا عمارتیں دے سکتی ہیں جو کہ انہوں نے اشکالون میں تعمیر کیں اور اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے۔

انہیں کنعانی لوگوں نے اس شہر کے گرد ایک بہت بڑی اور مضبوط دیوار تعمیر کی۔ اس دیوار میں بڑے بڑے دروازے بھی رکھے گئے تا کہ شہر کے اندر آمدورفت میں مسئلہ نہ آئے۔

اس دیوار کو مٹی، اینٹوں اور مضبوط دھاتوں کی مدد سے بنایا گیا جس کی اونچائی 50 فٹ تک تھی۔ اس دیوار نے شہر کو چاروں طرف سے اپنے حلقہ میں لے رکھا تھا اور قوس کی طرح بنائی ہوئی تھی۔ اس دیوار کو بنانے کا بڑا مقصد یہ تھا کہ شہر اشکالون کا دفاع مضبوط بنایا جائے اور دشمن آسانی کے ساتھ اندر نہ آسکے۔

کنعانیوں نے بحریہ روم کے اس ساحل پر بہت محنت کی اور اس کو اس علاقے کی بڑی طاقت اور ترقی یافتہ قوم بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ بحیرہ روم کی یہ جگہ جو بعد میں فلسطین کہلائی تب ایک بہت بڑی بندرگاہ تھی۔ یہاں پر بڑی مقدار میں تازہ پانی، شراب، زیتون کا تیل، گندم اور دوسری چیزیں تھیں۔ کنعانیوں کی زندگی میں یہ مزے اس وقت تک قائم رہے جب 1550 قبل مسیح میں مصریوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ آہستہ آہستہ انہوں نے یہاں کے مقامی لوگوں کے بنیادی حقوق بھی پامال کر دیئے اور ہر چیز پر اپنا قبضہ جما لیا۔

ان لوگوں کے بارے میں بہت سی دلچسپ معلومات ملی ہیں۔ ایک تو یہ کہ بچوں کو چاہے وہ جتنے بھی چھوٹے کیوں نہ ہوں ان کو بڑوں کی طرح دفنایا جاتا تھا۔ اشکالون اپنے دور کا ایک خوشحال اور زرخیز خطہ تھا۔ دفاعی اعتبار سے بھی خاص اہمیت کا حامل تھا۔ تاریخ دانوں کا کہنا ہے کہ تقریباً 1650 قبل مسیح میں ایک پراسرار جنگی گروہ ہائکسوس (Hyksos) نے نیل کے ڈیلٹا پر قبضہ کر لیا اور کئی سال تک یہاں حکومت کرتا رہا۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہائکسوس جس کا مطلب مصری زبان میں ''بیرونی حملہ آور'' ہے کہاں سے آئے تھے۔

جب ہائکسوس نے نیل کے ڈیلٹا پر قبضہ کر لیا تو مصر کے رہائشی انکے زیرِعتاب آ گئے۔ شہر کی دیواروں پر بنے نقش و نگار اس دور کے انسانوں کی وضع قطع ظاہر کرنے میں بہت حد تک مدد دیتے ہیں۔ ان کے چہرے کے نقوش سامی نسل سے تعلق رکھنے والوں جیسے اور ان کے بالوں کا رنگ سیاہ تھا۔ عورتوں کے بال لمبے جبکہ مردوں کے بالوں کا سٹائل ایسا تھا جیسے کھمبیوں کا بنڈل سر پر رکھ لیا ہو۔ مطلب گھنگھریالے بال تھے۔ مرد و خواتین سرخ اور پیلے رنگ کے لباس زیب تن کرتے۔ 1550 قبل مسیح کے قریب مصریوں نے ہائیکسوس کو اپنے ملک سے نکال باہر کیا اور تقریباً 300ء تک کنعان پر حکومت کی۔ یہ خطہ آج لبنان سے سینائی تک پھیلا ہوا ہے۔

13ویں صدی عیسوی میں بیرونی حملہ آوروں کے مختلف گروہوں نے اشکالون پر حملہ کیا۔ 1175ء میں بیرونی حملہ آوروں کے گروپ جن کا نام فلسطین تھا انہوں نے حملہ کر کے اشکالون اور اس کے قریبی علاقوں کو فتح کر لیا اور مستقل طور پر یہیں آباد ہو گئے اور آج بھی فلسطین کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ برتنوں اور عمارات پر کندہ نقش و نگار ظاہر کرتے ہیں کہ فلسطینی یونان سے تعلق رکھتے تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے اشکالون میں آ کر آباد ہو گئے۔

اشکالون میں کھدائی کے دوران ایک برتن ملا جس کے اندر کتے کی ہڈیاں تھیں۔ یہ اس دور میں عمارت کو محفوظ رکھنے کا ٹوٹکا تھا۔ اشکالون کے باشندے سکے استعمال کرتے تھے۔ سکوں کا اجراء تقریباً چوتھی صدی قبل از مسیح سے ہوا اور 12ویں صدی عیسوی تک فلسطین میں یہی سکے چلتے رہے اور آج بھی اسرائیلی میوزیم میں 31 چھوٹے سکے محفوظ ہیں جس کا نام اوبولس ہے اور ان پر 400 قبل مسیح کی تاریخ لکھی ہے۔ ان سکوں پر یونانی دیوی ''ایتھا'' کی تصویر بنی ہے۔

رومی سلطنت کے زیر اثر اشکالون نے بہت ترقی کی۔ رومیوں نے یہاں پر اپنی تہذیب و ثقافت کے گہرے اثرات مرتب کیے۔ عظیم عمارتیں، تھیٹر اور سبزہ زار تعمیر کیے۔ تاریخ دانوں کے مطابق عظیم بادشاہ ہیراڈ یہاں پیدا ہوا۔ ایک یہودی تاریخ دان جوزف کے مطابق ہیراڈ نے عوام کے لیے غسل خانے، فوارے اور بڑی کالونیاں تعمیر کروائیں اور شہنشاہ آگسٹس کے لیے ایک محل بھی تعمیر کروایا۔ رومی دور میں اشکالون کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی اور اسے زراعت یعنی زیتون کے تیل، کھجور، پیاز اور اچھی قسم کی شراب کی برآمد سے خطیر منافع ملتا۔

تقریباً 640ء میں اشکالون پر اسلامی حکمرانوں نے قبضہ کر لیا۔ اس شہر کی کھدائی کے دوران اسلامی حکومت کے نشانات و علامات بھی ملی ہیں۔ مسلم حکمرانوں نے اشکالون میں دوبارہ تعمیر شروع کی اور اس شہر کو نئے انداز سے تعمیر کروایا۔ عمارات پر سونے اور دوسرے جواہرات سے میناکاری، پچی کاری اور کاشی کا کام کروایا۔ تقریباً 50 سال سے زیادہ عرصہ تک اشکالون اسلامی حکومت کے زیر اثر پھلتا پھولتا رہا۔ 12ویں صدی میں فاطمی خاندان کے

حکمرانوں نے اس کی دیواریں دوبارہ مرمت کرائیں اور 50 کے قریب واچ ٹاور تعمیر کیے۔ آج اشکالون مردوں کے شہر کے نام سے جانا جاتا ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ پہلے مردوں کا شہر نہیں تھا۔ یہاں بہت سی تہذیبیں پروان چڑھیں اور ہر تہذیب کے آثار اس کی بنیادوں سے ملتے ہیں۔

جزیرہ ماؤ

(Mauo Island)

دیوتاؤں کا جزیرہ

بحرالکاہل کے وسط میں سمندر کی سطح پر مجمع الجزائر کی صورت میں جو آتش فشانی چوٹیاں ابھریں وہ جزیرہ ہوائی (Hawaii) کی شکل میں دنیا کے سامنے آئیں۔ جزیرہ ماؤ اس سلسلے کا دوسرا بڑا جزیرہ ہے۔ ماؤ ان جزائر میں سب سے بڑے جزیرے ہوائی اور تیسرے نمبر کے جزیرے ''ادیاؤ'' کے درمیان واقع ہے۔ ماؤ جزیرے کا رقبہ 728 مربع میل ہے جبکہ اس کی لمبائی 48 میل اور چوڑائی 26 میل ہے۔ اس کی ساحلی پٹی 120 میل لمبی ہے۔ یہاں کی کل آبادی تقریباً 71 ہزار نفوس پر مشتمل ہے جن میں ہوائی کے باشندے، جاپانی، فلپائن کے باشندے اور مختلف یورپین شامل ہیں۔

جزیرہ ماؤ کا نام پولی نیشین دیوتا کے نام پر رکھا گیا۔ روایت ہے کہ اس دیوتا نے ہوائی جزیروں کو سمندر سے باہر نکالا تھا۔ دیوتا ماؤ کو مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا اور اپنے پسندیدہ مشغلہ کے لیے زیادہ وقت حاصل کرنے کے لیے ماؤ نے سورج کو قید کر لیا اور سورج کو مجبور کیا کہ وہ زیادہ دیر تک دنیا پر اپنی روشنی پھیلائے رکھے۔ ماؤ دیوتا نے ہی پولی نیشین قوم کو آگ کا تحفہ عطا کیا تھا۔

جزیرہ ماؤ کی سب سے مشہور چیز 10023 فٹ بلند خوابیدہ آتش فشاں پہاڑ

''حالیکالا'' ہے جسے سورج کا گھر بھی کہا جاتا ہے اور جواب ایک قومی پارک کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ 25 مربع میل کے رقبے پر مشتمل حالیکالا کا دہانہ دنیا کا سب سے بڑا آتش فشانی دہانہ ہے۔ پورا ''منہاٹن'' جزیرہ اس دہانے میں سما سکتا ہے اور دنیا کی بلند ترین سر بفلک عمارت بھی اس کے 3ہزار فٹ گہرے کنارے سے بلند نہیں ہو سکتی۔ یہ آتش فشاں پہاڑ کبھی کبھار پھٹتے ہیں۔

حالیکالا کی مغربی ڈھلوانوں پر ماؤ کا سب سے زیادہ خوبصورت اور زرخیز علاقہ ہے۔ یہاں سے گزر کر پہاڑ کی چوٹی تک جو سڑک جاتی ہے اس کے اطراف میں خوشبودار یوکلپٹس، چیڑ اور صنوبر کے جھنڈ ہیں۔ حالیکالا کی ڈھلوانوں پر ''Seluerward'' نامی پودا اُگتا ہے جس کے پتے چاندی کی طرح چمکتے ہیں۔ کئی سال پرورش پانے کے بعد اس پودے میں لمبے لمبے ڈنٹھل نکلتے ہیں جو پھٹتے ہیں تو ان میں سے پیلے اور جامنی پھول برآمد ہوتے ہیں۔ یہ پھول ایک ہفتے تک تروتازہ رہتے ہیں۔ جب یہ پھول مرجھا جاتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی اس پودے کی عمر بھی ختم ہو جاتی ہے۔

جزیرہ ماؤ کے آتش فشانی دہانے کے کنارے پر سے دیکھیں تو اس کی سطح چاند کی سطح سے مشابہ نظر آتی ہے۔ دہانے کی سطح سے مخروطی اشکال ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ بظاہر یہ چھوٹی نظر آتی ہیں لیکن ان میں سے سب سے چھوٹی بھی ایک سر بفلک عمارت سے زیادہ بڑی ہے۔ ان میں براؤن، سرمئی، سیاہ، پیلے اور جامنی رنگوں کے مختلف شیڈ نظر آتے ہیں۔

پینٹا گون

(Pentagon)

دنیا کی سب سے بڑی دفتری عمارت

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق پینٹا گون دنیا کی سب سے بڑی آفس بلڈنگ ہے جو امریکی محکمہ دفاع کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ وسیع وعریض بلڈنگ ریاست ورجینیا کے شہر آرلنگٹن میں دریائے پوٹومیک کے کنارے واقع ہے۔ پینٹا گون کا تصور ایک امریکی جنرل بریہن سمرویل نے پیش کیا۔ یہ عمارت فن تعمیر کا شاہکار ہے۔

امریکی محکمہ دفاع، آرمی، نیوی اور ائیر فورس کا یہ مشترکہ ہیڈ کوارٹر صرف 16 ماہ کی قلیل مدت میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ستمبر 1941ء میں اس کی تعمیر کا آغاز ہوا اور 15 جنوری 1943ء کو یہ عمارت مکمل ہوئی۔ اس کی تعمیر پر 8 کروڑ 30 لاکھ ڈالر لاگت آئی۔ یہ تاریخی دفاع قلعوں کی طرح کی ہی ایک عمارت ہے جو اپنی پیشرو عمارتوں سے اپنے پنج کونہ ڈیزائن اور وسعت کے اعتبار سے ایک قدم آگے ہے۔

پینٹا گون کی عمارت 5 مساوی حصوں پر مشتمل ہے جن میں سے ہر حصہ 281 میٹر طویل ہے۔ عمارت 5 منزلہ ہے جن کا مجموعی زمینی رقبہ 6 لاکھ 4 ہزار مربع میٹر ہے۔ پینٹا گون عملاً خود ایک شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ تقریباً 29 ہزار ملازمین (فوج اور سویلین) اس ملک کے دفاع کی منصوبہ بندی اور ان کے نفاذ میں حصہ لیتے ہیں۔ عمارت کا لان 200 ایکڑ رقبے پر

پھیلا ہے۔اس میں 131 سیڑھیاں اور 19 لفٹیں ہیں جو 37 لاکھ 5 ہزار 793 مربع فٹ جگہ پر تعمیر کی گئی ہیں۔

عمارت میں 45 ہزار ٹیلی فون لائنیں ہیں جن سے روزانہ تقریباً دو لاکھ فون کالیں کی جاتی ہیں جو ایک لاکھ میل طویل ٹیلی فون کی تاروں سے منسلک ہیں۔ ڈیفنس پوسٹ آفس ماہانہ 12 لاکھ کی تعداد میں ڈاک تقسیم کرتا ہے۔سٹاف اور دیگر ملازمین کے تحقیقی کاموں میں مدد کے لیے کئی لائبریریاں موجود ہیں۔صرف ایک آرمی لائبریری میں مختلف زبانوں کی تین لاکھ مطبوعات موجود ہیں۔

پینٹاگون کے برآمدوں کی کل لمبائی ساڑھے سترہ میل بنتی ہے لیکن انہیں اس طرح سے ڈیزائن کیا گیا ہے کہ عمارت کے کسی بھی دو حصوں میں کسی ایک پوائنٹ سے صرف 7 منٹ میں پیدل پہنچا جاسکتا ہے۔ پینٹاگون کی تعمیر کے ذریعے امریکی وار (War) ڈیپارٹمنٹ کی 17 عمارتوں کو ایک چھت کے نیچے جمع کر دیا گیا۔ پینٹاگون کے تعمیراتی کام کا آغاز ستمبر 1941ء میں ہوا جس کے شیڈول کی نہایت سختی سے پابندی کی گئی۔ 1300 کارکنوں نے دن رات مختلف شفٹوں میں ہفتے کے سات دن کام کیا۔ ایک ہزار آرکیٹکٹ انجینئر اس پر اس کے مختلف حصے ڈیزائن کرنے میں مسلسل کام کرتے رہے۔

اس عظیم اور بڑی عمارت تک نقل و حمل کے مسئلے کے حل کے لیے اور اسے دیگر بڑی سڑکوں سے جوڑنے کے لیے 48 کلومیٹر طویل سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ 15 جنوری 1943ء کو اس عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی۔ پینٹاگون کی اپنی پولیس اور فائر فائٹنگ فورس ہے۔ پانی اور سیوریج کا نظام مکمل طور پر اس بلڈنگ کے لیے علیحدہ تعمیر کیا گیا۔ 1956ء میں یہاں ایک ہیلی پورٹ کا بھی اضافہ کیا گیا اور آج اس کے اپنے ٹیکسی اور بس ٹرمینل ہیں۔

11 ستمبر 2001ء کو اس وقت یہ عظیم عمارت ایک بڑے المیے سے دوچار ہو گئی جبکہ اس کی مغربی عمارت کا ایک حصہ اس وقت تباہ ہو گیا جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے ساتھ ہی اغواء شدہ ایک کمرشل طیارہ اس عمارت سے بھی ٹکرایا۔ اس حادثے میں نہ صرف عمارت کا ایک حصہ تباہ ہوا بلکہ 189 افراد بھی ہلاک ہوئے۔

ویٹی کن

(Vatican)

دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست اور پوپ کی رہائش گاہ

ویٹی کن جو رومن کیتھولک عیسائیوں کے لیے متبرک مقام اور زیارت کا مرکز ہے دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست ہے۔ یہ اٹلی کے دارالحکومت روم کے اندر واقع ہے جس کا رقبہ صرف 44 ہیکٹرز (109 ایکڑ) ہے۔ 9ویں صدی عیسوی میں چوروں اور لیٹروں سے بچنے کے لیے ویٹی کن کے اردگرد دیوار تعمیر کی گئی تھی۔ اس دیوار کے اندر واقع سینٹ پیٹرز سکوائر، سینٹ پیٹرز ڈوم، محلات اور باغات سب ویٹی کن ریاست کا حصہ ہیں۔ یہاں ایک طرح کی بادشاہت قائم ہے اور پوپ ہی تاحیات یہاں کا حکمران ہوتا ہے۔ اس کے 174 ملکوں کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم ہیں۔

ویٹی کن روم کے شمال مغرب میں دریائے ٹائبر (Tiber) کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ یہ ملک ایک چھوٹی سی تکون کی شکل میں ہے۔ پوری ریاست قرونِ وسطیٰ کی دیواروں سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے چھ بڑے دروازے ہیں۔ اس میں پوپ کا محل، سینٹ پیٹر سکوائر، سینٹ پیٹر باسیلیکا (گرجا)، میوزیم، لائبریری، مقدس دفتر، باغات، ہوٹل اور چند ایک مکانات شامل ہیں۔

ویٹی کن سٹیٹ کا اپنا نظام حکومت ہے۔ پوپ اس کا مطلق العنان اور خودمختار حکمران ہے۔ ریاست کا اپنا قومی پرچم، قومی ترانہ، مرکزی بینک، کرنسی، ڈاک کا نظام، ڈاک ٹکٹ، ریڈیو و ٹیلی ویژن سٹیشن، بجلی گھر، ریلوے سٹیشن، ٹیلی فون کا نظام اور چھوٹی سی پولیس ہے۔

یہاں سے ایک روزنامہ اخبار بھی شائع ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح ویٹی کن میں داخل ہونے والوں کا نہ تو پاسپورٹ اور نہ ہی سامان چیک کیا جاتا ہے۔ بلکہ یہاں آنے والے 90 فیصد لوگوں کو تو یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے ملک میں داخل ہو گئے ہیں۔ ویٹی کن میں 3 ہزار افراد کام کرتے ہیں۔ ایک ہزار افراد یہاں رہتے ہیں جن میں سے 500 افراد کے پاس یہاں کی شہریت ہے۔

سوئٹزر لینڈ کے محافظ پوپ کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ پوپ (Pope) کے پاس ریاست کے انتظامی، قانون سازی اور عدلیہ کے اختیارات ہیں۔

انتظامی اختیارات پوپ کے نمائندے گورنر کے پاس ہوتے ہیں جو کہ براہ راست پوپ کو جوابدہ ہے۔ ویٹی کن سٹیٹ کے 13 ایکڑ رقبے میں سینٹ پیٹرز گرجا، میوزیم اور ویٹی کن پیلس واقع ہیں۔ عظیم شان وشوکت والا ویٹی کن پیلس 14 ویں صدی عیسوی سے پوپ کی رہائش گاہ ہے۔

ویٹی کن سٹیٹ کا علاقہ 754ء سے 1870ء تک پوپوں کی غیر مذہبی حکمرانی کے زیر تحت رہا۔ سلطنت روما کے سقوط کے سینکڑوں سال بعد تک روم اور اٹلی پر پوپوں کی حکومت رہی۔ انہیں پاپائی ریاستیں (Papal States) کہا جاتا تھا۔ 1859ء میں ان ریاستوں کا رقبہ 16 ہزار مربع میل تھا۔

ان علاقوں پر پوپوں کی حکومت برائے نام تھی لیکن 16 ویں صدی عیسوی میں پوپ جولیئس دوم نے پاپائی طاقت حاصل کر لی۔ 13 مئی 1871ء کو ایک اطالوی قانون پاس ہوا۔ اس کے تحت پوپ نے یہاں محل، قلعہ، گرجا اور ہوسٹل وغیرہ تعمیر کرائے۔

50 برس سے زائد عرصے تک پوپ نہم اور اس کے جانشینوں نے اٹلی کی خودمختار حیثیت کو تسلیم نہ کیا اور خود کو ویٹی کن شہر میں اٹلی کے قیدی قرار دیتے رہے۔ 11 فروری 1929ء

کو اٹلی کے وزیر اعظم مسولینی اور پوپ پائیوس XI کے مابین معاہدہ لیٹرن طے پایا جس کی رو سے روم شہر کے اندر ویٹی کن کی آزاد و خودمختار ریاست قائم ہو گئی۔

ویٹی کن کی کوئی انڈسٹری اور زرعی پیداوار نہیں ہے۔ روم ویٹی کن کو پانی مفت مہیا کرتا ہے۔ ویٹی کن کی اپنی فوج ہے جس کی سرکاری زبان جرمن ہے۔ 15ویں صدی میں آج کے سوئٹزرلینڈ میں بہت زیادہ بھوک اور غربت تھی اس لیے اس کے اکثر لوگ یہاں فوج میں بھرتی ہو گئے۔

اسی وجہ سے اسے ''شوائزر گارڈے'' کہا جاتا ہے۔ پوپ سکس ٹوس نے ان کے لیے بارکیں تعمیر کروائی تھیں۔ 1927ء میں جب روم کو لوٹا گیا تو ویٹی کن کو بچانے کے لیے اس کے 189 میں سے 147 سپاہی مارے گئے تھے اور زندہ بچ جانے والے 42 سپاہی پوپ کلیمنٹ ہفتم کو بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس فوج میں بھرتی ہونے کے لیے سوئٹزرلینڈ کا شہری ہونا ضروری ہوتا ہے۔

ویٹی کن کے پاس کتنی دولت ہے اس کے بارے میں کسی کو صحیح معلوم نہیں البتہ یہ مشہور ہے کہ ویٹی کن دنیا کی سب سے بڑی مالی طاقت ہے۔ 1929ء میں اٹلی کے وزیر اعظم مسولینی نے ویٹی کن سے اٹلی کے علاقے واپس لینے کے لیے دو ارب اطالوی لیرے ادا کیے تھے جو کہ اس کے سرمائے کا بڑا حصہ ہیں۔

ویٹی کن کے پاس سونے، شیئرز اور پراپرٹی کی شکل میں ڈیڑھ ارب یورو اور چھ ارب یورو کیش موجود ہیں۔ 1942ء میں ویٹی کن نے اپنا بنک قائم کر لیا جو 1980ء کی دہائی تک بزنس میں حصہ دار تھا۔ 2001ء میں ویٹی کن نے سود کی شکل میں ساڑھے سولہ کروڑ اور 2002ء میں 32 کروڑ یورو حاصل کیا۔

ویٹی کن کا سالانہ بجٹ 10 کروڑ یورو ہے۔ دنیا بھر کے عیسائیوں کو اپنی آمدن سے چرچ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ ملازمت پیشہ لوگوں کا ٹیکس خود بخود ان کی تنخواہ سے منہا کر لیا جاتا ہے۔ کاروباری لوگوں کو اپنے انکم ٹیکس کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس مد سے ویٹی کن کو ہر سال 42 کروڑ یورو حاصل ہوتے ہیں۔ پوپ کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی مگر اس کے تمام اخراجات ریاست کے ذمہ ہوتے ہیں۔

ایک ارب انسانوں کا مذہبی پیشوا اور دنیا کی بڑی طاقت رومن کیتھولک چرچ اور آزاد و خودمختار ویٹی کن ریاست کا سربراہ پوپ ایک نہایت ہی اہم انسان ہے۔ وہ جو کچھ بھی کہتا ہے اس میں وزن ہوتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے لوگ اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں۔ میڈیا کے لیے وہ ایک مقناطیسی شخصیت رکھتا ہے۔ دنیا کے سربراہان مملکت اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا فخر سمجھتے ہیں اور وہ بھی اقتدار کے مزے لیتا ہے۔

❁ ❁ ❁

لندن اور ڈاؤننگ سٹریٹ

(London & Downing Street)

برطانوی دارالحکومت اور وزیراعظم کی رہائش گاہ

لندن جو دولت مشترکہ کا دارالحکومت اور سلطنت برطانیہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ یہ شہر سمندر سے 50 میل دور دریائے ٹیمز پر واقع ہے۔ اس کا انتظامی رقبہ 1579 مربع کلومیٹر (610 مربع میل) جبکہ آبادی تقریباً 75 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ ایک تجارتی، مالیاتی اور ثقافتی شہر ہے۔ نیویارک کے بعد یہ دوسری بڑی بندرگاہ ہے۔

لندن شہر کا سنگ بنیاد 43ء میں رومن عہدِ حکومت میں رکھا گیا۔ اس وقت اس کا نام ''لنڈینیم'' (Londinium) تھا۔ 61ء میں یہاں ایک حفاظتی دیوار تعمیر کی گئی۔ رومنوں کے بعد یہاں سیکسن (Saxon) برسراقتدار رہے۔ انہوں نے یہاں کا مشہور گرجا سینٹ پال 604ء میں تعمیر کرایا۔ 1066ء میں نارمنوں (Normans) نے اسے فتح کیا۔ چنانچہ ولیم اول نے یہاں وائٹ ٹاور تعمیر کرایا۔ 1067ء میں اسے چارٹر عطا ہوا۔ جبکہ 1191ء میں میئر کے شہر کا درجہ دیا گیا۔ 1645ء میں طاعون کی بیماری سے تقریباً 75 ہزار افراد موت کے منہ میں چلے گئے۔ 1666ء میں عظیم آتشزدگی کے نتیجے میں شہر کا بیشتر حصہ تباہ ہوگیا۔ چنانچہ کرسٹوفر رن نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔

1812ء میں لندن کو گیس کے قمقموں سے روشن کر دیا گیا۔ 1829ء میں یہاں اومنی

بسوں کا اجراء ہوا۔ 1890ء میں دنیا کی پہلی زمین دوز ریلوے یہیں متعارف کرائی گئی۔ 1908ء میں یہاں پہلی مرتبہ اولمپک کھیلیں اور بعدازاں 1948ء میں منعقد ہوئیں۔ یہاں کی فلیٹ سٹریٹ، ڈاؤ ننگ سٹریٹ، پکاڈلی، وائٹ ہال، پال مال، لومیارڈ سٹریٹ اور ریجنٹ سٹریٹ بہت مشہور ہیں۔

مادام تساؤ میوزیم، لندن برج، بکنگھم پیلس، ویسٹ منسٹرایبے، ویسٹ منسٹر پیلس، 10 ڈاؤ ننگ سٹریٹ، بگ بن، جنرل پوسٹ آفس ٹاور، ہائیڈ پارک، لندن ٹاور، برٹش میوزیم، برٹش لائبریری، نیشنل گیلری، ٹریفالگر سکوائر، سینٹ پال کیتھیڈرل، ٹیٹ گیلری اس کی شہرت کے لیے کافی ہیں۔

10- ڈاؤ ننگ سٹریٹ

وسطی لندن میں وائٹ ہال سے ذرا پرے ایک گلی کا نام جہاں مکان نمبر 10 میں برطانوی وزیراعظم کی سرکاری رہائش اور دفتر واقع ہیں۔ یہاں ابتداء میں صرف دس مکانات تھے۔ مکان نمبر 10 اس گلی میں واقع عام سا مکان ہے۔ اسے 1735ء سے برطانوی وزیراعظم کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے بالمقابل برطانوی دفتر خارجہ ہے۔ دفتر نوآبادیات اور وزارت خارجہ بھی یہیں ہے۔

انگریز قوم روایت پسند ہے اور اپنی روایات سے محبت کرتی ہے۔ یہاں کچھ روایات ایسی ہیں جو کہ برس ہا برس سے چلی آ رہی ہیں اور ان میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ 10-ڈاؤ ننگ سٹریٹ برطانوی وزیراعظم کی رہائش گاہ۔ یہ عام سا مکان ہے اس مکان کے چاروں طرف کوئی لمبا چوڑا احاطہ بھی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے باہر کسی قسم کا کروفر نظر آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وزیراعظم کی اس رہائش گاہ کا دروازہ بھی ایک ایسی فٹ پاتھ پر کھلتا ہے جس پر عام آدمیوں کے چلنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

برطانوی وزیراعظم الیکشن میں کامیابی کے فوری بعد اس سرکاری رہائش گاہ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اس میں نئے وزیراعظم کی آمد اور پرانے وزیراعظم کی رخصت بڑے ہی روایتی انداز میں ہوتی ہے۔ جب سابقہ وزیراعظم کو یہ علم ہوتا ہے کہ نئے وزیراعظم بس تشریف لایا ہی

چاہتے ہیں تو وہ اپنا سامان باندھ کر بیٹھ جاتا ہے اور نئے وزیراعظم کا انتظار کرنے لگتا ہے اور جیسے ہی نئے وزیراعظم کی کار 10- ڈاؤننگ سٹریٹ کے مین گیٹ پر آ کر ٹھہرتی ہے سابق وزیراعظم پچھلے دروازے سے نکل کر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس موقعہ پر نئے اور پرانے وزیراعظم کی ملاقات نہیں ہوتی۔

اس پوری کارروائی میں وقت کی پابندی کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ جس وقت نیا وزیراعظم مین دروازے سے پہلا قدم اندر رکھ رہا ہوتا ہے عین اسی وقت پرانا وزیراعظم پچھلے دروازے سے قدم باہر نکال رہا ہوتا ہے۔

ویسٹ منسٹر ایبے

(Westminister Abbey)

لندن کا مشہور و معروف شاہی گرجا

برطانیہ کے دارالحکومت لندن میں واقع مشہور گرجا ویسٹ منسٹر ایبے جہاں پر شاہ انگلستان اور ملکہ برطانیہ کی تاجپوشی کی رسم انجام پاتی ہے۔ اس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہلے رومن کیتھولک راہبوں کی ایک خانقاہ تھی۔ چنانچہ اسی مناسبت سے ساتویں صدی عیسوی میں اس جگہ ایک رومن کیتھولک گرجا گھر بھی موجود تھا جو پوپ بینی ڈیکٹ (Pope Benedict) کے عہد میں تعمیر ہوا تھا اور ''ایڈورڈ دی کنفیسر'' (Edward The Confessor) نے اس پر زرِ کثیر صرف کیا تھا۔

اس گرجا کی تجدید شاہ ہنری سوم کے وقت ہوئی۔ اس کے بعد شاہ ایڈورڈ سوم، شاہ رچرڈ دوم، شاہ رچرڈ سوم اور شاہ ہنری ہفتم نے بھی اس میں کچھ اضافے کیے۔ شاہ ہنری ہفتم کا اصل عمارت پر عموداً تعمیر کیا ہوا حصہ ''ہنری چیپل'' کہلاتا ہے اور یہ ایک نہایت خوبصورت دالان ہے۔ مغربی مینار اور پیشانی سینٹ پال کے مشہور انجینئروں کی تعمیر کردہ ہیں۔

یہ شاہی گرجا ہے اگرچہ سینٹ پال انگلستان کا سب سے بڑا گرجا ہے تاہم ویسٹ منسٹر ایبے کی اہمیت اس سے کم نہیں۔ انگلینڈ کے بڑے بڑے قدیم شہنشاہ اور بادشاہ اسی جگہ مدفون ہیں اور اس کے علاوہ بے شمار نامور ہستیوں کی یادگاریں بھی اسی جگہ نصب ہیں۔ یہ گرجا

ویسٹ منسٹر کیتھیڈرل سے مختلف ہے جو اس وقت تک بھی رومن کیتھولک آرچ بشپ کا مسکن ہے۔ اس کی تکمیل 1895ء اور 1915ء کے درمیان ہوئی اور اس کا نقشہ ایک انجینئر بنٹلے (Buntley) نے بنایا۔ یہ عمارت سرخ اینٹوں سے تعمیر ہوئی ہے اور اس کا طرز تعمیر عربی ہے۔ گنبد 283 فٹ اونچا ہے اور اندر بیل بوٹے اور نقش ونگار بکثرت ہیں۔

ان دونوں عمارتوں کے علاوہ ایک تیسری عمارت بھی قریب ہی ہے جس کو ویسٹ منسٹر ہال کہتے ہیں۔ یہ ہال پہلے پہل ضیافتوں کے لیے تعمیر ہوا تھا اور صدیوں تک اس میں شاہی تقریبات منائی جاتی رہیں مگر موجودہ دور میں یہ ایک نمائشی دالان رہ گیا ہے جو پارلیمنٹ کی عمارتوں کے عین سامنے ہے۔ برطانوی وزیراعظم سرآرتھر بالفور نے فرانسیسی بحری افسروں کو یہیں دعوت دی تھی۔ اسی جگہ چارلس اول، سرتھامس مور اور وارن ہسٹنگز کے مقدمات کی سماعت ہوئی جن میں سے صرف وارن ہسٹنگز بری ہوا اور باقی دونوں موت کی سزا پا کر قتل ہو گئے۔

ویسٹ منسٹر ایبے میں جو آخری بادشاہ دفن ہوا وہ ملکہ الزبتھ دوم کا باپ شاہ جارج ششم تھا۔ جسے 15 فروری 1952ء کو یہاں سپرد خاک کیا گیا۔ 2 جون 1953ء کو ملکہ الزبتھ دوم کی باقاعدہ رسم تاجپوشی اور تخت نشینی بھی یہیں انجام پائی۔ ویسٹ منسٹر ایبے گاتھ (Goth) طرز تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ عمارت ولیم اوّل سے لے کر تمام انگریز بادشاہوں کی تاجپوشی کا مقام رہا ہے۔ اس کے جنوبی بازو میں گوشہ شعراء ہے جس میں عظیم انگریز شاعروں کے مقبرے ہیں۔

❁ ❁ ❁

بکنگھم پیلس

(Buckingham Palace)

برطانوی شاہی حکمرانوں کی رہائش گاہ

لندن کے انتہائی مغربی حصے میں بکنگھم پیلس وہ محل ہے جہاں 1837ء سے انگلینڈ کے حکمران (بادشاہ یا ملکائیں) رہتے چلے آرہے ہیں۔ اگرچہ یہ قصر نہایت مشہور ہے تاہم خوبصورتی کے اعتبار سے یکتا نہیں۔ البتہ نہایت خوشگوار اور دلپسند ماحول میں ضرور واقع ہے۔ یہاں چارلس اول کے عہد حکومت میں لوگ تفریح کی غرض سے آتے تھے۔۔ جہاں پیلس واقع ہے وہاں سب سے پہلے ''گورنگ ہاؤس'' تعمیر ہوا جو بعد میں ''آرلنگٹن ہاؤس'' کہلانے لگا۔ اس زمانے میں اس میں شاہ چارلس دوم کے عہد کا ایک نامور سیاستدان امیر رہتا تھا۔

1703ء میں آرلنگٹن ہاؤس کو منہدم کروا کے نارمنڈی اور بکنگھم کے ڈیوک (جان شیفیلڈ) نے اپنا محل تعمیر کروایا۔ اسی نسبت سے یہ ''بکنگھم پیلس'' کہلایا۔ شاہ جارج سوم نے شادی کے فوراً بعد 1761ء میں یہ بڑا مکان شاہی خاندان کے لیے خرید لیا اور اگلے سال ''سینٹ جیمز پیلس'' کو چھوڑ کر یہاں رہائش اختیار کر لی۔ تب سے اب تک یہ شاہی قیام گاہ ہے۔ 1825ء میں شاہ جارج چہارم نے جان ناش (John Nash) کے ذریعے اسے دوبارہ تعمیر کرایا۔ شاہ جارج سوم نے اس کو کشادہ اور وسیع کرنے کے انتظامات کیے اور اسے اپنی ملکہ کے اعزاز میں ''کوئین ہاؤس'' کا نام دیا۔

اگلے سالوں کے دوران شاہی خاندان اپنی ضرورت کے تحت اس میں توسیع کراتا رہا۔ کئی بادشاہوں نے اس کے مشرقی اور جنوبی حصے وسیع کرائے۔ 1837ء میں اس کے اصل مالک کے اعزاز میں اسے ''بکنگھم پیلس'' کا نام دیا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ پہلی حکمران تھی جس نے اس وسیع شدہ محل میں رہائش اختیار کی۔ 1856ء میں اس میں ایک بڑے بال روم کا اضافہ کیا گیا۔ اگرچہ ہر نئے بادشاہ نے اس کی زینت اور آرائش میں اضافہ کیا لیکن شاہ ایڈورڈ ہفتم اور شاہ جارج پنجم کے عہد حکومت میں اس کی شان کو دوبالا کیا گیا۔

محل کے سامنے ملکہ وکٹوریہ کا میموریل ہے جس کا نقشہ 1913ء میں سر آسٹن ویب (Aston Webb) نے تیار کیا۔ اسی سال اس کی نقاب کشائی کی رسم ادا ہوئی۔ ملکہ وکٹوریہ کی یادگار سنگ مرمر سے تیار کی گئی ہے۔ اونچے وسطی حصے تک پہنچنے کے لیے زینے بنے ہیں۔ وسطی حصے میں سنہری برنج کا وکٹری یعنی فتح کا پیکر ہے جس کی جڑ میں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ رکھا ہے۔

بکنگھم پیلس میں 600 کے قریب کمرے ہیں۔ ان میں بہترین تصویریں آویزاں ہیں جن میں شاہی خاندان کی تصویریں اور مشہور آرٹسٹوں کی بنائی ہوئی پینٹنگز ہیں۔ محل کے چار حصے ہیں۔ شاہی خاندان محل کے شمالی حصے میں رہائش پذیر ہے۔ پہلے فلور پر شاہی تقریبات اور دیگر سوشل تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ ان میں سٹیٹ بال روم اور تخت نشینی کے ہال بھی شامل ہیں۔ ملکہ کی گیلری بھی ہے جہاں بیش قیمت فرنیچر اور دیگر نوادرات شامل ہیں۔ یہاں کا علاقہ عوام کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

آستانہ نورالایمان

(Astana Noor-ul-Aiman)

سلطان برونئی کا دنیا کا سب سے بڑا شاہی محل

دریائے برونئی کے کنارے سلطان حسن البولقیہ کے شاہی محل کا نام "آستانہ نور الایمان" ہے۔ سلطان برونئی نے اپنی دولت سے دنیا کا یہ سب سے بڑا محل تعمیر کروایا۔ یہ دورِ جدید کا سب سے بڑا رہائشی محل ہے۔ اس کی تعمیر کا کام 1984ء میں مکمل ہوا تھا۔ دنیا کے اس سب سے بڑے محل پر 35 کروڑ ڈالر خرچ ہوئے۔

شاہی محل کے وسیع و عریض دربار میں دنیا کے سب سے بڑے فانوس لگائے گئے ہیں۔ ان کی تعداد 564 ہے۔ ہر فانوس کا وزن 54 من ہے جبکہ ہر فانونس میں 51,490 بلب لگائے گئے ہیں۔ 12 فانوس صرف دربار ہال میں ہیں۔ محل کے شاہی مہمان خانے میں چار ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے محرابوں پر خالص سونے کی ٹائلیں لگی ہوئی ہیں۔ محل کی تعمیر میں دنیا کے مختلف حصوں سے لائے گئے 28 مختلف اقسام کے سنگ مرمر استعمال کیے گئے ہیں۔

14 ایکڑ رقبے پر مشتمل اس محل میں 1788 کمرے، 257 حمام (طہارت خانے) اور 44 زینے ہیں۔ محل کے لان 150 ایکڑ سے زائد رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق محل کی تعمیر پر تقریباً 16 ارب روپے کی خطیر رقم خرچ کی گئی۔ لیکن جب یہ محل تعمیر ہو

گیا تو اس کے بعض حصے سلطان کو پسند نہ آئے اور پھر سلطان نے وہی کیا جو اس حیثیت و اختیار کے حامل افراد کیا کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے پورا محل گرا دیا اور اسی جگہ پر نیا محل تعمیر ہوا۔

محل میں ایک زمین دوز گیراج بھی ہے جس میں سلطان کے زیر استعمال 120 جدید ترین کاریں ہر وقت تیار کھڑی رہتی ہیں۔ آستانہ نورالایمان دنیا کا سب سے بڑا شاہی محل ہے۔ بکنگھم پیلس اور ویٹی کن عظمت اور شان و شوکت میں اس سے کہیں کم ہیں۔ سلطان اسی محل میں سال میں تین دن دربار لگاتے ہیں اور لوگوں کی شکایات خود سنتے ہیں۔

زم زم

(Zam Zam)

وہ آبی چشمہ جس کا پانی مسلم دنیا آب حیات تصور کرتی ہے

آب زم زم وہ چشمہ ہے جسے خداوند کریم نے اپنی رحمت اور حکمت سے سرزمین عرب کے گرم اور تپتے ریگزاروں میں خشک پتھروں کے درمیان تقریباً چار ہزار سال قبل حضرت اسماعیلؑ کی تشنہ لبی کو دور کرنے کے لیے جاری کیا تھا۔ یہ چشمہ بیت اللہ (مکہ معظمہ) میں ہے۔

''زم زم'' کے لغوی معنوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چند ارباب دانش کے نزدیک اس کا مطلب ''ٹھہر جا ٹھہر جا'' اور کچھ ماہرین لسانیات کے نزدیک یہ عربی لفظ ''زمزمہ'' سے نکلا ہے جس کا مطلب ''چھوٹے چھوٹے گھونٹ میں پانی پینا یا چلو سے پانی پینا'' ہے۔

آب زم زم کا تاریخی واقع کچھ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر عرب کے ریگستانوں میں آئے۔ مکہ کی سنسان وادی میں اس وقت کوئی بھی انسان موجود نہ تھا اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہو گئے۔ وہ ان کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں اے ابراہیمؑ کہاں جا رہے ہو؟ اور ہمیں اس سنسان بے آب و گیاہ وادی میں کیوں چھوڑے جاتے ہو؟ یہ

بات حضرت ہاجرہ نے کئی بار کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے بس اتنا فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں کہ اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا اور پلٹ کر بیٹے اسماعیلؑ کے پاس آ بیٹھیں۔

حضرت ابراہیمؑ جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹا نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخرکار انہیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رخ کیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کی "اے پروردگار میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے تا کہ اے پروردگار یہ یہاں نماز قائم کریں لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکرگزار بنیں"۔ (ابراہیمؑ 37)

اِدھر اسماعیلؑ کی والدہ ان کو دودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو انہیں اور بچے کو پیاس لگنی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا دیکھتی رہیں۔ آخر بچے کی حالت ان سے دیکھی نہ گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آئے۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ پھر صفا کی پہاڑی سے اتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مروہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی انسان نظر نہ آیا۔ یہ عمل انہوں نے سات مرتبہ (صفا اور مروہ کے درمیان) کیا۔ اسی وجہ سے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔

آخری مرتبہ جب حضرت ہاجرہ مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ یکایک انہوں نے زم زم کے مقام پر ایک فرشتہ دیکھا (ابراہیم بن نافع کی روایت میں ہے کہ وہ جبریلؑ تھے) کہ وہ اپنی ایڑی یا بازو سے زمین کھود رہا ہے یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ وہ پانی مشکیزہ میں بھرنے لگیں اور جیسے جیسے وہ پانی بھرتی گئیں پانی ابل ابل کر اوپر آتا رہا۔ حضور نبی کریمؐ سے روایت ہے کہ اگر وہ زمزم کو اسی حالت پر چھوڑ دیتیں (یعنی چاروں طرف مٹی ڈال کر اسے گھیر نہ لیتیں) تو زمزم بہتا ہوا ایک بہت بڑا چشمہ ہوتا۔ اس طرح حضرت ہاجرہ پانی پینے لگیں اور اپنے بچے کو دودھ پلانے لگیں۔

زمزم کی یہ حالت کچھ مدت رہی تھی کہ قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ کدا کی طرف سے آئے اور مکہ کے نشیبی حصے کی طرف ٹھہرے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ پانی پر چکر لگا رہا ہے۔ انہوں نے کہا: ''ہم پہلے بھی اس وادی سے گزرے ہیں مگر یہاں کوئی پانی نہیں تھا۔'' پھر انہوں نے دو آدمی بھیجے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں پانی موجود ہے۔ انہوں نے واپس جا کر ان لوگوں کو اس کی خبر دی۔ دیگر لوگ بھی اس جانب آئے تو حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو وہاں پایا۔ انہوں نے کہا کیا تم ہمیں یہاں قیام کی اجازت دیتی ہو۔ انہوں نے کہا ہاں مگر پانی تمہارا نہیں بلکہ میرا ہے۔ قبیلے والوں نے ان کی بات مان لی۔

اس جرہمی گروہ نے حضرت ہاجرہ کو نہایت ملنسار پایا۔ وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ کچھ انسان یہاں آباد ہوں۔ چنانچہ وہ لوگ وہاں ٹھہر گئے اور اپنے خاندان والوں کو بھی وہیں بلا لیا۔ یہاں تک کہ کئی خاندان وہاں بس گئے۔ مکہ معظمہ کی یہ پہلی باقاعدہ آبادی تھی۔ اسی مقام پر بعدازاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اہل فارس (ایرانی) بھی ادھر آئے۔ ایران کا بادشاہ ساسان بن بابق جو ساسانی خاندان کا بانی تھا 226 قبل مسیح میں اس چشمے کی زیارت کو آیا۔ اسلام سے پہلے ایرانی بھی اس کنویں سے برکت حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس کا تذکرہ قدیم پارسی شاعری میں ملتا ہے۔

جب بنو جرہم مکہ سے جانے لگے تو انہوں نے قریش کے مشہور بتوں ''اساف'' اور ''نائلہ'' کے درمیان زمزم کے چشمے کو بند کر دیا۔ پھر حوادث زمانہ سے یہ چشمہ دب گیا۔ سینکڑوں سال بعد حضور اکرمؐ کے دادا عبدالمطلب کو خواب میں کنواں کھودنے کا حکم ہوا۔ انہوں نے اپنے بیٹے حارث کی مدد سے کنواں کھودا تو وہاں سے پانی برآمد ہوا۔ اس وقت سے وقتاً فوقتاً پانی خشک یا کم ہو جانے کی وجہ سے اس کی گہرائی میں اضافہ ہوتا رہا اور یہ لاکھوں آدمیوں کے لیے پانی مہیا کرتا رہا۔ یہ چشمہ آج تک جاری ہے۔ زم زم کا کنواں مربع پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ یہ 17ویں صدی عیسوی کی تعمیر ہے۔

موجودہ عمارت جس میں زمزم کا کنواں واقع ہے 1661ء میں عثمانی ترکوں کے عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ کنواں کعبے سے جنوب مشرق کی طرف 33 گز کے فاصلے پر حجر اسود کی دیوار کے بالمقابل واقع ہے اور 140 فٹ گہرا ہے۔ زمزم کے کنوؤں کے اوپر چوکور عمارت تعمیر

کی گئی ہے جس میں شمال کی جانب سے دروازہ ہے۔ کمرے میں خوبصورت سنگ مرمر سے پچی کاری کی گئی ہے۔ کنواں عمارت کے عین درمیان میں ہے جس کے ساتھ ہی ایک حوض ہے جو ہر وقت آب زمزم سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں جہاں کنویں کے گرد پانچ فٹ بلند منڈیر ہے۔ اس کے اوپر کئی فٹ اونچی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔ کنویں سے پانی نکالنے کے لیے ٹیوب ویل لگے ہیں۔

1374ھ میں شاہ عبدالعزیز آل سعود کے دور میں دو سبیلیں سنگ مرمر کی بنائی گئیں اور زمزم کے لیے نئی عمارت تعمیر کرائی گئی اور پانی نکالنے کا پرانا طریقہ ترک کر کے نیا طریقہ زیر استعمال لایا گیا۔ اس میں دو بڑی بڑی ٹنکیاں رکھی گئیں جن کے ساتھ 24 بڑے نل ہیں۔ اس کے علاوہ مطاف کی کئی دفعہ توسیع کی گئی تا کہ زمزم سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

آب زمزم کی مقدار کا کوئی حتمی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں پہلی کوشش 1391ھ میں سعودی وزارت زراعت نے کی۔ ایک ماہر نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا کہ اس چشمہ سے ایک منٹ میں 164 سے لے کر 217 گیلن پانی پھوٹتا ہے۔

بین الاقوامی کمپنیوں نے اندازہ لگایا کہ ایک گھنٹہ میں 60 میٹر تک پانی نکلتا ہے۔ سب سے آخری رپورٹ جو اس کے متعلق موصول ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک سیکنڈ میں 11 اور 18 لیٹر کے درمیان پانی نکلتا ہے۔ اس بات پر سب ماہرین کا اتفاق ہے کہ چشمہ کا پانی تین پتھروں کے درمیان سے پھوٹتا ہے۔ یہ پتھر کعبہ، صفا اور مروہ کی طرف سے آ رہے ہیں اور زمزم کے کنویں پر ملتے ہیں۔

مسجد نبویؐ

(Holy Mosque Madina)

عالم اسلام کی سب سے بڑی مسجد

حضرت محمدؐ نے جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو رسول اللہؐ نے صحابہ کرامؓ کی مدد اور تعاون سے گارے کی دیواروں اور کھجور کی چھال سے ایک مسجد تعمیر فرمائی جو مسجد نبوی الشریفؐ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اپنی تعمیر سے لے کر اب تک اس میں متعدد مرتبہ تجدید و توسیع ہوئی۔ موجودہ دور میں شاہ فہد بن عبدالعزیز (مرحوم) نے مسجد نبویؐ کی توسیع کا عظیم الشان منصوبہ مکمل کیا۔

مسجد نبویؐ کی پہلی تعمیر حضورؐ نے ہجرت کے پہلے سال فرمائی۔ 628ء (2ھ) میں حضورؐ نے دوسری مرتبہ تعمیر و توسیع فرمائی۔ بعدازاں 638ء (12ھ) میں حضرت عمر فاروقؓ کے عہد مبارک میں۔ 649ء (29ھ) میں حضرت عثمان غنیؓ۔ 706ء (88ھ) میں ولید بن عبدالملک۔ 777ء (161ھ) میں خلیفہ مہدی عباسی۔ 1275ء (655ھ) میں خلیفہ المعتصم باللہ۔ 1305ء (705ھ) میں ملک الناصر۔ 1306ء (706ھ) میں پھر ملک الناصر۔ 1431ء (831ھ) میں ملک الظاہر۔ 1474ء (879ھ) میں ملک قائتبائی۔ 1566ء میں سلطان سلیمان۔ 1572ء (980ھ) میں سلطان سلیم دوم اور 1848ء (1265ھ) میں سلطان عبدالمجید نے مسجد کی تجدید و توسیع کے کام میں حصہ لیا۔

سعودی حکومت نے بھی مسجد نبوی میں متعدد بار توسیع کی۔ 8 جون 1949ء کو شاہ عبدالعزیز آل سعود نے تمام مسلم ممالک کو مسجد نبوی کی توسیع کے لیے خطوط لکھے۔ اس کے لیے عرب ماہرین تعمیرات کو دعوت دی گئی۔ 9 جولائی 1951ء کو کام کی ابتداء ہوئی اور 21 اکتوبر 1955ء کو یہ منصوبہ مکمل ہوا۔ مسجد کا رقبہ 6024 سے بڑھ کر 16326 مربع میٹر ہو گیا۔ اس پر 50 ملین ریال لاگت آئی۔ شاہ خالد بن عبدالعزیز کے دور میں بھی مسجد نبوی کی آرائش و زیبائش پر کروڑوں ریال خرچ ہوئے۔

خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز نے جب 1983ء میں مدینہ منورہ کی زیارت کی تو انہوں نے محسوس کیا کہ نمازیوں اور زائرین کی تعداد پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے 11 مئی 1983ء کو اس کی توسیع کے منصوبے کی منظوری دی۔ 18 جولائی 1983ء کو کام کی ابتداء ہوئی۔ جس سے مسجد کا رقبہ ایک لاکھ 65 ہزار 500 مربع میٹر ہو گیا۔ حج و عمرہ اور رمضان المبارک کے مہینے میں مسجد نبویؐ کے اندر 10 لاکھ سے زائد افراد سما سکتے ہیں۔

نئے منصوبے کے تحت مسجد کی موجودہ عمارت سے متصل اس کے شمال، مشرق اور مغرب میں ایک نئی عمارت بنائی گئی جس کا رقبہ 82 ہزار مربع میٹر ہے اور اس میں ایک لاکھ 37 ہزار نمازیوں کے لیے گنجائش ہے۔ اسی طرح مسجد نبویؐ کے گراؤنڈ فلور کا مجموعی رقبہ 98 ہزار 500 مربع میٹر ہے جس میں ایک لاکھ 67 ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ توسیع شدہ عمارت کی چھتوں کو بھی نماز کے قابل بنایا گیا ہے جس کا رقبہ 67 ہزار مربع میٹر ہے اور اس میں 90 ہزار افراد کی گنجائش ہے۔ اس طرح توسیع کے بعد مسجد نبوی میں کل دو لاکھ 57 ہزار نمازیوں کے لیے گنجائش ہے اور کل رقبہ ایک لاکھ 65 ہزار 500 مربع میٹر ہے۔ توسیع شدہ عمارت میں تہ خانہ بھی بنایا گیا ہے جو ائیر کنڈیشنگ مشینوں وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

مسجد نبویؐ کے کل دروازوں کی تعداد 59 ہے۔ علاوہ ازیں مسجد نبوی کی چھت پر جانے کے لیے بنائے گئے زینوں تک جانے اور ان سے نکلنے کے لیے آٹھ دروازے بنائے گئے ہیں۔ توسیع کے بعد مسجد نبویؐ کے 10 مینار ہو گئے ہیں جن میں 6 نئے بنائے گئے ہیں۔ ہر مینار کی اونچائی 99 میٹر ہے اور مینار کے اوپر بنے ہوئے 6 میٹر کے ہلال سمیت یہ اونچائی

105 میٹر ہوگئی ہے۔ اس طرح توسیع کے بعد میناروں کی اونچائی میں 33 میٹر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ بقیہ میناروں کی اونچائی 72 میٹر ہے۔

مسجد نبویؐ کے صحن میں 18x18 میٹر رقبے کی 27 برجیاں بنائی گئی ہیں۔ یہ برجیاں دراصل متحرک چھتیں ہیں جنہیں آٹومیٹک طریقے سے کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے مسجد کے قریب سڑکیں، انڈر گراؤنڈ کار سٹینڈ، تجارتی و سرکاری عمارتیں اور زائرین کے لیے دیگر سہولتیں جیسے وضو خانے اور طہارت خانے بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے اردگرد میدانوں کا رقبہ 2 لاکھ 35 ہزار مربع میٹر ہے۔ جن پر سنگ مرمر لگایا گیا ہے اور مختلف رنگ کے محرابی نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔

نماز کے لیے مخصوص حصہ کا رقبہ ایک لاکھ 35 ہزار مربع میٹر ہے۔ جس میں اڑھائی لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہے۔ اگر سارے میدان کو نماز کے لیے استعمال کیا جائے تو 4 لاکھ افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد نبویؐ کی توسیع و تعمیر کے مجموعی اخراجات 6 ارب ریال سے زیادہ ہیں۔ توسیع سے قبل مسجد کے سات مین دروازے تھے جو اب 23 ہیں۔ اس کے علاوہ گراؤنڈ فلور کے آٹھ نئے گیٹ بنائے گئے ہیں۔ مسجد کے دروازوں کی تعداد پہلے 16 تھی جو اب 18 ہے۔ مسجد نبویؐ اس وقت دنیا کی بڑی اور خوبصورت ترین مسجد ہے۔

❀ ❀ ❀

کوہ نور ہیرا

(Koh-e-Noor Diamond)

دنیا کا سب سے بڑا اور انتہائی قیمتی ہیرا

کوہ نور ہیرے۔ اس کی تاریخ اور اس کی نحوست کی کہانی تاریخ نویسوں کے مطابق کچھ یوں ہے۔ یہ انتہائی قیمتی ہیرا کوہ نور بیجاپور (گولکنڈہ) کی کوئلے کی کان سے نکلا تھا۔ گولکنڈہ دکن میں ایک مشہور جگہ ہے۔ دُنیا کا یہ قیمتی پتھر کسے ملا صحیح اندازہ نہیں۔ تاہم کچھ علماء کا خیال ہے کہ یہ عادل شاہی خاندان کے پایہ تخت بیجاپور کی کسی کان سے 1273ء میں نکالا گیا تھا جو کہ بعد میں گولکنڈہ منتقل ہوا۔

بیجاپور جہاں سے یہ انمول پتھر ملا بڑا معروف اور تاریخی شہرت کا حامل ہے۔ یہاں متعدد قدیم آثار و باقیات ہیں۔ سلطان محمود عادل شاہ کا ''گول گنبد'' دنیا کے عجائبات میں شامل ہوتا ہے۔ یہاں کے شاہی محلات، مسجدیں، مینار اور قلعوں کے علاوہ حکمرانوں کے مقبرے تاریخ دانوں کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ چاند بی بی جس نے مغل فوج کو ناکوں چنے چبوائے تھے یہاں کی حکمران تھی۔ یہاں کا اسلامی فن تعمیر ہر سیاح کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

علاؤ الدین خلجی نے 1309ء میں جب اوازنگل کو فتح کیا تو یہاں کے مال غنیمت میں اس کو مشہور عالم کوہ نور ہیرا بھی ملا۔ علاؤ الدین کے ایک سپہ سالار ملک کافور نے سلطان کو

کہا کہ یہ ہیرا انتہائی منحوس ہے اور یہ جس کی بھی ملکیت میں جاتا ہے وہ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہتا ہے۔ جتنا عرصہ یہ ہیرا سلطان کے پاس رہا اس کو ایک دن بھی سکون میسر نہ آیا۔ سلطان کے حقیقی بھتیجے آگت خان نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اس کے بھائی عمر خان نے بغاوت کر دی۔ حاکم دہلی حاجی مولا نے بغاوت کی۔ سلطان کے 20 سالہ دور حکومت میں علاؤ الدین نیم پاگل ہو گیا اور ملک کافور نے اس کے کمسن لڑکے عمر خان کو تخت پر بٹھا دیا اور کوہ نور پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت اس ہیرے کا کوئی نام نہ تھا اور یہ بالکل ناتراشیدہ تھا اور جواہرات شاہی کے ساتھ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہ ہیرا خاندان تغلق اور لودھی میں پہنچا اور جب ابراہیم لودھی کو بابر نے شکست دی تو آگرہ میں اس کی ماں نے یہ ہیرا ہمایوں کی نذر کیا۔ یہی ہیرا تھا جس کو ہمایوں کی بیماری کے وقت امراء نے صدقہ دینے کی صلاح دی تھی۔ اس زمانے میں اس ہیرے کا وزن 793 5/8 گرین تھا جو پاؤ بھر کے قریب ہوتا ہے اور جس طرح کان سے نکلا تھا اسی طرح ناتراشیدہ حالت میں پڑا تھا۔ صدیاں گزر گئیں کسی نے اس کو تراشنے یا ترشوانے کی طرف توجہ نہ دی۔

1628ء میں شہنشاہ شاہ جہاں نے تمام جوہرات نکلوا کر ان کی ترتیب کرائی اور ان کو کام میں لانے کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ اس ہیرے کو ترشوا کر تین ٹکڑے کیے گئے۔ ایک کا نام کوہ نور اور دوسرے کا نام کوہ طور جبکہ تیسرے ٹکڑے کا نام کسی جگہ نہیں ملتا۔ شاہ جہاں نے تخت طاؤس کے گرد موتیوں اور سونے کے دو مور بنوائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بیش قیمت موتی تھے لیکن چھاتیوں میں کوہ نور اور کوہ طور جڑوائے تھے۔ ان دونوں ہیروں کو فرانس کے جوہری ٹریوبز نے 1665ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت کوہ نور کا وزن 280 گرین اور کوہ طور کا وزن 194 گرین تھا۔

1839ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر چڑھائی کی اور تخت طاؤس کو لے گیا۔ نادرشاہ کی وفات پر یہ ہیرا اس کے سپہ سالار احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ آیا اور وہ اسے لے کر کابل (افغانستان) چلا گیا۔ پھر عرصہ تک اسی کے خاندان میں رہا۔ جب کابل میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور شاہ شجاع شکست کھا کر 1809ء میں پنجاب چلا آیا تو یہ ہیرا بھی اس کے پاس

تھا۔ اسی ہیرے کی خاطر رنجیت سنگھ نے اس کی بہت خاطر تواضع کی اور چند روز بعد رنجیت سنگھ نے ہیرا طلب کیا لیکن شاہ شجاع ٹالتا رہا۔ رنجیت سنگھ نے اس پر کڑی پابندی لگا دی اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ہیرا شاہ شجاع کی پگڑی میں ہے تو اس نے بھائی بندی کا بہانہ کر کے پگڑیاں بدلوانے کے بہانے اس سے پگڑی سمیت ہیرا لے لیا۔

1850ء میں انگریزوں نے راجہ رنجیت سنگھ کے جانشین دلیپ سنگھ کو معزول کر کے پنجاب کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس کا کل مال و اسباب ضبط کر لیا۔ اس ضبطی میں کوہ نور بھی ان کے ہاتھ لگ گیا اور گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے ملکہ وکٹوریہ کو تحفتاً بھیج دیا۔ 1851ء کی نمائش میں یہ ہیرا پبلک کو دکھانے کی غرض سے رکھا گیا۔ واں اس کی کانٹ چھانٹ ہوئی اور اس کا وزن 186 1/16 گرین رہ گیا اور اسے شاہی تاج میں لگایا گیا۔ اب اس کو دوبارہ درست کرایا گیا ہے اور وزن صرف 108 1/16 گرین رہ گیا ہے۔

اس کے ساتھ کا ٹکڑا جو کوہ طور کہلاتا تھا گم ہو گیا تھا اور بڑے عجیب طریقے سے ملا۔ جب کوہ نور انگلستان میں پہنچا تو اس کی ایک سطح بالکل سپاٹ تھی۔ روس میں بھی ایک ہیرا ایک صدی پہلے آ چکا تھا جس کی سطح سپاٹ تھی۔ سطح کا ہموار ہونا قدرتی حالات میں ناممکن تھا اور یہ عمل تراش کر ہی کیا جا سکتا تھا۔ پس جوہریوں نے اس خیال سے دونوں ہیروں کو ملا کر دیکھا تو دونوں ایک دوسرے پر ہموار بیٹھ گئے۔ ان کو ملانے پر ایک کونہ خالی رہتا تھا۔ اس لیے اس تیسرے ٹکڑے کی تلاش شروع ہوئی۔ بالآخر دنیا بھر کے خزانوں کی تلاش کے بعد یہ ٹکڑا شاہ ایران کے خزانے میں مل گیا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ یہ ہیرا بھی نادر شاہ کے ساتھ ہی دہلی سے آیا تھا۔ ان تینوں ہیروں کی آب و رنگ اور دوسرے طریقوں سے پہچان کر لی گئی تو ایک جنس ہی نکلی اور مجموعی وزن اس ہیرے کے برابر نکلا جو ملک کافور دکن سے لایا تھا۔ اس طرح ان کے ایک ہونے کی تصدیق ہو گئی۔

کوہ طور

یہ مشہور کوہ نور ہیرے کا ایک ٹکڑا تھا۔ جب شاہ جہاں نے کوہ نور کے تین ٹکڑے کرائے تو ایک کا نام کوہ نور اور دوسرے کا نام کوہ طور رکھا گیا۔ تیسرے کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

ان سب میں کوہ نور بہت مشہور ہے۔ یہ دونوں ہیرے ایک ہی وقت میں دہلی سے نکلے۔ جب نادرشاہ نے دہلی کو لوٹا تو وہ کوہ نور کو تخت طاؤس سمیت ایران لے گیا۔ نادر شاہی ہنگامے میں ایک فرانسیسی سپاہی نے جو مغل فوج میں شامل تھا کوہ نور پر قبضہ کر لیا اور اس کو لے کر مدراس بھاگ گیا اور ایک جہاز کے کپتان کے پاس اسے 30 ہزار روپے میں بیچ دیا۔ کپتان نے اسے ایک لاکھ 80 ہزار میں ایک انگلستانی یہودی کے ہاتھ بیچ دیا۔ جب یہ خبر خواجہ رافیل اصفہانی کو پہنچی جو ایک ارمنی سوداگر تھا تو وہ اس کو انگلستان سے خرید لایا اور اسے ایمسٹرڈم میں ایک گرانقدر نفع لے کر بیچ دیا۔

جنوری 1778ء میں اسے امیر اورلاف نے روسی ملکہ کیتھرائن دوم (دور حکومت 1762-1796ء) کے لیے خرید لیا۔ ملکہ اس سے ناراض تھی اور وہ اس کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ امیر اورلاف نے خواجہ رافیل کو اس کی قیمت ساڑھے تیرہ لاکھ روپے نقد اور 5 ہزار روپیہ ماہوار تاحیات پنشن ادا کی۔ ملکہ اس ہیرے کو پا کر بہت خوش ہوئی اور عصائے شاہی میں اس کو جگہ دی۔ اس وقت سے اس ہیرے کا نام ''الماس اورلاف'' ہو گیا۔

جب روس میں انقلاب آ گیا تو تمام شاہی جواہرات کے ساتھ یہ ہیرا بھی گم ہو گیا اور اس کا سراغ نہ ملا۔ جب جوہریوں نے کوہ نور کی سپاٹ سطح کا ملاحظہ کیا تو ان کو خیال گزرا کہ اس قسم کی سطح صرف کاٹ کر حاصل کی جا سکتی ہے اور یہ کہ اس قسم کا دوسرا ٹکڑا بھی دنیا میں موجود ہے۔ چونکہ بڑے بڑے ہیروں کا دنیا میں سب کو پتہ ہوتا ہے اس لیے اس کے دوسرے ٹکڑے کی تلاش شروع ہوئی۔ چنانچہ روس میں الماس اورلاف مکمل طور پر کوہ نور کا تراشیدہ حصہ ثابت ہو گیا اور اس کا اصل نام کوہ طور بھی مل گیا۔ اسی طرح تیسرا ٹکڑا بھی شاہ ایران کے خزانوں سے دستیاب ہو گیا اور اس طرح یہ ہیرا مکمل ہو گیا۔

وادی کشمیر

(Kashmir Valley)

براعظم ایشیا کا دل اور جنت

دنیا میں اگر کسی پہاڑی وادی کو مکمل اور بے نظیر کہا جاسکتا ہے تو وہ کشمیر کی وادی ہے۔ یہ وادی ہمالیہ کے جنوب میں ریاست جموں و کشمیر میں واقع ہے۔ ریاست جموں و کشمیر برصغیر پاک و ہند کے انتہائی شمال میں اور جنوبی ایشیا کے عین وسط میں واقع ہے۔ اس لحاظ سے اسے ''ایشیا کا دل اور جنت'' کہا جاسکتا ہے۔

کشمیر کی ریاست بھارت کے شمال مغرب اور پاکستان کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ ریاست کے شمال میں عوامی جمہوریہ چین اور افغانستان۔ مشرق میں چینی تبت۔ جنوب میں بھارت اور پاکستان۔ مغرب میں پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ اور افغانستان واقع ہے۔

کشمیر حسن و خوبصورتی کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہاں بلند و بالا پہاڑوں کے کئی سلسلے ہیں جن میں کوہ ہمالیہ اور قراقرم قابل ذکر ہیں۔ وادی کشمیر جو شمال مشرق سے ہمالیہ کی برف پوش پہاڑیوں سے گھری ہے اور اس کے جنوب مغرب میں پیر پنجال ہے۔ کشمیر کا 80 فیصد رقبہ پہاڑی ہے جس کی زمین نہایت زرخیز ہے۔ یہاں بے شمار حسین و خوبصورت باغات ہیں۔ شالامار باغ جھیل ڈل کے آخری کنارے پر واقع ہے۔ یہ نہروں،

پھولوں، بارہ دریوں اور فواروں کی وجہ سے انتہائی خوبصورت ہے۔

جنت نظیر وادی کشمیر میں پانی کی فراوانی ہے۔ یہاں خوبصورت جھیلوں کا جال بچھا ہوا ہے جن کی تعداد سترہ ہے۔ یہ جھیلیں دریائے جہلم سے پانی حاصل کرتی ہیں۔ دو ننھے ننھے جزیرے روپ لنکا اور سلونا لنکا اس کے قدرتی حسن میں چار چاند لگا رہے ہیں۔ اس کے قرب و جوار میں تخت سلیمان، شاہی چشمہ اور نشاط باغ واقع ہیں۔ خطہ کشمیر کا حسن بے مثال پہاڑوں اور اس کی وادیوں کی وجہ سے ہی ہے۔ اس خطہ میں آتش فشاں کے بھی بڑے سلسلے ہیں۔ یہ درختوں سے بھرا ہوا ایک دلکش علاقہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق کشمیر کے گیارہ ہزار مربع میل علاقے پر جنگلات ہیں۔ اس میں آبنوس کے درختوں کے جھنڈ ہیں۔ ان کے علاوہ اخروٹ، سفیدہ اور بید مجنوں کے درختوں کی کثرت ہے۔ 11,800 فٹ سے زیادہ بلندی پر پستہ قد صنوبر۔ ایک خوشبودار بیل پائی جاتی ہے۔

موسمی لحاظ سے بھی کشمیر کی آب و ہوا بہت خوشگوار ہے۔ مجموعی طور پر یہ علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ یہاں گندم اور چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ وادی میں کئی اقسام کے پھل بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں کشمیر کا سیب بہت مشہور ہے۔

ریاست کے بڑے دریاؤں کی تعداد 8 ہے جبکہ ان کے چھوٹے معاون دریاؤں کی تعداد 36 ہے۔ معاون دریاؤں کو ندی کہتے ہیں۔ دریائے جہلم سری نگر سے ہوتا ہوا پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔ دریائے سندھ بھی کشمیر کے راستے پاکستان میں داخل ہوتا ہے۔

رقبے کے لحاظ سے ریاست جموں و کشمیر براعظم پاک و ہند کی سب سے بڑی ریاست ہے۔ اس کا رقبہ مختلف ادوار میں مختلف رہا ہے۔ 1941ء کے اندازے کے مطابق کشمیر کا رقبہ 86,163 مربع میل ہے۔ بعض ماہرین نے اس کا رقبہ 84,471 مربع میل بتایا ہے۔ اس میں صوبہ جموں کا رقبہ 12,378 مربع میل۔ صوبہ کشمیر 8539 مربع میل اور سرحدی صوبہ کا رقبہ 63,554 مربع میل ہے۔

جموں و کشمیر بنیادی طور پر چار خطوں پر مشتمل ہے (1) جموں۔ (2) کشمیر۔ (3) لداخ۔ (4) گلگت وبلتستان۔ ان کا کل رقبہ 2 لاکھ 22 ہزار 236 مربع کلومیٹر ہے۔ کل رقبے میں سے 78,114 مربع کلومیٹر پاکستان کے پاس جبکہ 37,555 مربع کلومیٹر علاقہ چین کے پاس

ہے۔ اس میں وہ 5,180 مربع کلومیٹر کا اضافی علاقہ شامل نہیں ہے جو پاکستان نے 1963ء میں چین کے ساتھ اپنی سرحد متعین کرتے وقت اس کے حوالے کر دیا تھا۔ بقیہ ایک لاکھ 13 ہزار 87 مربع کلومیٹر رقبہ بھارت کے زیر قبضہ ہے۔ پاکستان کے زیر کنٹرول رقبہ 33,998 مربع میل ہے۔

ریاست کی سرحدوں کی کل لمبائی 2019 میل ہے جس میں سے 750 میل چین کے ساتھ۔ 902 میل پاکستان کے ساتھ۔ 317 میل بھارت کے ساتھ اور 50 میل افغانستان کے ساتھ ملتی ہے۔ افغانستان کے ساتھ ملنے والی 50 میل سرحد دراصل واخان کی پٹی ہے جو کشمیر کو وسط ایشیا کے ملک تاجکستان سے جدا کرتی ہے۔ اس پٹی کو 1890ء میں روسی اور برطانوی سامراج نے ایک معاہدے کے تحت افغانستان کے ساتھ شامل کیا تھا تاکہ زار روس کی افواج کو کشمیر اور ہندوستان کی طرف پیش قدمی سے روکا جا سکے۔ اس طرح اس پٹی کی حیثیت ایک ''بفرزون'' کی تھی۔ اس پٹی کی چوڑائی بعض مقامات پر صرف 10 میل ہے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان قائم لائن آف کنٹرول (LOC) کی کل لمبائی 1001 کلومیٹر ہے۔

1991 میں ریاست کی آبادی ایک کروڑ 16 لاکھ تھی۔ 2002ء میں جموں و کشمیر کی کل آبادی کا تخمینہ ایک کروڑ 34 لاکھ لگایا گیا جس میں مسلمانوں کی آبادی 98 لاکھ ہے۔ آبادی کے تناسب سے دیکھا جائے تو بھارت کے زیر قبضہ علاقوں میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ وادی کشمیر میں مسلمان اکثریت میں ہیں جبکہ جموں میں ہندوؤں کو اکثریت ہے۔

پاکستان کے زیرانتظام کشمیر کے شمالی علاقوں کے اضلاع دیامیر، بلتستان اور گلگت ہیں جبکہ آزاد کشمیر کو مظفر آباد، کوٹلی، میرپور، بھمبر، راولاکوٹ، سدھنوتی اور باغ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بھارت کے زیر قبضہ دو صوبے جموں اور وادی کشمیر ہیں۔ جموں صوبے کو چھ اضلاع جموں، کٹھوعہ، پونچھ، راجوڑی، ادھم پور اور ڈوڈہ جبکہ وادی کشمیر صوبے کو بھی چھ اضلاع سری نگر، بڈگام، پلوامہ، اسلام آباد (اننت ناگ)، کپواڑہ اور بارہ مولا میں تقسیم کیا گیا ہے۔

❁ ❁ ❁

فلسطین

(Palastine)

انبیاء کی مقدس سرزمین

فلسطین ''سرزمین انبیاً'' کہلاتی ہے۔فلسطین کی مقدس زمین بحیرہ روم کے انتہائی مشرقی حصے کے آخر میں واقع ہے۔اس کے شمال میں لبنان اور مشرق میں شام اور اردن ہیں جبکہ جنوب میں صحرائے سینا واقع ہے۔مقدس سرزمین رقبے میں بہت چھوٹی ہے۔اس کا کل رقبہ 14 ہزار مربع کلومیٹر ہے مگر پھر بھی اس نے انسانی تاریخ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔
فلسطین یونانی لفظ ''Palaistina'' سے ماخوذ ہے۔اسے عبرانی میں پلیشٹ (Pleshet) کہا جاتا تھا جس کے معنی ہیں ''فلسطینیوں کا وطن''

عہد قدیم میں یہاں یہودیہ (Judaea) اور سامریہ (Samaria) کی حکومتیں قائم ہو گئیں تھیں۔مصر کا شمال مشرقی ساحلی علاقہ کسی زمانے میں ''فلسطیا'' (Philistia) کے نام سے جانا جاتا تھا۔دوسری صدی قبل مسیح میں رومی شام کے جنوبی حصے کو ''سیریا پلسٹینا'' (Syria Palestina) کہتے تھے۔

فلسطین وہ سرزمین ہے جس پر تقریباً تمام قومیں وقتاً فوقتاً قابض رہیں۔مصر، اسیریا، بابل، فارس، یونان، روم اور بازنطین کے شہنشاہ اس علاقے پر خاصی مدت حکومت کرتے رہے۔بیت المقدس، امت مسلمہ کا قبلہ اوّل۔سرورِ کائنات حضرت محمدؐ کی معراج کی

پہلی منزل، شہر داؤد، شہر حضرت سلیمانؑ، تین عظیم مذاہب کی سرزمین۔ شہر مسیحؑ اور طالوت کے بعد جہاں بنی اسرائیل نے حضرت داؤدؑ کو اپنا بادشاہ بنایا اور انہوں نے اسرائیلیوں کی 2 لاکھ 80 ہزار فوج کے ساتھ حملہ آور ہو کر القدس شہر کو فتح کیا اور صہیون کی پہاڑی پر جشن منایا۔ یہ بیت المقدس کی ایک پہاڑی ہے جسے یہودی مقدس سمجھتے ہیں اور یروشلم کو ''دخترِ صہیون'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

پیغمبروں کی زمین اور حضرت یسوع المسیح کی جنہوں نے اپنی دائمی تعلیم اور قانون کی وجہ سے انسان کو ایک راہ راست دکھائی۔ یہودیوں کے لیے یہ زمین تورات کی زمین ہے جس میں ان کے سنہری ماضی کی یادیں ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ وہ مقدس سرزمین ہے جہاں سے حضور نبی کریمؐ معراج پر تشریف لے گئے۔

ماہر اثریات کے مطابق اس مقدس زمین پر تقریباً 9000 قبل مسیح میں سب سے پرانی قوموں نے بسنا شروع کیا۔ مگر اس کی تاریخ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں لکھی جانے لگی۔

1950 قبل از مسیح میں حضرت ابراہیمؑ میسوپوٹیمیا (عراق) کے شہر ''ار'' سے کنعان پہنچے۔ 1250 قبل مسیح میں حضرت یشوع نے دریائے اردن کو پار کیا اور کنعان کی زمین فتح کی اور پھر اسے 12 قبیلوں میں تقسیم کیا۔ 1200 قبل مسیح میں فلسطینیوں نے کریتے سے فلسطین پر ہلہ بولا اور پھر کنعان کی زمین انہی کے نام سے پہچانی جانے لگی۔

1025 قبل مسیح میں ساؤل اسرائیل کا پہلا بادشاہ بنا۔ 1004 قبل مسیح میں حضرت داؤدؑ نے اسرائیل کے بادشاہ کی حیثیت سے تخت سنبھالا۔ حضرت داؤدؑ نے مقامی یبوسیوں کو شہر بدر کر دیا اور پورے فلسطین پر حکمرانی کرنے لگے۔ حضرت داؤدؑ کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہو کر آس پاس کی سلطنتیں متحد ہو کر فلسطین پر حملہ آور ہوئیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ یروشلم تک پہنچتیں وادی ریفائم میں شکست کھا کر پسپا ہو گئیں۔ اس شکست کے بعد فلسطین میں حضرت داؤدؑ کی حکومت اور مضبوط و مستحکم ہو گئی اور انہوں نے بالائی وزیریں شہر کو ملا کر ایک کر دیا۔ شہر کے گرد ایک فصیل تعمیر کرائی اور یوں مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے بنی اسرائیل ایک مرکز پر مجتمع ہو کر ایک قوم بن گئے۔

مصر سے فلسطین آتے ہوئے حضرت موسیٰؑ تابوت سکینہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس تابوت میں حضرت یوسفؑ کا پیراہن اور ہڈیاں تھیں۔ حضرت موسیٰؑ اسرائیلیوں کو شکست دے کر یہ تابوت اشدود شہر لے گئے تھے۔ حضرت داؤدؑ کی خواہش تھی کہ وہ تابوت سکینہ کے لیے ایک عظیم ہیکل (معبد) تعمیر کرائیں۔ اتنا ہی عظیم والشان ہیکل جتنا کہ وہ پیغمبر عظیم اور حسین وجمیل تھا یعنی حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ نے اس ہیکل کی تعمیر کے لیے سونا، چاندی اور قیمتی پتھر فراہم کیے۔ کنعان (لبنان) سے دیودار کی لکڑی منگوائی۔ لیکن حضرت داؤدؑ یہ ہیکل تعمیر نہ کرا سکے کیونکہ 965 قبل مسیح میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حضرت داؤدؑ کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے فوراً ہی ایسا ہیکل تعمیر کرایا جیسا کہ ان کے والد نے سوچا تھا اور اس معبد کا خاکہ اپنے بیٹے کو سمجھایا تھا۔ اس معبد کو ''ہیکل سلیمانی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی تعمیر 7 سال تک جاری رہی۔ دو لاکھ مزدور و معمار دن رات مسلسل کام کرتے رہے۔ یہ ہیکل یا معبد بالکل اسی جگہ تعمیر ہوا جہاں حضرت داؤدؑ اسے تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ کتاب ''سلاطین بائبل'' کے مطابق یہ ہیکل فن تعمیر کا ایک عظیم شاہکار تھا۔

اس معبد کے بعد حضرت سلیمانؑ نے ایک عظیم الشان محل ''کاخ سلیمان'' بھی تعمیر کرایا۔ اس کی شان وشوکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ماکولات ومشروبات کے برتن اور فرنیچر تک سونے اور چاندی کا تھا۔ محل میں خادموں اور کنیزوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یمن کی ملکہ سبا بلقیس اسی محل میں اپنی سپاہ عظیم کے ساتھ شاہانہ طمطراق سے داخل ہوئی تھی۔ ملکہ سبا کے کارواں میں سینکڑوں اونٹ ایسے تھے جن پر فقط عطریات وخوشبویات لدی ہوئی تھیں جن کی تعطریت وعنبریت سے بیت المقدس کی فضائیں مہک اٹھیں۔ اس ملکہ کو کاخ سلیمان میں دعوت حضرت سلیمانؑ نے دی تھی۔

کاخ سلیمان میں ایک ایسا شیش محل بھی تھا جسے شیشے کا طلسمات کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ شیشہ گروں اور شیشہ سازوں نے کچھ ایسی مہارت اور کاریگری سے کام لیا تھا کہ جب ملکہ سبا بلقیس اس میں سے گزریں تو طلسم شیشہ گری سے مسحور و مسخر ہو کر رہ گئیں۔ ان کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں سے گزر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے زرتار لبادے کو پنڈلیوں تک

اوپر اٹھا لیا۔ کیونکہ انہیں کپڑے بھیگنے کا اندیشہ تھا حالانکہ وہ پانی نہیں تھا محض طلسم شیشہ گری تھا۔ ملکہ سبا بلقیس اپنے ساتھ بے بہا سونا اور بیش قیمت جواہرات لائی تھیں۔

حضرت سلیمانؑ نے شہر پناہ کو مزید مضبوط اور وسیع کیا کہ ہیکل عظیم کی پہاڑی بھی اس کے حصار میں آ گئی۔ شہر کو پانی کی فراہمی کے لیے دور وادیوں سے نہریں کھودی گئیں۔ چشمے اور تالاب بنائے گئے۔ ان میں سے ''کنواری کا چشمہ'' عہد سلیمانی کی یادگار ہے۔ اس عہد کی یادگار جس میں سلطنت بنی اسرائیل اپنے عروج پر تھی۔

953 قبل مسیح اور 930 قبل مسیح کے دوران اسرائیل سلطنت دو حصوں جنوبی اور شمالی حصوں میں منقسم ہو گئی۔ جنوبی سلطنت ''یہودہ'' میں جنوبی فلسطین اور روم شامل تھا اور اس کا پایہ تخت یروشلم یعنی بیت المقدس تھا۔ جبکہ شمالی سلطنت ''اسرائیل'' شمالی فلسطین اور مشرق اردن پر مشتمل تھی۔ جنوبی سلطنت کا حکمران ابعام بن سلیمان اور شمالی سلطنت کا حاکم ''یربعام'' تھا۔ 922 ق م میں حضرت سلیمانؑ کا انتقال ہوا۔

اس دور میں بنی اسرائیل فحاشی، بے حیائی، حرام کاری، عیش پرستی، بت پرستی، اصنام پرستی اور اغلام بازی میں مبتلا ہو گئے۔ ان میں لوطی بھی تھے جو آستینوں میں بت چھپائے پھرتے تھے۔ یہ دیو مالائی یونانی دیوی دیوتاؤں کی طرح اپنی مورتیوں سے محیّر العقول روائتیں اور داستانیں منسوب کرتے تھے اور خدا کی کتاب توریت اور زبور میں ردوبدل کرنے لگے تھے۔ دونوں سلطنتوں یعنی یہودہ اور اسرائیل کی رعایا مدت تک آپس میں برسرِ پیکار رہی اور خود آپ ہی اپنی تباہی کا باعث بنی۔

بنی اسرائیل کو باہم متصادم و متحارب دیکھ کر فلسطینیوں نے یروشلم پر حملہ کیا۔ ہیکل سلیمانی سے سونا، چاندی اور جواہرات لوٹ لیے اور ان کے بیوی بچے قیدی بنا لیے گئے۔ 721 ق م میں اسوریوں نے سامریہ پر قبضہ کیا اور شمالی بادشاہت کے 10 قبائل کو اسیر بنا لیا یوں اسرائیل کی بادشاہت ختم ہوئی۔

حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کے قریباً 400 سال بعد 587 یا 598 ق م میں بابل (عراق) کے بادشاہ بخت نصر نے قوم یہود کو تباہ کرنے کے عزم سے فلسطین پر فوج کشی کی۔ اس نے ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ فاتح کی حیثیت سے وہ شہر میں داخل ہوا۔ اس نے

شہر کو آگ لگا کر قتل عام شروع کر دیا۔ یروشلم جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اس تباہی کے دوران بخت نصر ہیکل میں موجود تابوت سکینہ بھی اٹھا کر لے گیا جس کا پھر سراغ نہ مل سکا۔ بخت نصر نے یہودیوں کے تمام صحیفے نذر آتش کر دیئے۔ ایک لاکھ سے زائد مرد و زن قیدی بنا لیے۔ بعد میں ان یہودیوں کو بابل میں دریائے فرات کے کنارے آباد کیا گیا اور اس بستی کا نام ''تل ابیب'' رکھا گیا۔ اسرائیل کا موجودہ شہر اسی تل ابیب کی یاد تازہ کرتا ہے۔

یروشلم تباہی کے بعد 50 برس تک کھنڈر بنا رہا۔ یہودی زائرین یہاں آتے اور یروشلم کے کھنڈرات پر بیٹھ کر روتے پیٹتے اور اسرائیل کی واپسی کی دعائیں کرتے۔ اس دور غلامی میں حضرت دانیال اور عزیز یہودیوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ ''زرمابل'' جو حضرت داؤدؑ کی نسل سے تھا صیہونیت کی پہلی تحریک آزادی و آبادی کا محرک بنا۔ اس صیہونی تحریک کا مقصد کھوئی ہوئی صیہونی ریاست یروشلم کو دوبارہ حاصل کرنا اور ہیکل سلیمانی کی پھر سے تعمیر کرنا تھا۔

536-539 ق م میں ایران کے شہنشاہ خسرو پرویز (کسریٰ) نے جس کا نام بائبل میں خورس درج ہے بابل کو فتح کیا اور یہودیوں کو دوبارہ یروشلم واپس جانے کی اجازت دے دی اور ہیکل زربابل کی دوبارہ تعمیر کی۔ 334 ق م میں سکندر اعظم نے فلسطین کو فتح کیا۔ روایت ہے کہ سکندر اعظم کا انتقال بھی فلسطین میں ہوا اور اس کی لاش سونے کے تابوت میں بند کر کے اسکندریہ شہر (مصر) بھیجی گئی۔

سکندر کے بعد مصر کے ٹولمیز قابض ہوئے۔ 203 قبل مسیح میں شام کے انطوخیوس اعظم ثانی نے یروشلم پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا جبکہ 198 قبل مسیح میں انطوخیوس سوم نے باقاعدہ مصریوں کو شکست دی اور فلسطین سلیوسیڈیز کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اسی دوران سکندریہ کے جرنیل سکوپس نے یروشلم پر قابض ہونے کی کوشش کی لیکن انطوخیوس کے جوابی حملے نے اسے شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

175 ق م میں انطوخیوس چہارم بادشاہ بنا۔ اس نے یہوداہ کی عبادت ختم کروا دی اور ہیکل میں سؤر کی قربانی چڑھا کر اس کی بے حرمتی کی۔ 170 ق م میں اپی فین نے یروشلم کو تباہ و برباد کیا تو یونانیوں کے ظلم و ستم کے نتیجہ میں مکابی تحریک نے جنم لیا۔ مکابی ایک کاہن تھا

جس نے یونانیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے کامیابی حاصل کی۔ اس نے ہیکل سلیمانی کی حرمت کو بحال کیا اور اس کا جشن منایا۔ اس جشن کی یاد یہودی آج بھی ''عید ہنوکہ'' کی صورت میں مناتے ہیں۔

167 ق م میں یہودیوں نے ایک بزرگ استاد میتھیاس اور اس کے بیٹوں سے مل کر سلیوسیڈیز کے خلاف بغاوت کی اور انہیں شکست دی۔ اس کے بعد یروشلم کی تاریخ کا وہ دور شروع ہوا جس میں ہیروڈ اعظم کے عہد میں بیت المقدس کو وہ عظمت دوبارہ حاصل ہوگئی جو اسے عہد سلیمانی میں حاصل تھی۔

اسی شہنشاہ ہیروڈ اعظم کے دربار کی شعلہ نوا اور شعلہ بدن رقاصہ سلومی تھی جو یرمیاہ نبی یعنی حضرت یحییٰؑ پر دل و جان سے فریفتہ تھی۔ اس نے حضرت یحییٰؑ کو برائی پر آمادہ کرنا چاہا تو آپ نے انتہائی نفرت سے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور اسے نیکی کا راستہ دکھانا چاہا۔ مگر اس رقاصہ نے پیغمبر سے اپنی محبت کے ٹھکرائے جانے کا انتقام لیا۔ یہ ہیروڈ اعظم کی منظور نظر محبوبہ تو تھی ہی۔ چنانچہ اس نے ورغلا بہکا کر اسے قتل پیغمبر پر آمادہ کیا۔ ہیروڈ اعظم نے فوری طور پر حضرت یحییٰؑ کا سر کاٹنے کا حکم دے دیا۔ جب پیغمبر کا کٹا ہوا سر ایک طشتری میں سلومی کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے پیغمبر کے ہونٹوں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا: ''مغرور و خود سر انسان، اپنی زندگی میں جن ہونٹوں کو تو نے اپنے ہونٹوں کے قریب نہ آنے دیا۔ دیکھ آج وہی ہونٹ تیرے ہونٹوں کو چومتے ہوئے تیری خودسری پر ہنس رہے ہیں۔''

حضرت عیسیٰؑ اسی قاتل شہنشاہ ہیروڈ اعظم کے عہد میں تقریباً 1 یا 4ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اہل روم کا باجگزار تھا اور یہ یہودی نہیں بلکہ رومی تھا لیکن یہودیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے راہب اعظم (کاہن اعظم) کی بیٹی سے شادی کر کے اس نے ہیکل سلیمان کی از سر نو تعمیر کی۔

63 قبل مسیح میں روسی جرنیل پوپیائی نے یہودیوں پر حملہ کر کے دوبارہ تعمیر شدہ ہیکل سلیمانی تباہ کر دیا۔ 40 ق م میں پارتھیوں نے اچانک رومیوں پر حملہ کر کے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ایک سال بعد 39 ق م میں ہیروڈ اعظم نے پارتھیوں کو نکال باہر کیا۔ ہیروڈ نے 4ء تک حکومت کی۔

حضرت عیسیٰؑ 12 برس کی عمر میں بیت المقدس آئے اور خدا کا نبی ہونے کا دعویٰ کیا لیکن ان لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلایا اور ان پر تشدد کیا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کئی بار ناصرہ سے بیت المقدس آئے۔

حضرت عیسیٰ ابن مریم بغیر باپ کے حکم خداوندی سے پیدا کیے گئے۔ آپؑ نے بنی اسرائیل کو راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ خدا کے اس سچے نبی پر ایمان نہ لائے اور آپؑ کی تعلیمات کا بنی اسرائیل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ وہ آپؑ کی جان کے دشمن بن گئے۔ اس بناء پر حضرت عیسیٰؑ نے خود کو پوشیدہ کر لیا تو ایک شخص یہودا السکر یوتی نے دولت کے لالچ میں آ کر حضرت عیسیٰؑ کی نشاندہی کی تا کہ وہ پکڑے اور مصلوب کر دیئے جائیں۔ یہودہ السکر یوتی بھی یہودی تھا۔ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے شاگردوں کا لباس چونکہ ایک سا تھا لہٰذا یہودیوں کو یہ پہچان کرنے میں دقت ہو رہی تھی کہ ان میں حضرت عیسیٰؑ کون سے ہیں۔ ان کو کسی کی ضرورت تھی جو حضرت عیسیٰؑ کی نشاندہی کر سکے۔ چنانچہ یہ کام بھی یہودہ السکر یوتی نے کیا اور کہا کہ ''میں جس شخص کے ہاتھ کا بوسہ لوں گا وہی حضرت عیسیٰؑ ابن مریم ہوگا۔'' اسی کی نشاندہی پر حضرت عیسیٰؑ پکڑے گئے۔ اس کے بعد آپؑ کو مصلوب کیا گیا لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپؑ کو مصلوب ہونے سے پہلے ہی زندہ اٹھا لیا گیا یہ 33ء کا واقعہ ہے۔

66ء میں فلسطین کے یہودیوں نے صیہونیوں سے مل کر رومن بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ 70ء میں طیطس نے یہودیوں کی اس بغاوت کو کچلا اور یروشلم کو پورا تباہ کر دیا۔ 130ء اور 135ء کے دوران یہودیوں نے دوسری مرتبہ کوکبا کی قیادت میں بغاوت کی۔ بغاوت پھر کچل دی گئی۔ ہائیڈرین جس نے یروشلم کو تباہ کیا تھا دوبارہ اسے رومی شہر بنایا اور پھر اسے ''عالیہ کیپٹولینا'' کا نام دیا۔

330ء سے 634ء تک فلسطین بازنطینی سلطنت کے ماتحت رہا۔ یہ قسطنطنیہ کے مسیحی تھے جس کے باعث یہاں عیسائی مذہب پھیلا اور بہت سے چرچ تعمیر ہوئے۔ 614ء میں اہل فارس نے فلسطین پر حملہ کیا اور بہت سارے مسیحی قتل کر دیئے گئے جبکہ سینکڑوں گرجا گھر جلا دیئے گئے۔

مسلمانوں کے لیے فلسطین ایک مقدس مقام ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے

معراج پر تشریف لے جانے سے قبل اس جگہ جملہ انبیاء کی امامت فرمائی اور تمام انبیاء کرام سے مصافحہ کیا اور معراج سے واپسی پر اسی جگہ کو پہلی منزل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ہجرت کے 17 ماہ بعد تک مسلمان اسی جگہ یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ یوں ملت اسلامیہ کے لیے یہ تیسرا مقدس ترین مقام ہے۔

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد مبارک کے دوران 636ء (16یا17ھ) میں بیت المقدس فتح ہوا تو یہ پورا خطہ اسلامی قدروں سے پھر آشنا ہوا۔ بندہ و آقا کے درمیان امتیازات مٹ گئے۔ 638ء میں حضرت عمر فاروقؓ نے خود یہاں تشریف لا کر ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر فرمائی۔ انہوں نے یہودیوں کو مسلسل سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یروشلم سے نکال دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں فتح عسقلان کے ساتھ ہی فلسطین کی فتح مکمل ہوگئی۔ مسلمان نے اسے علیحدہ صوبہ بنا کر اس کا نام ''جند فلسطین'' (فلسطین کا فوجی ضلع) رکھا اور اس کا صدر مقام قیساریہ سے ''لد'' منتقل کر دیا۔ بعدازاں رملہ شہر نے لد کی جگہ لی۔ اسے سلیمان بن عبدالملک نے ان دنوں آباد کیا تھا جب وہ فلسطین کے گورنر تھے۔ یہ اموی خاندان کے حکمران تھے۔

اموی دور 750ء میں ختم ہوا تو شام اور فلسطین عباسیوں کے زیرنگین آ گئے۔ 9ویں صدی عیسوی میں عباسی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں خودمختار ہو گئیں۔ مصر کے طولونی حکمران (عہد حکمرانی 868ء تا 905ء) شام اور فلسطین پر حکومت قائم کر کے عباسی سلطنت سے علیحدہ ہو گئے۔ اسی دور میں قرامطہ کا فتنہ اٹھا جس نے امت مسلمہ میں کافی تباہی مچائی۔ عباسیوں نے فلسطین پر دوبارہ اقتدار قائم کیا جو 935ء سے 969ء کے مختصر عرصہ کے لیے تھا۔ 969ء میں مصر میں فاطمی برسراقتدار آئے اور انہوں نے دس برسوں کے اندر شام اور فلسطین اپنے قبضے میں لے لیے۔

1009ء میں فاطمی خلیفہ ابومنصور العزیز اورعیسائیوں کے درمیان طویل لڑائیاں شروع ہوئیں جو تاریخ میں کروسیڈز (صلیبی جنگیں) کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ 1099ء میں یورپی عیسائیوں نے فاطمیوں سے بیت المقدس چھین لیا اور ایک بار پھر یروشلم میں لاطینی حکومت تشکیل دے دی گئی۔

کچھ عرصہ یہاں عیسائیوں کی حکومت قائم رہی۔ بالآخر 4 جولائی 1187ء کو حطین کے فیصلہ کن معرکے کے بعد عظیم مجاہد سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کو آزاد کرا کے عیسائی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ ایوبی نے یہاں ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت قائم کی۔ 1263ء میں مصر کے مملوک سلطان نے کروسیڈرز کے خاص علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

1400ء میں منگول قبائل ٹامرلین کی قیادت میں فلسطین پر حملہ آور ہوئے۔ اس طرح یہاں تعمیر و تخریب کا سلسلہ جاری رہا۔ 1516ء میں عثمانی خلیفہ سلطان سلیم اوّل کے دور میں فلسطین کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا گیا۔ اگلے 400 سال تک یہ خلافت عثمانیہ کا ایک صوبہ بنا رہا۔ ترکوں نے یہاں ایک شاندار اور اسلامی حکومت تشکیل دی۔

سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہوا تو یورپ کی مفاد پرست طاقتوں نے اس کا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے بیت المقدس میں کئی قونصل خانے قائم کیے۔ فرانسیسی، روسی اور جرمن آباد کاروں نے جن کی اکثریت یہودیوں پر مشتمل تھی یہاں کئی بستیاں تعمیر کیں۔

1887ء میں تمام یہودیوں نے مل کر ایک عالمی صہیونی کانفرنس بلائی جس میں کیے گئے فیصلوں کے مطابق اس جگہ قبضہ اور تسلط سے قبل عالمی معیشت، سیاست، میڈیا اور فوج میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کنٹرول حاصل کیا جائے پھر ایک خاص منصوبہ کے تحت خلافت عثمانیہ کو ختم کیا جائے اور اس جگہ یہودیوں کی ایک ریاست (اسرائیل) قائم کی جائے تاکہ بیت المقدس پر مکمل قبضہ آسانی سے ہو سکے۔ 1896ء میں ایک یہودی تھیوڈور ہرزل نے ایک کتاب ''یہودی مملکت'' تحریر کی۔ جس میں واضح طور پر فلسطین میں ایک یہودی ملک بنانے کی بات کی گئی تھی۔ 1882ء اور 1903ء کے دوران عثمانی ترکوں نے یہودیوں کو پہلی دفعہ دوبارہ فلسطین کے علاقے میں آباد ہونے کی اجازت دی۔ روس سے کثیر تعداد میں یہودی ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔

پہلی جنگ عظیم (1914-17ء) کے دوران خلافت عثمانیہ کو شکست ہوئی اور ایک خاص سازش کے تحت مسلمان ریاستوں کو بکھیر دیا گیا۔ جنگ کے بعد فلسطین برطانیہ کے زیر انتظام آ گیا۔ 2 نومبر 1917ء کو اعلان بالفور کے ذریعہ برطانیہ نے یہودیوں کو یقین دلایا کہ فلسطین میں الگ یہودی ریاست قائم کی جائے گی۔

9 دسمبر 1917ء کو برطانوی فوجیں بیت المقدس میں داخل ہوگئیں اور جنرل ایلن لی (Elen Lee) نے شہر کا گشت کرنے کے بعد اعلان کیا کہ آج صلیبی جنگوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ حکومت برطانیہ نے اعلان بالفور کو عملی شکل دینے کے لیے 1922ء میں مجلس اقوام (League of Nations) سے فلسطین کو اپنے زیرنگرانی رکھنے کی قانونی آڑ حاصل کر لی۔ اس طرح یہودیوں کو فلسطین میں بلا روک ٹوک داخلے کی اجازت مل گئی۔ 1919ء میں فلسطین میں یہودیوں کی تعداد 58 ہزار تھی جو 1941ء میں بڑھ کر 6 لاکھ 8 ہزار ہوگئی۔

دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر 1945ء میں یہودیوں نے اقوام متحدہ کے نام پر تنظیم بنا کر مستقبل کی فتوحات بھی حاصل کر لیں۔ 29 نومبر 1947ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد کے ذریعے فلسطین کو تقسیم کر کے ایک عرب اور ایک اسرائیلی ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا۔ برطانیہ نے فلسطین سے 1948ء میں اپنی افواج واپس بلا لیں اور 14 مئی 1948ء کو ''یہودی نیشنل کونسل'' نے ڈیوڈ بن گوریان کی قیادت میں اسرائیل کی ریاست قائم کر لی۔

نیویارک

(New Yark)

فلک بوس عمارتوں کا شہر

نیویارک کا شہر ایک وسیع، گنجان آباد، عروس البلاد امریکہ کی مشرقی بندرگاہ امریکہ کو ایک دولت مند اور طاقتور قوم بنانے میں ایک مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ دریائے ہڈسن کے دہانے اور خلیج نیویارک پر امریکہ کا سب سے بڑا اور دنیا کا تیسرا بڑا شہر جو دنیا کی مصروف ترین بندرگاہ بھی ہے۔ اس نام کی امریکہ میں ایک ریاست بھی ہے جس کا دارلحکومت البانی (Albany) ہے۔

یہ شہر بحراوقیانوس سے گزر کر براعظم امریکہ میں داخل ہونے کا مرکزی راستہ ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ شہر امریکہ کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ 1865ء سے 1900ء تک ایک کروڑ 32 لاکھ 60 ہزار غیر ملکی امریکہ میں داخل ہوئے اور ان میں سے زیادہ تر نیویارک کی بندرگاہ کے ذریعے امریکہ پہنچے۔

اس کی آبادی میں مختلف قوموں اور مختلف رنگوں کے 8 کروڑ وہ افراد بھی شامل ہیں جو ہجرت کر کے یہاں آئے۔ یہ شہر ہر قسم کے افراد تجارت پیشہ، وکلاء، سیاستدان، ادیب، آرٹسٹ اور جاز کے موسیقاروں کے لیے ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے اور وہ یہاں اپنی قسمت آزمانے اور دولت کمانے کا خواب لے کر آتے ہیں۔

نیویارک سٹی، ریاست نیویارک کی جنوب مشرقی سمت دریائے ہڈسن کے کنارے 945 مربع کلومیٹر (365 مربع میل) رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ پانچ حصوں مین ہٹن، برونکس، کیونیز، بروکلین اور اسٹین جزیرہ میں منقسم ہے۔ مین ہٹن کی سب سے مشہور افق کو چھوتی ہوئی اس کی کئی سومنزلہ وہ عمارتیں ہیں جو نیویارک کا دل ہیں۔

نیویارک کا شمار دنیا کے عظیم شہروں میں ہوتا ہے۔ نیویارک کو سب سے پہلے ولندیزی مہم جو ہنری ہڈسن نے 1623ء میں دریائے ہڈسن کے بعد دریافت کیا اور اسے نیوایمسٹرڈم کا نام دیا۔

1664ء میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور اسے شاہ چارلس دوم کے بھائی ڈیوک آف یارک کے نام پر نیویارک کا نام دیا۔ 1785ء سے 1790ء تک یہ شہر امریکہ کا دارالحکومت رہا۔ 1825ء میں اری کینال کے کھولے جانے کے بعد نیویارک کی تجارت اور صنعت نے تیزی سے ترقی کی۔

امریکہ کا یہ بہترین شہر دنیا میں بہترین تھیٹرز کا سب سے مشہور مرکز ہے۔ یہاں ٹائم سکوائر اور براڈوے کے تھیٹرز ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ یہاں کے گرینچ گاؤں کے فنکار اور فلمکار دنیا بھر میں پہچانے جاتے ہیں۔ وال اسٹریٹ امریکہ کا سب سے بڑا تجارتی مرکز ہے۔ اس شہر میں دو انٹرنیشنل ائرپورٹ ہیں اور یہ شہر سڑکوں اور ریل کے ذریعے ملک سے ملا ہوا ہے۔ یہ ریڈیو، ٹی وی، کتابوں اور اخبارات کا بھی مرکز ہے۔

مین ہٹن کی ٹھوس زمین پر بنی آسمان سے باتیں کرتی ہزاروں عمارتوں نے اسے ایک انوکھا رنگ دے دیا ہے۔ 500 فٹ سے زائد شمار کی گئی عمارتوں کی سب سے بڑی تعداد نیویارک میں ہیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ نیویارک انتہا پسندی اور تضادات کا شہر ہے۔ موسم گرما میں اس شہر کا درجہ حرارت بہت زیادہ ہوتا ہے اور یہاں بہت حبس ہوتا ہے جبکہ سردیوں میں یہاں شدید سردی پڑتی ہے۔

سماجی طور پر یہ دنیا کے بعض امیر ترین افراد کا وطن ہے جبکہ یہاں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو تنگ و تاریک علاقوں میں زندگی گزارتے ہیں۔

نیویارک کے مشہور ترین عجائب گھروں میں میٹرو پولیٹن میوزیم آف آرٹ،

امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری، میوزیم آف ماڈرن آرٹ، فریک کولیکشن، گوگیلم میوزیم اور بروکلین میوزیم شامل ہیں۔

یہاں آرٹ کا مرکز لنکن سینٹر دیکھنے کے قابل ایک ثقافتی ادارہ ہے۔ اس کی عمارتوں کے اردگرد ایک جھیل اور ایک فوارہ بڑا حسین منظر پیش کرتا ہے۔ اس میں میٹروپولیٹن اوپیرا، نیویارک سٹی اوپیرا، نیویارک فل پارمونک اور نیویارک سٹی بیلے ہے۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ نیویارک دنیا کا دلچسپ ترین اور رنگارنگ شہر ہے۔

❁ ❁ ❁

گولڈن گیٹ برج

(Golden Gate Bridge)

فنِ تعمیر کا ایک بے مثل شاہکار

امریکہ کے ساحلی شہر سان فرانسسکو (San Francisco) کا نام سنتے ہی نظروں میں گولڈن گیٹ برج کا عظیم الشان پل آتا ہے جسے اکثر ہالی وڈ کی فلموں کے مناظر میں بہت خوبصورتی سے دکھایا جاتا ہے۔ گولڈن گیٹ برج 20ویں صدی کے حیرت انگیز تعمیراتی کارناموں میں سے ایک ہے۔

ایک اعشاریہ دو میل لمبا یہ پل سان فرانسسکو کو میرین کاؤنٹی سے ملاتا ہے۔ امریکہ میں عظیم کساد بازاری کے دور میں تعمیر ہونے والے اس پل کو دنیا کا سب سے طویل سسپنشن (معلق) برج ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ 27 مئی 1937ء کو جب یہ پل پایہ تکمیل کو پہنچا تو اس منصوبے پر تنقید اور احتجاج کا طویل سلسلہ بند ہو گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اتنے بڑے منصوبے پر کثیر ملکی سرمایہ ضائع کیا جا رہا ہے۔ کچھ نے کہا کہ دنیا کی محفوظ ترین قدرتی بندرگاہ کو اس پل کی تعمیر سے نقصان پہنچے گا۔ یہ سلسلہ چار سال تک جاری رہا اور بالآخر اس کی تکمیل پر یہ تمام آوازیں اس عظیم انسانی کارنامے کو دیکھ کر دب گئیں۔

1937ء میں اس پل کی تکمیل سے قبل تک اس کی تعمیر کو ناممکن تصور کیا جاتا رہا۔ کیونکہ یہاں کے موسم میں مسلسل دھند رہتی ہے۔ 60 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائیں چلتی

رہتی ہیں اور یہاں سمندر کی موجیں بہت طاقتور ہیں لیکن ان تمام قدرتی مشکلات کے باوجود تقریباً ساڑھے چار سال کی مدت میں اسے تعمیر کرلیا گیا۔ اس پر 35 ملین ڈالر لاگت آئی اور گیارہ افراد اس کی تعمیر کے دوران ہلاک ہوئے۔ آج بھی اس پل کا بڑا حصہ گہری دھند میں لپٹا رہتا ہے۔ جب سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائیں چلتی ہیں تو یہ پل انہیں برداشت کرنے کے لیے 27 فٹ تک جھول جاتا ہے۔

پل کے ساتھ جو دو کیبلز لگی ہوئی ہیں ان میں 80 ہزار میل لمبی سٹیل وائر ہے جسے زمین کے ایکویڑ کے گرد تین دفعہ لپیٹا جا سکتا ہے۔ طوفانی لہروں میں پل کو مضبوط بنانے کے لیے جتنا کنکریٹ استعمال کیا گیا ہے اس سے نیویارک اور سان فرانسسکو کے درمیان 5 فٹ چوڑی سائیڈ وال تیار کی جا سکتی تھی۔ 27 مئی 1937ء کو اس پل کا افتتاح دو لاکھ سے زائد افراد نے اس پر چلتے ہوئے کیا۔ اگلے روز سرکاری طور پر اس پل کا نام گولڈن گیٹ برج رکھ کر ٹریفک کے لیے کھول دیا گیا۔

اس پل کی تعمیر کے لیے کوششوں کا آغاز 1928ء میں ہوا۔ جنوبی کیلی فورنیا کی چھ کاؤنٹیوں نے اس کے لیے کوششوں میں اپنا حصہ ڈالا۔ ان ریاستوں نے گولڈن گیٹ برج اینڈ ہائی وے ڈسٹرکٹ کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ 1930ء میں یہاں کے ووٹروں نے 35 ملین ڈالر کے بانڈ جاری کرنے کی منظوری دی تاکہ اس پل کی تعمیر کے لیے وسائل مہیا کیے جا سکیں۔ پل کا ڈیزائن انجینئر جوزف بائر مین اسٹراس نے اپنے دیگر معاونین کی مدد سے تیار کیا۔ اس پل پر عملی کام کا آغاز 5 جنوری 1933ء کو ہوا اور اسے ساڑھے چار سال کے عرصے میں مکمل کرلیا گیا۔ اس کی تعمیر کا سب سے مشکل مرحلہ جنوبی ٹاور کی تیاری تھا جس کے دوران کارکنوں کو بسا اوقات رسیوں پر لٹک کر اور اپنی جان پر کھیل کر کام کرنا پڑا تاکہ کنکریٹ کے اس مضبوط ٹاور پر پل کھڑا ہو سکے۔ پل کی تعمیر کے دوران سب سے بڑا حادثہ 17 فروری 1937ء کو اس وقت پیش آیا جب پورا ایک پلیٹ فارم جس پر انجینئرز کام کر رہے تھے ٹوٹ کر حفاظتی جال توڑتا ہوا نیچے جا گرا جس میں 10 افراد فوراً ہلاک ہو گئے۔ برج کے ایک ٹاور سے دوسرے ٹاور کا وزن 95 ملین ٹن ہے۔ یہ ٹاور 746 فٹ بلند ہیں۔ دو ٹاوروں کے درمیان کا فاصلہ جو کیبلز کو اٹھائے رکھتے ہیں۔ 4200 فٹ ہے۔ یہ کیبلز پل کے فرش کو سہارا دیتی ہے۔

گولڈن گیٹ برج دنیا بھر میں امریکہ کی مستند پہچان رکھتا ہے جسے شروع دن سے ہی انٹرنیشنل اورنج سے پینٹ کیا گیا ہے جو عام رنگ کی بجائے خصوصی طوز پر سرخ اور نارنجی رنگ ملا کر تیار کیا گیا ہے۔ اس رنگ کی بنیادی وجہ یہاں کا موسم ہے۔ گہرے کہر میں پل اور گاڑیوں کو دیکھنا مشکل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ رنگ کیا گیا۔ اس پر اوسطاً ایک لاکھ 25 ہزار کاریں روزانہ گزرتی ہیں جبکہ ساتھ میں بنے ہوئے فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں کے لیے یہ ایک حسین نظارہ پیش کرتا ہے۔ سان فرانسسکو میں سیاحوں کے لیے یہ جگہ بہت کشش رکھتی ہے۔ اس جگہ کو کئی فلموں میں انتہائی خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے جس سے اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔

❁ ❁ ❁

سی این ٹاور

(Canadian National Tower)

بلند ترین عمارتوں میں شامل فن تعمیر کا عظیم شاہکار

دنیا کے بلند ترین مقام پر بنی ہوئی گیلری سے زمین کا نظارہ نہ صرف انسانی دل کو فرط جذبات سے لبریز کر دیتا ہے بلکہ وہ ترقی کے اس شاہکار پر حیران و ششدر بھی رہ جاتا ہے۔ کینیڈا کے شہر ٹورنٹو کی بلند و بالا خوبصورت عمارتوں کے درمیان پروقار انداز میں کھڑا کینیڈین نیشنل ٹاور بھی دور جدید کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی بلندی 534 میٹر تک ہے۔

سیر وسیاحت کی غرض سے یہاں آنے والے ملکی و غیر ملکی سیاحوں کے لیے سی این ٹاور بہت کشش رکھتا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر سال یہاں مختلف ممالک سے 20 لاکھ افراد آتے ہیں۔ خصوصاً مشاہداتی گیلری میں جہاں طاقتور دوربینوں سے دیکھنے والے مناظر کسی حسین خواب کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں جدید سہولتوں سے مزین کشادہ گھومنے والے ہوٹل اور کمپلیکس بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

فروری 1973ء میں جب سی این ٹاور کی تعمیر شروع ہوئی تو کینیڈا کی حکومت نے اس کام کے لیے کسی انفرادی ادارے کی بجائے تعمیراتی شعبے کے ماہرین کی ایک باقاعدہ کمیٹی قائم کی جنہوں نے مختلف ممالک میں بنی ہوئی بلند ترین عمارتوں خصوصاً فرانس کے ایفل ٹاور

اور امریکہ کی ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کے علاوہ روس کے اوٹینکو ٹاور کا معائنہ کیا اور فن تعمیر کے ان عظیم شاہکاروں پر تکنیکی اعتبار سے ایک رپورٹ مرتب کی اور حکومت کو پیش کر دی۔ جس کے بعد سی این ٹاور کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا کہ یہ نہ صرف اپنے وقت کا بلند ترین ٹاور ہو بلکہ اس کی مضبوطی اور یہاں آنے والے سیاحوں کی سہولتوں، گنجائش اور تفریح طبع کا بھی انتظام ہو۔

سی این ٹاور کی سب سے زیادہ پر تجسس جگہ یہاں کی مشاہداتی گیلری ہے جسے "Sky Pod" کہا جاتا ہے۔ اس کی زمین سے اونچائی 447 میٹر (1465 فٹ) ہے۔ یہ گیلری جہاں طاقتور دوربینیں جو وقفے وقفے سے گھوم کر اپنے مناظر تبدیل کرتی ہیں دیکھنے والوں کو ایک بالکل انوکھا تجربہ فراہم کرتی ہیں۔ یہاں سے نہ صرف ٹورنٹو شہر کا نظارہ کیا جاتا ہے بلکہ اس سے ملحق 100 میل تک پھیلا ہوا علاقہ بھی بآسانی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے نیچے بنا ہوا خوبصورت ہوٹل ہے جو 351 میٹر (1151 فٹ) بلندی پر واقع ہے۔ اس گھومنے والے ہوٹل میں کھانا کھانے کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ کھانے کی ہر میز کو کچھ اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ شیشے کی بڑی دیواروں سے بدلتے مناظر دیکھ کر انسانی عقل ورطہ حیرت میں کھو جاتی ہے۔ کمزور دل والے سیاحوں کو یہاں آنے سے قبل خصوصی بریفنگ دی جاتی ہے۔

دنیا کی ہر بلند عمارت کی طرح جب اسے بنایا گیا تو ابتداء میں اس کے ڈیزائنر، آرکیٹکٹ انجینئروں اور دیگر متعلقہ شعبہ سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو بہت سی مشکلات پیش آئیں۔ کسی ایک کمپنی یا شخصیت کی بجائے حکومت نے ہر شعبے کے لیے ماہرین کی ٹیم کو اسے تعمیر کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ اس طرح سی این ٹاور کا کریڈٹ کسی فرد واحد کی بجائے پوری ٹیم ورک کا نتیجہ ہے۔

سی این ٹاور میں 6 لفٹیں لگائی گئیں جن کی رفتار 6 میٹر (20 فٹ) فی سیکنڈ ہے۔ اس طرح ٹاور کی انتہائی بلندی تک پہنچنے کے لیے صرف 58 سیکنڈ درکار ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ایک گھنٹے میں 1200 افراد ایک لفٹ سے چڑھتے اور اترتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

سائبیریا ریلوے لائن

(Siberia Railway Track)

دنیا کی طویل ترین ریلوے لائن

سائبیریا (روس) کے یخ بستہ پہاڑوں اور پرپیچ راستوں پر بچھائی جانے والی ریلوے لائن دنیا کی سب سے طویل ریلوے لائن ہے جو ہر روز باقاعدگی سے ہزاروں مسافروں اور لاکھوں ٹن تجارتی سامان کو ایک جگہ سے دوسرے مقام تک پہنچاتی ہے۔ یہ منصوبہ 1891ء میں پیش کیا گیا جبکہ اس کی تکمیل میں 14 سال کا عرصہ لگا۔ اس ریلوے لائن کو بچھانے میں لاکھوں مزدوروں نے حصہ لیا جنہوں نے لاتعداد پرپیچ راستوں، دریاؤں، جھیلوں اور بلند و بالا پہاڑوں کو چیر کر یہ ریلوے لائن مکمل کی۔ اس کی تعمیر کے مشکل اور طویل ترین عرصے میں سینکڑوں مزدوروں نے اپنی جانیں قربان کیں۔

یہ منصوبہ 1905ء میں مکمل ہوا۔ یہ لائن نہ صرف روس کے دور دراز علاقوں کو ملاتی ہے بلکہ اس کی رسائی ایشیا تک ہے۔ ابتداء میں اس پر صرف یک طرفہ ٹریک تیار کیا گیا تھا جسے بعد میں دوطرفہ کر دیا گیا۔ شروع میں اس کے ذریعے سائبریا سے نکلنے والا سونا اور دیگر قیمتی معدنیات نکال کر دیگر علاقوں میں پہنچائی جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس ریلوے لائن کے ذریعے سائبیریا کے یخ بستہ علاقے میں سیاسی و جنگی قیدیوں کو بھیجنے کے لیے بھی بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا۔ اس ریلوے لائن کو بچھانے کے لیے بڑی تعداد میں جنگی قیدیوں سے جبری

مشقت بھی لی گئی۔ جنہوں نے سالہا سال اپنی قید بامشقت اس ریلوے ٹریک کو بچھانے میں کاٹی۔

انقلاب روس (1917ء) میں سیاسی قیدیوں کو علاقہ بدر کرنے کے لیے بھی اسے استعمال کیا جاتا تھا۔ جدید روس کی ترقی میں اس ریلوے لائن نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ملک کے دور دراز دشوار گزار راستوں پر قائم صنعتی زون کو اس لائن کے ذریعے منسلک کیا گیا۔ شروع میں اس سفر کے دوران پڑنے والی بیکل جھیل کی یخ بستہ ہواؤں اور برف پوش راستہ جو 65 کلومیٹر پر مشتمل ہے بہت سے حادثات رونما ہوئے جس پر بعدازاں 4267 ٹن وزنی آئس بریکر تیار کر کے ٹکڑوں کی شکل میں نصب کر دیا گیا۔ اس جھیل سے طے کیا جانے والا بحری نقل و حمل کے ذریعے تین ماہ کا سفر صرف ایک ہفتے میں طے کیا جاتا ہے۔

سفر کا آغاز ماسکو کے وقت کے مطابق ہوتا ہے لیکن دوران سفر یہ آٹھ ٹائم زون سے گزرتی ہے۔ ماسکو سے چلنے والی یہ ٹرین دریائے وولگا اور پھر جنوب مشرق میں یورل پہاڑوں سے گزرتے ہوئے 1170 کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہوئی یورپ سے ایشیا میں داخل ہو جاتی ہے۔

سائبریا کا علاقہ ایک کروڑ 24 لاکھ 94 ہزار مربع کلومیٹر (50 لاکھ مربع میل) پر مشتمل ہے۔ سائبیریا تاتاری زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''سوئی ہوئی زمین''۔ یہ خطہ حیرت انگیز ہے جہاں قدم قدم پر برفانی چیتے، ریچھ، گیدڑ اور انواع و اقسام کے جانور اور پودے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ خطہ تیل، کوئلہ اور لوہا سمیت قیمتی معدنیات سے مالا مال ہے۔ یہ انتہائی سرد علاقہ ہے جہاں 8 سے 9 ماہ سخت سردی اور یخ بستہ ہوائیں چلتی ہیں۔ اس دوران درجہ حرارت منفی 68 ڈگری سینٹی گریڈ (منفی 90 ڈگری فارن ہائیٹ) تک پہنچ جاتا ہے۔

❀ ❀ ❀

بحرالکاہل

(Pacific Ocean)

دنیا کا سب سے بڑا سمندر

دنیا کا سب سے عظیم سمندر بحرالکاہل تقریباً 6 کروڑ 40 لاکھ مربع میل رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس سمندر کی گہرائی مختلف مقامات پر مختلف ہے لیکن سب سے گہرا مقام فلپائن کے قریب ''ماریانا اسٹرینچ'' ہے۔ یہ بحری کھاڑی سمندر کی سطح سے 36,200 فٹ گہرائی تک اترتی چلی جاتی ہے۔ بحرالکاہل کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 3200 فٹ اور اوسط 23/4 میل ہے۔ یہ شمال سے جنوب کی طرف قوس کی طرح پھیلا ہوا ہے۔

بحرالکاہل کا بیشتر حصہ بوجہ آبی سکون کے جہاز رانی کے قابل ہے اسی لیے اسے کاہل یعنی سست رو کہتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا سمندر ہے کہ اگر زمین کے تمام خشکی کے علاقوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے زمین کے ایک تہائی حصے کو گھیر رکھا ہے اور زمین کے سمندروں میں جتنا پانی ہے آدھے سے زیادہ پانی صرف اس ایک سمندر میں ہے۔ اس پانی کی مقدار چھ سیکسٹلین (6 Sextillion) گیلن بتائی جاتی ہے۔ سیکسٹیلین سمجھنے کے لیے آپ کو چھ کے ہندسے کے بعد 21 صفر لگانے ہوں گے۔

بحرالکاہل کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ پورا امریکہ 18 مرتبہ اس سمندر میں سما سکتا ہے یا امریکہ جیسے وسیع و عریض 18 ممالک اس کی حدود میں شامل ہو سکتے

ہیں۔ اس بڑے سمندر میں کئی چھوٹے بحیرے (سمندر) بھی شامل ہیں جن میں بحیرہ بیرنگ، بحیرہ کورل، بحیرہ فلپائن اور خلیج الاسکا نمایاں ہیں۔ اس میں بے شمار جزیرے بھی ہیں جن میں بعض آتش فشانی ہیں اور بعض میں موتی پائے جاتے ہیں۔ اس کے دونوں ساحلوں کے ساتھ ساتھ سامن اور جھینگا مچھلی کی شکارگاہیں ہیں۔

آسٹریلیا کے قریب گرم پانی کی کمین گاہ ہے۔ جزائر ملایا اور میکسیکو میں نمک ملتا ہے۔ اس کے دو طرف براعظم ایک دوسرے سے بہت دور ہیں اس لیے زیادہ تر جہاز رانی ساحل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ اس کی مشہور بندرگاہیں شنگھائی، یوکوہاما، ولاڈی ووسٹک، اوساکا، سان فرانسسکو، پانامہ، گوئے کوئل، سنگاپور، ہانگ کانگ اور بٹاویا ہیں۔ یہ سمندر زیادہ تر ایشیا اور امریکہ کے درمیان واقع ہے۔

❁ ❁ ❁

بحیرہ مردار

(Dead Sea)

بحرالموت جہاں کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی

بحیرہ مردار دراصل مشرق وسطیٰ کی ایک بہت بڑی جھیل ہے جو ایک طرف 47 میل تک اردن کے علاقے کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ یہ دریائے اردن کے آخری سرے پر زمین سے محصور جھیل ہے جس کے پانی نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ کچھ پانی بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہ جھیل اردن اور اسرائیل کے درمیان سرحد قائم کرتی ہے۔ اس کے جنوب مغربی کنارے پر اسرائیلی حکومت قابض ہے۔

بحیرہ مردار کی لمبائی 80 کلومیٹر (50 میل) اور چوڑائی 16 کلومیٹر (10 میل) ہے۔ اس نے 405 مربع میل کا علاقہ گھیر رکھا ہے۔ بحیرہ روم کی سطح سے یہ 1312 فٹ نیچے واقع ہے۔ چونکہ اس سے کوئی دریا نہیں نکلتا اس لیے اس کا پانی نہایت کڑوا ہے جس کے باعث اس میں کوئی چیز نہیں ڈوبتی۔ اسی بنا پر اس کا نام بحیرہ مردار (بحرالموت) پڑ گیا ہے۔ بعض مقامات پر اس کی گہرائی 1300 فٹ ہے۔ اس کے مشرق اور مغرب میں ڈھلوانی پہاڑ جو 6 ہزار فٹ تک اونچے ہیں کھڑے ہیں۔ بحیرہ مردار اس لیے کہتے ہیں کہ زیادتی نمک کی وجہ سے اس کا پانی نہایت کڑوا ہے۔

قرون وسطیٰ کے سیاحوں کے مطابق بحیرہ مردار کے اوپر سے کوئی پرندہ اڑ کر نہیں جا

سکتا کیونکہ اس کے اوپر کی ہوا زہریلی ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ اس کی آب و ہوا صحت مند اور خوشگوار ہے۔ یہاں کوئی پرندہ صرف اس لیے نظر نہیں آتا کہ ان کے کھانے کے لیے یہاں کوئی خوراک نہیں ہے۔ اس میں مچھلیاں بھی نہیں ہیں اور سبزہ بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ اس میں کچھ مچھلیاں ڈالی گئیں جو فوراً مر گئیں۔ اصل میں اس کے پانی میں بے شمار نمکیات ملے ہوئے ہیں۔ اس میں عام کھانے کے نمک کے علاوہ میگنیشم کلورائیڈ، پوٹاشیم، کیلیشم اور میگنیشم برومائیڈ کی آمیزش ہے۔ ان نمکیات کی آمیزش کی وجہ سے اس کا پانی ایک ایسا محلول بن گیا ہے جو گاڑھا بھی ہے کہ اس میں ڈوبنا ناممکن ہے۔ اس لیے یہ تیراکی سیکھنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔

یہ بات بڑی حیرت انگیز اور دلچسپ ہے کہ بحیرہ مردار سمندر کے پانی سے نو گنا زیادہ نمکین ہے حالانکہ اس میں دریائے اردن اور دیگر چھوٹی نہروں سے روزانہ چار ملین ٹن تازہ پانی شامل کیا جاتا ہے لیکن یہ تازہ پانی بحیرہ مردار کے پانی میں شامل ہونے سے پہلے ہی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ کیونکہ بحیرہ مردار کے اوپر تیز سورج چمکتا رہتا ہے اور یہاں کا درجہ حرارت 125 فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔

اس جھیل کے ساحل منجمد لاوے، سلفر اور چٹانی نمک سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بحیرہ مردار آتش فشانی علاقے میں ہے۔ درحقیقت 350 میل لمبی وہ بڑی خندق جس میں اردن اور بحیرہ مردار واقع ہیں اس عظیم شگافی وادی کا شمالی حصہ ہے جو مشرقی افریقہ سے نکل کر یہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ بحیرہ مردار کی طرح شگافی وادی میں واقع زیادہ تر جھیلوں میں نمکیات کی کثرت ہے۔

بحیرہ مردار کے مشرق میں چونے کے پتھر کی 4396 فٹ لمبی بلند دیواریں کھڑی ہیں جبکہ مغرب میں جیڈ کا 2986 فٹ بلند میدان مرتفع ہے۔ جھیل کے جنوب مغربی کنارے پر نمک کے ستون ہیں۔ درحقیقت یہ ایک نیچا پہاڑ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لوطؑ کی بیوی کو ان پہاڑوں میں پتھر بنا دیا گیا تھا۔ بحیرہ مردار کو ''بحیرہ لوط'' بھی کہا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت لوطؑ کی قوم عذاب الٰہی کا شکار ہوئی تھی۔

جنوب مغربی کنارے پر مسادا ہے جہاں 72ء میں یہودیوں نے آخری بار رومیوں

کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ بحیرہ مردار کے شمال مغربی کنارے پر وادی کمرن میں واقع ایک غار میں ایک بدو چرواہے نے 1947ء میں کچھ لپٹے ہوئے نقوش دریافت کیے جو کہ بائبل کے ابتدائی نسخوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ابتداء میں تو بحیرہ مردار سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا مگر اب اس کے کنارے پر جدید قسم کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں۔

ماؤنٹ ایورسٹ

(Mount Everest)

دنیا کا سب سے بلند ترین پہاڑ

ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ کوہ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی جو سطح سمندر سے 8848 میٹر (29028 فٹ) بلند ہے۔ تبتی زبان میں ''چومولونگما'' (Chomolungma) اور نیپالی میں ''ساگر ماتا'' (Sagarmatha) کہتے ہیں۔ تبتی اور نیپالی زبان میں ایورسٹ کو جس نام سے پکارا جاتا ہے اس کے معنی ہیں ''ہوا کی دیوی''۔ اس عظیم الشان پہاڑ کی مناسبت سے یہ بڑا شاعرانہ نام ہے لیکن اسے ایورسٹ کا نام ''سر جارج ایورسٹ'' کے اعزاز میں دیا گیا۔ جو برٹش سرویئر جنرل آف انڈیا تھا اور ہندوستان میں 1830ء سے 1843ء تک سرویئر جنرل کے عہدے پر فائز رہا۔

ارضیات کے وقت کے پیمانے کے مطابق ایورسٹ اور دیگر دیوپیکر چوٹیاں جو ہمالیہ کے سلسلہ کوہ میں 2400 کلومیٹر (1500 میل) کے فاصلے میں پھیلی ہوئی ہیں بہت زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ ماہرین ارضیات کے مطابق ہمالیہ کے پہاڑ 5 کروڑ سال قبل زمین کی سطح کے حصوں کو آپس میں ٹکرانے سے مٹی کی جو پرت جم گئی تھی اس سے بنے تھے۔ طبقات الارض کی ساخت میں خرابی کی وجہ سے جو ٹکڑا زمین کی طرف چلا گیا اس میں بھارت، آسٹریلیا اور بحر ہند بن گئے اور دوسرے حصے نے یورپ اور ایشیا کے وہ ملک بنائے جو اب یورپ، وسطی ایشیا اور

چین کہلاتے ہیں۔

لاکھوں سال گزرنے کے ساتھ ہواؤں اور برف نے اس کی سطح میں تبدیلی کی اور پہاڑ کے موجودہ نشیب و فراز اور دیو پیکر چوٹیوں نے ایسی شکل اختیار کی جیسی آج نظر آتی ہیں۔ کوہ ہمالیہ کے بالائی حصوں میں جو 6400 میٹر (2100 فٹ) بلند ہیں ان پر جو برف پڑتی ہے وہ سارا سال نہیں پگھلتی۔ پہاڑی سلسلوں کے درمیان میں پڑنے والے برف کے گالے سخت برف میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو لڑھکتے ہوئے پہاڑ سے نیچے جاتے ہیں تو راستے میں رگڑ سے ٹوٹ کر گلیشیئر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ گلیشیئر پہاڑ کے نزدیک وادیوں میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ یہی وہ گلیشیئر ز ہیں جن کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند کے دریاؤں سندھ، برہما پترا اور ستلج میں پانی آتا ہے۔

1954ء میں انڈین حکومت نے ماؤنٹ ایورسٹ کی پیمائش کرائی تو یہ 8848 میٹر (29,028 فٹ) تھی۔ لیکن غیر سرکاری ذرائع کے مطابق یہ 8882 میٹر (29,141 فٹ) تھی۔ اس کی بلندی کی پیمائش برٹش سروئیر جنرل سر جارج ایورسٹ (پ۔ 1790ء۔ وفات 1866ء) نے کی تھی۔ ایورسٹ اور اس کی دو ساتھی چوٹیوں لوئسی (بلندی 8495 میٹر) اور نپسٹی (بلندی 7894 میٹر) نے مل کر مغربی وادی بنائی ہے جس پر مسلسل برف آ کر جمع ہوتی رہتی ہے۔

ماؤنٹ ایورسٹ کو 1852ء میں ہی دنیا کی سب سے بلند چوٹی تسلیم کر لیا گیا تھا مگر تبتی حکومت نے 1920ء تک کسی یورپی مہم جو ٹیم کو اس پہاڑ پر چڑھنے کی اجازت نہ دی۔ 1921ء اور 1938ء کے درمیان برطانیہ کی سات ٹیموں نے مختلف اوقات میں اسے سر کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دو کوہ پیما اینڈریو ارون اور جارج میلوری شمالی پہاڑی سلسلے کی جانب چڑھ رہے تھے کہ لاپتہ ہو گئے۔ ان کی لاشیں بھی نہ مل سکیں۔

دوسری جنگ عظیم (1939-45ء) کے بعد کئی ممالک کے کوہ پیماؤں نے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کی۔ 1950ء میں چین کی کوہ پیما ٹیم نے اس پہاڑ پر چڑھنے کے لیے شمالی راستہ اختیار کیا لیکن نیپالی مہم جوؤں نے یہ بات تسلیم کی کہ جنوبی راستہ زیادہ بہتر ہے۔ 1952ء میں سوئٹزرلینڈ کے کوہ پیماؤں نے جنوبی راستہ سے اس چوٹی کو سر کرنے کی دو مرتبہ کوشش کی لیکن حقیقی کامیابی برطانوی اور نیپالی کوہ پیماؤں کو ملی۔ 29 مئی 1953ء کو نیوزی

لینڈ کے سر ایڈمنڈ ہیلاری (Edmund Hillary) اور ایک نیپالی شرپا قبائلی تینزنگ نورگے (Tenzing Norgay) نے اسے پہلی دفعہ اوپر چڑھ کر سر کیا۔ یہ برٹش مہم جو کمپنی کے ارکان تھے۔ یہ 10 مارچ 1953ء کو کھٹمنڈو پہنچے جہاں سے انہوں نے اپنی مہم جوئی کا آغاز کیا۔

ایورسٹ کی بلندی 8.9 کلومیٹر (5½ میل) کے لگ بھگ ہے۔ اب تک بے شمار ممالک کی ٹیمیں ماونٹ ایورسٹ کو سر کر چکی ہیں جن میں سے کسی نے جنوبی گھاٹی کا راستہ اختیار کیا تو کوئی جنوب مغربی سمت سے اوپر چلا گیا۔ 1953ء سے پہلے 1933ء میں اس چوٹی کو ہوسٹن مہم نے بذریعہ طیارہ تسخیر کیا تھا۔

قطب جنوبی

(South Pole)

برف سے ڈھکا براعظم

$66\frac{1}{2}$ درجے عرض بلد جنوبی سے نیچے جو سمندر اور خشکی ہے۔ اس سارے علاقے کو قطب جنوبی (South Pole) یا انٹارکٹیکا (Antarctica) کہتے ہیں۔ قطب جنوبی تقریباً 53لاکھ مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تمام تر وسعتوں میں جمی ہوئی برف کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ دنیا کی 90فیصد برف یہاں جمع ہے۔ قطب جنوبی عالمی موسم پر ہی اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے سمندروں کو ہزاروں میل تک متاثر کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں زندہ رہنا ناممکنات میں سے تھا لیکن مختلف سائنسی ایجادات اور اختراعات نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اب جاپان، آسٹریلیا، امریکہ، برطانیہ، نیوزی لینڈ، بیلجیم، ناروے، ارجن ٹینا، چلی اور فرانس نے یہاں اپنے اڈے اور تجربہ گاہیں قائم کر رکھی ہیں۔

ماہرین طبقات الارض کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں قطب جنوبی، امریکہ، افریقہ، ہندوستان اور آسٹریلیا سے ملا ہوا تھا لیکن کروڑوں برس پہلے زمین کی داخلی قوتوں نے اس کی سطح کو کچھ یوں تہ و بالا کر دیا کہ مختلف براعظم ایک دوسرے سے پرے ہٹ گئے اور ان کے درمیان سمندر حائل ہو گئے۔ ماضی میں یہ خطۂ ارض خاصا گرم تھا۔ اس کے نیم گرم یا معتدل ہونے میں تو شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ قطب جنوبی میں کوئلے، لوہے، کرومیم، تانبے،

سرے، ٹین اور یورینیم کی موجودگی کا سراغ بھی ملا۔ قیاس ہے کہ یہاں تیل کے ذخائر بھی موجود ہیں لیکن ان معدنی وسائل سے استفادہ کرنا مشکل ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ دوسرے براعظموں میں جب معدنی وسائل کما حقہ ختم ہو جائیں گے تو ہم اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے قطب جنوبی کے معدنی وسائل بروئے کار لانے کی فکر کریں گے۔

قطب جنوبی پر پانی کمیاب ہے اور اسی سبب سے گراں قیمت بھی لیکن اس کے باوجود یہاں کی برفانی چوٹیوں میں ٹھوس شکل میں پانی کا اتنا ذخیرہ موجود ہے جو دنیا بھر کے دریاؤں اور جھیلوں کے پانی کی مجموعی مقدار سے بھی زیادہ ہے۔ صحرائے اعظم میں تو پھر بھی کہیں نہ کہیں پانی مل جاتا ہے لیکن یہاں پانی کا ملنا محال ہے۔ جب ذرا گرمی کا موسم آتا ہے تو کہیں کہیں چھوٹے تالاب نمودار ہو جاتے ہیں لیکن گرمی کے رخصت ہوتے ہی پھر برف میں بدل جاتے ہیں۔ سائنسدان اپنے پینے اور دوسرے استعمال کے لیے برف پگھلا کر پانی حاصل کرتے ہیں۔

یہاں پر جنوبی سمندر میں کئی ایک جزیرے ہیں جو بالکل بنجر اور ہر وقت طوفانی ہواؤں کی زد میں رہتے ہیں ان میں سینٹ اکینز، سینڈوچ آئی لینڈ، آئس لینڈ، پیٹر آئی لینڈ اور کرجیلین وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قطب جنوبی کی دریافت (Antarctic Exploration) کے لیے سب سے پہلے برطانوی مہم جو کیپٹن جیمز کک (James Cook) نے 73-1772ء میں بحری سفر کیا اور اس دشوار گزار حلقے کو عبور کیا۔ 1889ء میں ولیم سمتھ (William Smith) نے چند ایک جزائر کا پتہ لگایا اور اُن کا نام جنوبی شیٹ لینڈ رکھا۔ اسی زمانے میں ایک روسی جہاز راں بلنگ شوسن بھی قطب جنوبی کی طرف معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اُس نے سینڈوچ کے جزیرے کا کھوج لگایا۔ ان کے نام اپنے بادشاہوں کے اعزاز میں پیٹر اول اور الیگزینڈر اول رکھے۔

1823ء میں ایک مہم جو ویڈل 74 درجے عرض بلد تک چلا گیا۔ 32-1830ء کے لگ بھگ گراہم لینڈ کا انکشاف ہوا۔ 1840ء میں کیپٹن جے سی اور کیپٹن ہوکر نے ایک جزیرے کا انکشاف کیا جس کا نام وکٹوریہ لینڈ رکھا گیا۔ اس جزیرے میں سب سے پہلے بلجیم کے جہاز راں گرلاشے نے سردیوں کے دن گزارے تھے جو 1898ء میں موسم سرما میں یہاں پر رہا۔

1901ء میں ڈسکوری نامی جہاز کے ذریعے آر۔ ایف اسکاٹ نے ایک جزیرہ ایڈورڈ ہفتم لینڈ دریافت کیا۔ انہیں دنوں ایک جرمن جہاز راں نے بحرویڈل کی مہم شروع کی اور بحرویڈل کے جنوب مشرقی کنارے کی طرف ایک برفانی دیوار کا انکشاف کیا جہاں پر شیکلٹن 1908ء یا 1909ء میں برف کے دشوار گزار راستوں سے ہوتا ہوا پہنچا۔ وہاں سے قطب جنوبی صرف 111 میل دور رہ جاتا ہے۔

14 ستمبر 1911ء کو رولڈ ایمنڈسن قطب جنوبی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور جنوری 1912ء میں اسکاٹ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ وہاں تک پہنچ گیا۔ اس نے ایمنڈسن کے خیمے کو وہاں دیکھا۔ ایمنڈسن واپسی پر برفانی تھپیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکا اور مارا گیا۔ شیکلٹن قطب جنوبی کے دوسرے سفر پر نکلا اور راستے میں ہی ہلاک ہو گیا۔ ویلکنس نے ہوائی جہاز کے ذریعے قطب جنوبی کا سفر کیا اور یہ انکشاف کیا کہ گراہم لینڈ جزیرہ نما نہیں بلکہ چند جزائر کا مجموعہ ہے۔

ایڈمرل بانٹرڈ نے طیارے کے ذریعے 19 گھنٹوں میں قطب جنوبی کے گرد چکر لگایا۔ 1931ء میں ایس لارنس نے کوئین موڈ لینڈ کا انکشاف کیا اور قطب جنوبی کے جزائر کا مکمل چکر لگایا۔ 1936ء میں لنکن السورتھ نے بحیرہ راس کا دورہ کیا اور اس کی پیمائش کی۔ اس کا طیارہ راستے میں ہی ٹوٹ کر تباہ ہو گیا مگر ایک انگریز جہاز راں نے اس کی جان بچائی۔ اس طرح قطب جنوبی کی مکمل دریافت ہوئی۔

❀ ❀ ❀

قطب شمالی

(North Pole or Arctic)

برف سے ڈھکا ہوا علاقہ

$66\frac{1}{2}$ درجے شمالی عرض بلد سے 90 درجے شمالی عرض بلد کے علاقے کو جوٹنڈرا کے اوپر کا علاقہ ہے قطب شمالی کہتے ہیں۔ اس خطے میں انتہا کی سردی پڑتی ہے۔ خشکی اور تری کے تمام علاقے ہر وقت برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ سال میں صرف دو مہینوں میں موسم گرما آتا ہے لیکن ان میں بھی کافی سردی پڑتی ہے۔ سورج کی شعاعیں انتہائی ترچھی ہوتی ہیں کیونکہ ان دنوں سورج خط سرطان پر چمک رہا ہوتا ہے۔ موسم سرما میں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی نیچے رہتا ہے مگر قطب جنوبی کی نسبت کم سردی ہوتی ہے۔

موسم گرما میں معمولی سی بارش بھی ہو جاتی ہے اور کہیں کہیں کائی لچن اور پھول دار پودے بھی گرمیوں میں اگ آتے ہیں۔ یہاں درخت کوئی نہیں بلکہ یہاں رینڈیر، برفانی ریچھ، بحری بچھڑے (Seale) اور والرس (Walrus) جیسے جانور پائے جاتے ہیں۔ موسم گرما میں کچھ پرندے بھی نظر آتے ہیں۔ نچلے حصوں میں اسکیمو رہتے ہیں۔ اس کے انتہائی شمال میں پہنچنا کافی دشوار ہے۔

قطب شمالی کی دریافت کی مہم کا باقاعدہ آغاز 18ویں صدی عیسوی میں ہوا۔ اس سے پیشتر اگر کوئی کوشش کی گئی تو وہ ضمنی تھی۔ ان کا مقصد شمال مشرقی بحری راستہ دریافت کرنا تھا۔ چنانچہ ذنوبی، ڈیوی چانسلر اور ہڈسن وغیرہ نے ان آزمائشی مہمات میں قسمت آزمائی کی۔

18ویں صدی کے دوران خاص قطبی علاقہ سر کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ 1818ء میں شاہ انگلینڈ جارج سوم نے 20ہزار روپے کا انعام اس شخص کے لیے رکھا جو قطبی راستہ دریافت کرے گا۔ چنانچہ راس پیری اور فرینکلن نے یکے بعد دیگر قطب شمالی کی مہم سر کرنے کی کوشش کی۔ راس اور پیری 1898ء میں روانہ ہوئے۔ فرینکلن کی ناکام مہم 1843ء میں روانہ ہوئی تھی مگر وہ لاپتہ ہو گئی۔ جب فرینکلن واپس نہ لوٹا تو اس کا کھوج لگانے کے لیے یورپ اور امریکہ سے کئی پارٹیاں روانہ ہوئیں۔ کینیڈی، میک لیور، رائی بلچارے وغیرہ یکے بعد دیگرے تک و دو کرتے رہے اور فرینکلن و اس کے ساتھیوں کے بارے میں اہم واقفیت بہم پہنچائی۔ اس کے علاوہ ان علاقوں کا سروے کر کے ان کا نقشہ بھی بنایا۔

1900ء میں کپتان پیری قطب شمالی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ ستمبر 1909ء میں دنیا نے یہ دلچسپ خبر سنی کہ امریکی کپتان کک بھی قطب شمالی پر پہنچ گیا لیکن اس خبر کی تصدیق نہ ہو سکی۔ اس کے بعد کپتان پیری نے قطب شمالی پر جھنڈا گاڑ دیا اور اس مہم کے تفصیلی حالات اور فوٹو بھی شائع ہو گئے۔ ہوائی آمدورفت کے نفاذ کے بعد کئی مہمات ہوائی ذریعہ سے بھی سرانجام پائیں۔ ایڈمرل رچرڈ بیرڈ ہوائی جہاز کے ذریعے قطب شمالی پر پہنچا۔

جون 1928ء میں کپتان رولڈ ایمنڈسن ایک سی پلین کے ذریعے اطالوی جہاز اٹالا کی تلاش میں روانہ ہوا جو کچھ عرصہ پیشتر لاپتہ ہو گیا تھا۔ اٹالا کے کئی ایک ملاح تو مل گئے لیکن خود ایمنڈسن کا کوئی پتہ نہ ملا۔ سب سے آخری مہم پرومیر شمڈٹ کی تھی جو 1937ء میں بذریعہ جہاز چار ساتھیوں کی معیت میں قطب شمالی کے ملحقہ برف کے میدان میں پہنچا تاکہ وہ موسمی حرارت اور مقناطیسی اثرات کا مطالعہ کر سکے۔ 38-1937ء میں برطانیہ، روس، کینیڈا، امریکہ اور دوسرے ملکوں کی مہمیں قطب شمالی گئیں۔ روسی گروہ نے سردیاں بسر کر کے وہاں کے موسموں کا مطالعہ کیا۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے روس نے قطب شمالی میں اس راستہ کو ہوائی جہازوں کے ذریعے عبور کرنے کی کوشش کی۔ 1952ء میں 8ہزار مربع میل کا ایک جزیرہ دریافت ہوا جو جزیرہ وکٹوریہ کے شمال مشرق میں قطب شمالی سے ایک ہزار میل دور ہے اور اس کا نام سٹیفنسن ہے۔ 1954ء میں امریکہ اور روس کے تعاون سے یہاں کئی رصدگاہیں بنائی گئیں۔

❀ ❀ ❀

نہر پانامہ

(Panama Canal)

ایک عظیم آبی گزرگاہ جس نے دو سمندروں کو ملا دیا

وسطی امریکہ میں بحیرہ کریبین اور جنوبی بحرالکاہل کی سرحدوں کے درمیان ایک چھوٹا سا ملک پانامہ واقع ہے۔ یہاں مشرق سے بحرالکاہل کے اوپر سے سورج صبح طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں بحراوقیانوس پر غروب ہو جاتا ہے۔

پانامہ دنیا کے دو عظیم ترین سمندروں کے سنگم پر واقع ہے۔ ان دونوں سمندروں کو نہر پانامہ آپس میں ملاتی ہے۔ دنیا بھر میں صرف دو نہریں ایسی ہیں جو کسی زرعی مقصد کے لیے نہیں بنائی گئیں بلکہ ان کے بنانے کا مقصد فاصلوں کو کم کرنا اور وقت کی بچت تھا۔ ان میں ایک نہر سویز ہے جو کہ مصر میں واقع ہے اور بحیرہ احمر کو بحیرہ روم سے ملاتی ہے۔ دوسری نہر پانامہ ہے جو بحرالکاہل کو بحراوقیانوس سے ملاتی ہے۔

18ویں صدی کے شروع میں امریکہ صنعتی اعتبار سے یورپ کے ہم پلہ ہو چکا تھا۔ امریکہ کی مغربی ریاستوں سے یورپ اور امریکہ کی مشرقی ریاستوں سے ایشیا کے ممالک کو تجارت بحری جہازوں کے ذریعے ہوتی تھی۔

دونوں راستوں سے بحری جہازوں کو جنوبی امریکہ کے براعظم کے گرد 8 ہزار کلومیٹر کا اضافی سفر کرنا پڑتا تھا جس سے تجارتی سامان کی لاگت میں تو اضافہ ہوتا ہی تھا ٹرانسپورٹ

کے اخراجات بھی کئی گنا بڑھ جاتے تھے۔ لہٰذا ایک مختصر آبی راستے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس آبی گزرگاہ کے بنانے کے لیے وسطی امریکہ کے ممالک سے بہتر جگہ اور کوئی نہ تھی۔ اس جگہ پر نہر بنانے کے لیے پانامہ انتہائی موزوں ملک تھا۔

اگر ہم دنیا کے نقشے میں شمالی امریکہ اور جنوبی امریکہ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شمالی امریکہ کے ملک میکسیکو کے جنوب سے ایک کم چوڑی پٹی شمالی امریکہ کو جنوبی امریکہ کے ملک کولمبیا سے ملاتی ہے۔

اس پٹی کی میکسیکو کی سرحد سے کولمبیا تک لمبائی تقریباً 1800 کلومیٹر ہے اور اس کی اوسط چوڑائی تقریباً 100 کلومیٹر ہے۔ اس 1800 کلومیٹر لمبے علاقے کو وسطی امریکہ بھی کہا جاتا ہے۔ وسطی امریکہ میں سات چھوٹے چھوٹے ترقی پذیر ملک شامل ہیں۔ ان میں بیلائز، گوئٹے مالا، ایلسلواڈور، ہنڈوراس، نکاراگوا، کوسٹاریکا اور پانامہ شامل ہیں۔

وسطی امریکہ کی اس پٹی میں پانامہ ہی ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں اس پٹی کی چوڑائی سب سے کم یعنی 65 سے 70 کلومیٹر تک ہے۔ بظاہر دیکھا جائے تو 70 کلومیٹر لمبی نہر بنانا انجینئرنگ کا کوئی بڑا کمال نہیں تھا مگر نہر پانامہ کو بنانا اس لیے مشکل تھا کیونکہ یہ نہر سطح سمندر سے 100 سے 200 میٹر اونچے علاقے میں بنی تھی۔ اس کے دونوں حصوں یا کناروں کو دنیا کے دو بڑے سمندروں شمال میں بحراوقیانوس اور جنوب میں بحرالکاہل کی سطح سے ملانا تھا اور نہر کی گہرائی اور چوڑائی اتنی رکھنی تھی کہ ایک لاکھ ٹن سے زیادہ وزن کے بحری جہاز آسانی سے اس میں سے گزر سکیں۔

نہر بنانے کے لیے موجودہ جگہ کا انتخاب حتمی طور پر اس لیے بھی کیا گیا کیونکہ اس جگہ اصل نہر کی کھدائی صرف 16 کلومیٹر لمبے علاقے میں ہونی تھی جبکہ باقی کا 48 کلومیٹر لمبا علاقہ جھیل گاتن (Gatun) اور خلیج لیمن (Limon) کے پانیوں پر مشتمل تھا۔

نہر پانامہ کا منصوبہ اپنی تکمیل سے پہلے کن کن مراحل سے گزرا۔ اس کے لیے اس علاقے کے تاریخی پس منظر کا جاننا بہت ضروری ہے۔ سب سے پہلے سپین کے چارلس اول نے مجوزہ نہر کے راستے کا ایک سروے کرایا تھا لیکن اس کی تعمیر کا آغاز تین صدیوں بعد ممکن ہو سکا۔ 16 ویں صدی کے شروع میں سپین کے تاجروں اور مہم جوؤں نے بحراوقیانوس سے

بحر الکاہل میں جانے کے لیے وسطی امریکی ممالک میں دو راستے اپنائے۔ ایک راستہ نکاراگوا کے جنوب میں تھا جس کی کل لمبائی 217 کلومیٹر تھی۔ اس میں خشکی پر 117 کلومیٹر اور جھیل نکاراگوا کے پانیوں میں 100 کلومیٹر سفر تھا۔ یہ راستہ لمبا تھا اور نہر بنانے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ دوسرا پانامہ سٹی کے مغرب میں بالبوآ (Balboa) کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس جگہ خشکی کا سفر محض 14 سے 16 کلومیٹر تھا جبکہ باقی کا سفر جھیل ''میرافلورنس'' اور جھیل گاتن کے پانیوں میں سے ہوتا تھا۔

1502ء میں کرسٹوفر کولمبس کے پانامہ پر قدم رکھنے کے بعد پہلی بار ایک ہسپانوی مہم جونونیز ویسکوئز نے 26 ستمبر 1513ء کو بالبوآ کے مقام سے پانامہ کو شمال کی طرف عبور کیا اور اس کم چوڑے نئے راستے کو دریافت کیا۔ بعدازاں یورپی تاجروں نے اس راستے کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ 19ویں صدی کے وسط میں دنیا میں تجارت بڑے بڑے بحری جہازوں کے ذریعے ہونے لگی تو وسطی امریکہ میں ایک مکمل آبی گزرگاہ کی ضرورت محسوس کی گئی۔ 17 نومبر 1859ء کو مصر میں نہر سویز مکمل ہوئی تو وسطی امریکہ میں بھی ایک ایسے ہی راستے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

19ویں صدی کے وسط تک امریکہ نے پانامہ سٹی سے کولن (Colon) تک 62 کلومیٹر لمبی ریلوے لائن بچھا دی تھی۔ مگر یہ ریلوے لائن بڑے پیمانے پر تجارت کے لیے موزوں نہیں تھی۔ پانامہ اس وقت کولمبیا کے زیرانتظام تھا۔ کولمبین حکومت کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ نہر کے منصوبے کو شروع کرتی۔

اس علاقے میں نہر کی تعمیر کا سب سے زیادہ فائدہ 2500 کلومیٹر شمال میں واقع امریکہ کو ہوتا جبکہ مغربی یورپ میں واقع بڑے صنعتی ممالک برطانیہ، جرمنی، فرانس، سپین اور پرتگال کے تاجروں کو بھی امریکہ کے مغربی شہروں اور ایشیا میں جاپان تک سامان تجارت لے جانے میں آسانی ہوتی۔ کولمبیا کے بعض سیاستدان امریکہ کے ہاتھوں نہر کی تکمیل کے خلاف تھے۔

کولمبیا کی حکومت اور نہر سویز بنانے والی فرانسیسی کمپنی ''یونیورسل انٹراوشین کینال کمپنی'' کے درمیان نہر بنانے کے لیے مذاکرات ہوئے اور 1881ء میں مذکورہ کمپنی نے نہر کی

تعمیر کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ کمپنی کی مالی معاونت ایک فرانسیسی سرمایہ کار فرنانڈ وڈی لیپس نے کی۔ اسی تاجر نے نہر سویز کی تعمیر میں سرمایہ لگایا تھا۔ کمپنی نے 30 ہزار سے زائد کارکن کھدائی کے کام پر لگائے اور زور شور سے کام کا آغاز کیا۔ مگر کمپنی کو استوائی خطے میں کام کا تجربہ نہیں تھا۔ اس علاقے میں ندی نالوں کی بہتاب اور بارشوں کی فراوانی سے لینڈ سلائیڈنگ بہت زیادہ ہوتی ہے اس لیے یہاں کام میں بہت زیادہ مشکلات پیش آئیں۔ اس کے علاوہ یہاں پھیلنے والے زرد بخار اور مالی مشکلات نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ نتیجتاً سینکڑوں مزدور ہلاک ہو گئے۔ وبائی امراض، کارکنوں کا فرار، جغرافیائی مشکلات اور غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے نہر کے منصوبے کی لاگت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور کمپنی دیوالیہ ہو گئی۔

1889ء میں نہر کی کھدائی کا کام روکنا پڑ گیا۔ 1894ء میں دوبارہ کام کا آغاز ہوا مگر اس بار بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کولمبین حکومت اور فرانسیسی کمپنی (UICC) کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ اس بار مالی مشکلات اتنی بڑھیں کہ کمپنی نے 1898ء میں نہر پانامہ کے منصوبے سے نہ صرف ہاتھ اٹھا لیا بلکہ کمپنی کی فروخت کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ اس دوران امریکیوں نے جغرافیائی مشکلات کی وجہ سے پانامہ کے ساتھ ساتھ پانامہ سے 690 کلومیٹر شمال میں نکاراگوا میں ''سان کارلوس'' کے مقام پر بھی نہر کے لیے نئے سرے سے کام شروع کر دیا۔

اسی دوران ایک فرانسیسی انجینئر فلپ جین بناؤ اور امریکی قانون دان ولیم نیلسن کرامویل جو پانامہ اور نکاراگوا میں سروے کا کام کر رہے تھے نے نہر بنانے کے لیے پانامہ کے حق میں فیصلہ دیا۔ مگر 1901ء میں امریکی کینال کمیشن نے نکاراگوا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس وقت کے امریکی صدر تھیوڈور روزویلٹ پانامہ میں موجودہ جگہ پر ہی نہر کی تکمیل چاہتے تھے۔ صدر روزویلٹ نے اپنے ایک کانگریس مین سینیٹر مارک ہانا کو یہ مشن سونپا کہ وہ کانگرس کے باقی ارکان اور امریکی کینال کمیشن کی رائے کو پانامہ کے حق میں ہموار کریں۔

امریکی حکومت جسے نہر کی تعمیر سے سب سے زیادہ دلچسپی تھی نے UICC کو خریدنے میں دلچسپی ظاہر کی۔ چنانچہ 1902ء میں امریکہ نے یہ کمپنی خرید لی۔ اسی دوران 1903ء میں صدر روزویلٹ کی کوششوں سے امریکی سینیٹ نے پانامہ میں موجودہ جگہ پر نہر کی

تعمیر کا بل پاس کر دیا۔ صدر کی ذاتی کوششوں کی وجہ سے انہیں ''فادر آف کینال'' بھی کہا جاتا ہے۔

جنوری 1903ء میں امریکہ اور کولمبیا کے درمیان نہر پانامہ کی تعمیر کے لیے ایک معاہدہ ہوا۔ جس کے تحت کولمبیا کو نہر کی تعمیر کے لیے امریکہ کو ابتدائی طور پر 10 ملین ڈالر کی ادائیگی کرنی تھی مگر کولمبیا کی سینیٹ نے اس معاہدہ کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی بنا پر امریکہ نے پانامہ کے باغیوں کو اکسانا شروع کر دیا کیونکہ پانامہ اس وقت کولمبیا کا ایک حصہ تھا۔ امریکی ہر صورت میں نہر کی تکمیل چاہتے تھے لٰہذا کولمبیا سے مذاکرات ناکام ہونے کے بعد امریکہ نے پانامہ کے باغیوں کی کھلے عام حمایت شروع کر دی۔ 3 نومبر 1903ء کو امریکی شہ پر پانامہ نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ امریکہ نے صرف چند گھنٹوں میں ہی پانامہ کی نئی حکومت کو تسلیم کر لیا اور ہزاروں فوجی پانامہ بھیج دیئے۔

18 نومبر 1903ء کو پانامہ اور امریکہ کے درمیان نہر بنانے اور نہر کا انتظام چلانے سے متعلق ایک تاریخی دستاویز پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کو Hay-Bunau-Varila Treaty کہتے ہیں۔ امریکی کینال کمیشن کے چیف انجینئر جان ایف سٹیونز کی زیر قیادت نہر کی تعمیر دسمبر 1903ء میں شروع ہو گئی۔ معاہدے کے تحت امریکہ کو 16 کلومیٹر لمبے علاقے میں نہر کھودنا تھی۔ تعمیر میں ماہرین کے لیے سب سے بڑا مسئلہ سمندر کے لیول اور نہر کے لیول کو ملانے کا تھا۔ اس کا حل نہر سویز کی طرح لاک چیمبرز کی تعمیر تھا۔ لٰہذا سب سے پہلے تین مقامات پر لاک چیمبرز تعمیر کیے گئے۔ لاک چیمبرز سے مراد سینکڑوں مربع فٹ قطر لوہے اور کنکریٹ سے بنا کمرہ ہوتا ہے۔ جس کے آگے اور پیچھے لوہے کے دروازے ہوتے ہیں۔

دنیا میں صرف دو نہروں پر ہی لاک چیمبرز بنائے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نہریں سطح سمندر سے اوسطاً 150 فٹ بلند سطح زمین پر بنائی گئی ہیں۔ لٰہذا سطح سمندر کو نہر کی سطح سے ملانے کے لیے ان نہروں پر لاک چیمبرز بنائے گئے۔ بحری جہاز سمندر پر تیرتا ہوا جب نہر کے قریب پہنچتا ہے تو لاک چیمبرز میں داخل ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی چیمبرز کے آگے اور پیچھے کے دروازے بند کر کے چیمبر میں پانی کی سطح بلند کی جاتی ہے۔ پانی کی سطح کے ساتھ جہاز بھی بلند ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جب پانی بلند ہو کر نہر کی سطح کے برابر ہو جاتا ہے تو چیمبرز

کے آگے والے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح جہاز نہر میں داخل ہو جاتا ہے۔ نہر میں سفر کے بعد یہی عمل دوبارہ دہرایا جاتا ہے۔

نہر کی باقاعدہ کھدائی 1906ء میں شروع کی گئی۔ یہ عظیم ترین منصوبہ 10 سال میں تقریباً 36 کروڑ 66 لاکھ 50 ہزار ڈالر کی لاگت سے مکمل کر لیا گیا۔ امریکیوں نے اوسطاً 40 ہزار مزدوروں کو کھدائی کے کام پر لگایا۔ ان مزدوروں کی بڑی تعداد جزائر ویسٹ انڈیز سے تعلق رکھتی تھی جو بعد میں اسی علاقے میں آباد ہو گئے۔ نہر اگست 1914ء میں مکمل ہوئی۔ اس عرصے میں 143 ملین کیوبک میٹر کے علاقے میں کھدائی کا کام کیا گیا۔ جھیل گاتن اور خلیج لیمن کے علاقے کو ملا کر نہر کی کل لمبائی 64 کلومیٹر (40 میل) بنتی ہے۔ نہر کی گہرائی 12 میٹر (41 فٹ) جبکہ چوڑائی 150 میٹر (500 فٹ) ہے۔

دنیا میں ہر سال 12 ہزار سے زائد چھوٹے بڑے جہاز نہر کو کراس کرتے ہیں۔ ایک 50 ہزار ٹن تک کے جہاز کو نہر کراس کرنے میں 12 سے 16 گھنٹے لگتے ہیں۔ نہر کی تعمیر میں انجینئرنگ کا بڑا شاہکار تین لاک چیمبرز ہیں۔ ان میں سے ہر لاک چیمبرز 1000 فٹ لمبا اور 110 فٹ چوڑا ہے۔ چیمبرز کے دروازے 7 فٹ موٹے، 65 فٹ چوڑے اور 82 فٹ اونچے ہیں۔ چھوٹے جہاز اپنی طاقت سے اور بڑے جہاز انجنوں کی مدد سے دھکیل کر چیمبرز سے باہر نکالے جاتے ہیں۔ لاک چیمبرز کو بلاتعطل پانی کی سپلائی جھیل گاتن اور دریائے چاجرز (Chagres) کے ذریعے ہوتی ہے۔

نہر کی تعمیر کا منصوبہ 1913ء میں مکمل ہوا جبکہ نہر کو اگست 1914ء میں کھولا گیا اور پہلا بحری جہاز 15 اگست 1914ء کو نہر میں داخل ہوا۔ 18 نومبر 1903ء سے نہر پانامہ کا کنٹرول امریکہ کے پاس تھا۔ 1977ء میں امریکی سینیٹ نے ایک مسودہ قانون کی منظوری دی جس کے تحت 31 دسمبر 1999ء کو نہر پانامہ کا کنٹرول حکومت پانامہ کے حوالے کر دیا گیا۔ امریکہ نے 1998ء سے ہی اپنی فوجوں کا پانامہ سے انخلا شروع کر دیا تھا۔ معاہدے پر 31 دسمبر 1999ء کو ایک تقریب میں امریکی سابق صدر جمی کارٹر اور پانامہ کی پہلی خاتون صدر میریا موسکوسو نے دستخط کیے۔ معاہدے کے بعد نہر پانامہ کا علاقہ پانامہ کی ملکیت میں چلا گیا لیکن اس معاہدے کے تحت دونوں حکومتوں نے اس بات کی ضمانت دی کہ نہر کے علاقے کو ہمیشہ غیر جانبدار رکھا

جائے گا۔

1903ء سے لے کر آج تک امریکہ 3 بلین ڈالر سے زیادہ رقم نہر پر خرچ کر چکا ہے جس میں سے تقریباً دو تہائی رقم اس نہر کی آمدنی کی صورت میں اسے واپس موصول ہو چکی ہے۔ 1996ء میں پانامہ کینال کمیٹی نے ایک بلین ڈالر سے اس کا ماڈرنائزیشن پروگرام شروع کیا اور نئے آلات اور ٹیکنالوجی کے استعمال کے ذریعے اس کی گنجائش اور صلاحیت میں اضافہ کیا۔

❀ ❀ ❀

آئس لینڈ

(Iceland)

برف کا جزیرہ

شمالی بحراوقیانوس میں واقع جزیرہ آئس لینڈ جزیرہ گرین لینڈ کے مشرق میں 300 کلومیٹر (185 میل) اور ناروے کے مغرب میں 1000 کلومیٹر (620 میل) کے فاصلے پر ہے۔ 103,000 مربع کلومیٹر (39,768 مربع میل) رقبے پر مشتمل یہ جزیرہ پرتگال سے بڑا ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ چاند کی طرح غیرآباد اور ویران نظر آتا ہے۔

آئس لینڈ بحراوقیانوس اور بحرآرکٹک کے درمیان ایک ایسا جزیرہ ہے جہاں ہر طرف برف کے میدان ہیں۔ اس کی مشرق سے مغرب تک لمبائی 485 کلومیٹر (300 میل) اور شمال سے جنوب تک چوڑائی 305 کلومیٹر (190 میل) ہے۔ جزیرے کی شکل بیضوی اور ناہموار ہے اور یہ آتش فشانی پہاڑوں کا خطہ ہے۔ یہاں بڑے بڑے برف کے میدان، گلیشیئر اور آتش فشانی پہاڑ واقع ہیں۔ آئس لینڈ کا بلند ترین مقام ''اورانا جوکول'' 2119 میٹر بلند ہے۔

آئس لینڈ اپنے نام کی مناسبت سے ٹھنڈا نہیں ہے بلکہ خلیجی ندی کی وجہ سے یہ گرم رہتا ہے۔ آتش فشاں لاوے نے اس کے بنجر حصوں پر سرمئی آتش فشانی پتھروں کی ایک تہہ بچھا دی ہے۔ دیہی علاقے کا تقریباً 8واں حصہ ایک بہت بڑے گلیشیئر ویٹنا جوکل سے ڈھکا ہوا

ہے جس کے گرد آئس لینڈ کا سب سے اونچا آتش فشاں پہاڑ ماؤنٹ ہیلکا ہے جو 1446 میٹر (4744 فٹ) بلند ہے۔ 1104ء کے بعد سے اب تک یہ پہاڑ 15 بار بڑے خوفناک انداز میں پھٹا ہے اور اس سے لاوا نکلا ہے۔

آتش فشانی پہاڑوں کے علاوہ آئس لینڈ پر بے شمار گرم پانی کے چشمے اور گرم پانی کے فوارے ہیں اور ایسے مقامات موجود ہیں جہاں سے مختلف قسم کی گیسیں نکلتی ہیں۔ ڈیلڈ ارٹن گیور سے ایک سیکنڈ میں 53 گیلن ابلتا ہوا پانی خارج ہوتا ہے۔ آئس لینڈ کے شہری ان فواروں اور چشموں سے حاصل ہونے والے گرم پانی سے اپنے گھر کو گرم رکھنے اور سارا سال نہانے کے تالابوں کو گرم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے ذریعے یہاں گرم ملکوں میں پیدا ہونے والے پھل اگائے جاتے ہیں۔

موسم گرما میں آئس لینڈ میں سبزہ اور جنگلی پھول نظر آتے ہیں۔ گلیشیئر سے بہہ کر آنے والی ندیاں اپنے ساتھ سالمن مچھلیاں لے کر آتی ہیں۔ لیکن طویل موسم گرما میں جب ہر طرف برف کی تہیں بچھ جاتی ہیں تو یہ چیزیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں کا موسم بھی بڑا تلون مزاج ہے کہ ہر وقت تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چمکیلے آسمان پر سورج چمک رہا ہوتا ہے کہ یکا یک طوفانی جھکڑ چلنے لگتے ہیں پھر اچانک برف کا طوفان آ جاتا ہے اور سرد ہوائیں فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ چند گھنٹوں بعد ہی موسم کے تیور پھر بدلتے ہیں اور زمین پر سورج کی گرم کرنیں بکھر جاتی ہیں۔

آئس لینڈ ان خطوں میں شامل ہے جہاں رہائش اختیار کرنا کافی مشکل ہے لیکن اس کے باوجود ایک ہزار سال سے یہ جزیرہ آباد ہے۔ یہاں سب سے پہلے 8ویں صدی عیسوی میں آئرش راہب وارد ہوئے لیکن انہوں نے آبادکاری 870ء میں شروع کی۔ 874ء میں نارویجن وائکنگ انگولفر آرناسن (Ingolfur Arnason) ناروے سے فرار ہو کر آئس لینڈ پہنچا۔ اسی سال انگولفر نے ریکجاوک شہر کی بنیاد رکھی جو آئس لینڈ کا دارالحکومت ہے۔ وائکنگز اب ساتھ بہت سے غلام لے کر آئے۔ اس طرح یہاں ناروے کی پرانی زبان کی بنیاد پر آئس لینڈ کی اپنی ایک زبان وجود میں آئی۔ اس زبان میں دنیا کا ایک وسیع ادب موجود ہے۔ اگلے برسوں کے دوران سیکنڈے نیوین ممالک اور برطانوی جزیروں سے بڑی تعداد میں لوگ اس

جزیرے میں آباد ہوئے اور آئس لینڈ کی آبادی 25 ہزار ہوگئی۔

930ء میں آئس لینڈ جمہوری ملک بنا اور پہلی یورپی پارلیمنٹ آلتھنگ (Althing) قائم ہوئی۔ 10ویں صدی عیسوی میں مشنریوں نے یہاں عیسائیت متعارف کرائی۔ 13ویں صدی کے دوران یہاں خانہ جنگی کا آغاز ہوگیا جس کا خاتمہ 1262ء میں ہوا جب آئس لینڈ کو ناروے میں ضم کر دیا گیا۔ 1264ء میں آلتھنگ (پارلیمنٹ) نے شاہ ناروے ہاکون چہارم کو آئس لینڈ کا بھی بادشاہ تسلیم کرلیا۔ بیرونی حکمرانی کے باعث آئس لینڈک باشندے دولت کی جانب مائل ہو گئے۔ 1380ء میں ناروے ڈنمارک کی یونین قائم ہوئی تو آئس لینڈ ڈینش حکمرانی کے تحت آ گیا اور ڈنمارک کا بادشاہ آئس لینڈ کا حکمران قرار پایا۔

1944ء تک یہ جزیرہ اپنی آزاد حیثیت حاصل نہ کر سکا۔ 25 فروری 1944ء کو آلتھنگ نے معاہدہ یونین کا خاتمہ کر دیا اور 17 جون 1944ء کو آئس لینڈ ایک آزاد جمہوریہ بن گیا۔ سوین بجورن سن جمہوریہ کے پہلے صدر اور ''اولافر تھورس'' پہلے وزیراعظم بنے۔ 30 جون 1980ء کو مسز وگدس فن بوگادوٹر ملک کی پہلی خاتون صدر منتخب ہوئیں۔ یہ دنیا کی پہلی براہ راست عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی خاتون صدر تھیں۔

آتش فشانی عمل کی وجہ سے زمین کے پرتوں میں جو حرکت ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہی پچھلے 5 کروڑ سال میں آئس لینڈ سطح سمندر پر ابھرا ہے۔ تبدیلیوں کا یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ اس کا ثبوت آئس لینڈ کے جنوبی ساحل کے نزدیک ابھرنے والے نئے جزیرے ''سرتے'' سے ملتا ہے۔ نومبر 1963ء میں سرتے کا ایک کونہ سمندر سے ابھرا اور پھر پورے ساڑھے تین سال تک آہستہ آہستہ سمندر سے بلند ہوتا رہا اور آخر ایک مربع میل پر مشتمل ایک جزیرہ بن گیا جو سطح سمندر سے 561 فٹ بلند ہے۔ یہ جزیروں کے سلسلے ویسٹ مین کا آخری جزیرہ ہے۔

گرین لینڈ

(Greenland)

دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ

شمالی امریکہ کے شمال مشرق میں شمالی بحراوقیانوس میں واقع گرین لینڈ کا رقبہ 21 لاکھ 75 ہزار 600 مربع کلومیٹر (8 لاکھ 40 ہزار مربع میل) ہے۔ اگر براعظموں کو شامل نہ کریں تو یہ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے جو کہ شمالی بحراقیانوس اور بحر آرکٹک کے درمیان واقع ہے۔ اس کی شرقاً غرباً لمبائی 1290 کلومیٹر (800 میل) ہے۔ اس کی سرزمین سرسبز اور گھنے جنگلات پر مشتمل ہے۔

اس کے شمال میں بحر منجمد شمالی، مشرق میں بحیرہ گرین لینڈ، جنوب مشرق میں آبنائے ڈنمارک جبکہ جنوب میں اس جزیرے اور آئس لینڈ کے درمیان بحراوقیانوس واقع ہیں۔ اس کی ناہموار ساحلی پٹی اندازاً 24 ہزار 400 میل طویل ہے اور اس ساحلی پٹی کی طوالت تقریباً اتنی ہی ہے جتنی خط استواء پر زمین کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک فاصلہ ہے۔ گرین لینڈ کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر پہاڑی سلسلے واقع ہیں۔

شمال سے جنوب کی سمت یہ جزیرہ تقریباً 1660 میل لمبا ہے۔ اس کا صرف 30 ہزار مربع میل قطعہ اراضی برف کے بغیر ہے۔ باقی کا تقریباً 7 لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ انتہائی دبیز برف کی چادر سے ڈھکا ہے۔

گرین لینڈ کا دارلحکومت گوڈ تھاب (Godthaab) جبکہ آبادی 56ہزار کے لگ بھگ ہے۔ گرین لینڈ کو 982ء میں ایک نارویجن مہم جو ایرک دی ریڈ (Eric The Red) نے دریافت کیا۔ اس نے مغربی ساحل کی طرف آبادکاری شروع کی۔ 1000ء میں وائکنگز نے یہاں عیسائی مذہب متعارف کرایا۔ گرین لینڈ جزیرہ سے قدیم سکنڈے نیوین لوگ آشنا تھے۔ 1585ء میں اسے جان ڈیوس نے دوبارہ دریافت کیا۔ اہل ڈنمارک نے 1721ء میں یہاں پہلی بستی بسائی۔ 1774ء میں ڈنمارک نے اس پر مکمل قبضہ کرلیا۔

مئی 1921ء میں ڈنمارک نے گرین لینڈ کے پورے جزیرے کو ڈینش کی شاہی حکومت کی ملکیت قرار دیا۔ 9اپریل 1941ء کو حکومت ڈنمارک کی اجازت سے امریکہ نے یہاں فوجی اڈے قائم کیے۔ جنوری 1979ء میں ایک عوامی ریفرنڈم کے بعد اسے مکمل داخلی خودمختاری ملی لیکن یہ اب بھی ڈنمارک کے ماتحت ہے۔

حال ہی میں سائنسدانوں نے گرین لینڈ کی برفانی چادر پر تحقیق کا کام شروع کیا ہے تاکہ دنیا کے بدلتے ہوئے موسموں کی تاریخ کے بارے میں معلوم کیا جاسکے۔

مالٹا

(Malta)

خوابوں کی سرزمین

دنیا میں بے شمار مقامات ایسے ہیں جن کا چپہ چپہ قدرت کی رعنائیوں کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ بحراوقیانوس میں یورپ اور شمالی افریقہ کے درمیان واقع 122 مربع میل رقبہ پر مشتمل جزیرہ مالٹا بھی ایک ایسا ہی مقام ہے جس کا چپہ چپہ قابل دید ہے۔ کچھ تو اس جزیرے کو قدرت نے بے پناہ حسن بخشا ہے اور کچھ یہاں کے رہنے والوں نے بھی اسے خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

بڑا جزیرہ مالٹا گوزو (Gozo) اور گومینی (Gemini) کو ملا کر رقبہ 122 مربع میل (316 مربع کلومیٹر) جبکہ آبادی 4 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ مالٹا کی تاریخ بھی بڑی پرانی اور دلچسپ ہے۔ اس جزیرے کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ لاکھوں سال پہلے یہ یورپ اور افریقہ کے درمیان پل کا کام دیتا تھا اور یہ جزیرہ نہیں تھا۔ یہاں کے باشندے نسلاً اہل قرطاجنہ سے ہیں اور مذہباً کیتھولک عیسائی۔ یہ جزیرہ سسلی کے جنوب میں 54 میل اور شمالی افریقہ کے ساحل کے شمال میں 118 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

یوں تو مالٹا کے بارے میں زیادہ لوگ نہیں جانتے لیکن سیاحت کا شوق رکھنے والا کوئی بھی شخص اس نام سے ناآشنا نہیں ہے کیونکہ یہاں وہ سب کچھ ہے جو کوئی بھی سیاح

دیکھنے کی خواہش کر سکتا ہے۔ سرسبز پہاڑ، لہلہاتی وادیاں اور چاروں طرف پھیلا ہوا گہرا نیلا سمندر، یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کوئی خوابوں کی سرزمین ہو۔ جزیرے کا شاید ہی کوئی ایسا مقام ہو جہاں سے سمندر نظر نہ آتا ہو۔ ایک سیاح کے مطابق یہ سمندر اتنا خوبصورت، نیلگوں اور پرسکون ہے کہ اس سے پیار کرنے کو دل چاہتا ہے۔

مالٹا بہت قدیم تاریخ رکھتا ہے۔ بعض مورخین کے مطابق ہزاروں سال پرانی تحریروں میں بھی اس جزیرے کا ذکر ملتا ہے۔ جزیرے کی عمارتیں بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ یہاں تعمیر و ترقی کا عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ یہاں سیاحوں کی کثیر تعداد آتی ہے اس لیے یہاں بے شمار ہوٹل قائم ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ زیادہ تر ہوٹل قدیم عمارتوں میں قائم ہیں۔ ہوٹلوں کے علاوہ کافی شاپس اور ریستوران بھی مالٹا کے گلی کوچوں میں جابجا کھلے ہیں۔ مالٹا کے صدر اور وزیراعظم کے دفاتر بھی یہاں کی قدیم ترین عمارتوں میں قائم ہیں۔ ملکی پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت بھی صدیوں پرانی ہے۔

یورپ اور شمالی افریقہ کے عین درمیان میں واقع ہونے کی وجہ سے مالٹا کی ہمیشہ سے ہی بڑی اہمیت رہی ہے کیونکہ یہاں بیٹھ کر یورپ اور شمالی افریقہ کے بحری راستے کو بخوبی کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ مالٹا پر کنٹرول حاصل کر لینے کا مطلب دو براعظموں کے درمیان ہونے والی بحری تجارت پر بھی کنٹرول حاصل کر لینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار میں یہاں مختلف قوموں کا قبضہ رہا ہے۔ یہاں کے آقاؤں میں یونانی، کارتھیجین، رومن، اطالوی، عرب، فرانسیسی اور برطانوی شامل رہے ہیں۔

870ء میں یہ جزیرہ عربوں کے قبضے میں آیا۔ 1595ء میں اسے سسلی کی حکومت نے فتح کر لیا۔ 1530ء میں سینٹ جان کے نائٹوں (St John of Jerusalem) نے اسے تسخیر کر کے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیا۔ 12 جون 1798ء کو نپولین نے مصر جاتے ہوئے اس پر اچانک قبضہ کر لیا۔ 1814ء میں معاہدہ پیرس کی شرائط کے مطابق یہ برطانیہ کے قبضے میں آیا۔ ان سب اقوام کے یہاں آنے کا مقصد یورپ اور افریقہ کے درمیان ہونے والی بحری تجارت کو کنٹرول کرنا تھا۔ ان تمام اقوام کے اقتدار کے نشانات آج بھی یہاں بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ ہر قوم نے اپنے اپنے کلچر کے مطابق یہاں تعمیرات کیں۔ یہاں کوئی عمارت فرانسیسی طرزِ تعمیر کا نمونہ

ہے تو اس کے بالکل ساتھ والی عمارت وکٹورین طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ ساتھ ہی عربوں کا کلچر نظر آتا ہے۔

مالٹا پر عربوں کی حکومت کا عرصہ 200 سال یعنی 870ء سے 1090ء تک محیط رہا۔ اس دوران عربوں نے یہاں بے شمار عمارتیں تعمیر کیں اور عربی زبان کو فروغ دیا۔ یہاں کی سرکاری زبان مالٹی (Maltese) ہے جو عربی سے اپنا رشتہ جوڑتی ہے۔ یہاں کے لوگ عربی بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔ ''میڈنا'' (مدینہ) کا شہر بھی عربوں کا ہی تعمیر کردہ ہے جو ایک عرصے تک مالٹا کا دارالحکومت بھی رہا۔ اس شہر کے اردگرد فصیل بھی تعمیر کی گئی تھی جس کا مقصد شہر کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھنا تھا۔ اس شہر کو ''خاموش شہر'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

مالٹا کا دارالحکومت ویلٹا اس جزیرے کا واحد شہر ہے جسے باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے تعمیر کیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ شہر جرمن فضائیہ کا خاص نشانہ بنا رہا تھا کیونکہ اس شہر کی بندرگاہ سے اتحادیوں کے بحری جہاز تیل اور رسد حاصل کرتے تھے۔ ویلٹا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے بلند مقامات سے مالٹا کے دوسرے شہروں کا نظارہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ 122 مربع میل رقبہ پر مشتمل مالٹا میں 5 شہر اور 100 سے زیادہ دیہات ہیں۔

مالٹا کے ساتھ دو اور جزیرے ''گوزو'' اور ''کومینو'' بھی مالٹا کا ہی حصہ ہیں۔ یہ تینوں جزائر آپس میں ''بوٹ سروس'' اور تیز رفتار ہیلی کاپٹر سروس کے ذریعے منسلک ہیں۔ جزیرہ گوزو دوسرے دونوں جزائر سے زیادہ زرخیز ہے۔ اس جزیرے کو خوبصورت ساحلوں کی وجہ سے بھی بہت شہرت حاصل ہے۔ مالٹا دنیا کے ان چند ایک ممالک میں شامل ہے جہاں ہر موسم میں سیاحوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ مالٹا پانی کی ہر قسم کی کھیلوں کے لیے بھی انتہائی مناسب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کھیلوں کے شوقین دنیا کے کونے کونے سے مالٹا کی جانب کھنچے چلے آتے ہیں۔ جزیرے کے اردگرد واقع زیر آب آبی غاروں میں ایک الگ ہی دنیا آباد ہے۔ جب چھوٹی کشتیاں ان غاروں میں داخل ہوتی ہیں تو قدرت کی ہیبت دیکھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ بوٹس کے نیچے بحراوقیانوس کا نیلا پانی اور اردگرد بلند و بالا پتھریلی دیواریں دیکھنے والوں پر عجیب و غریب قسم کا تاثر چھوڑتی ہیں۔

❀ ❀ ❀

ہانگ کانگ

(Hong Kong)

دنیا کی بہترین اور آزاد بندرگاہ

چین کا ماتحت علاقہ ہانگ کانگ چین کے جنوبی سرے پر واقع 11 میل لمبا اور 2 سے 5 میل تک چوڑا ہے۔ چین کے ساحل (جہاں کولون آباد ہے) اور اس جزیرے کے درمیان ایک جگہ صرف دو فرلانگ کا فاصلہ ہے۔ ہانگ کانگ کی بندرگاہ دنیا کی چند اچھی اور بہترین بندرگاہوں میں سے ایک ہے۔ جنوبی چین کی برآمدی تجارت زیادہ تر اسی بندرگاہ سے ہوتی ہے۔

ہانگ کانگ چین کے ساحلی صوبے کانٹگ میں دریائے ہسی چنگ کے دہانے پر واقع ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ مرکزی ہانگ کانگ جس میں ہانگ کانگ جزیرہ نما کولون کا مرکزی حصہ شامل ہے جبکہ دوسرا حصہ جو ''نئی آبادی'' کہلاتا ہے اردگرد کے 230 ننھے منے جزیروں پر مشتمل ہے۔ ہانگ کانگ کا زیادہ تر علاقہ ڈھلوانی اور پہاڑی ہے۔ اس کی سب سے اونچی چوٹی ''تی موشن'' کی بلندی 957 میٹر (3140 فٹ) ہے۔ اس کا سب سے لمبا دریا شم چن ہے۔ ہانگ کانگ کا سب سے جدید اور ماڈرن علاقہ وکٹوریہ ہے جو اس کا دارالحکومت بھی ہے۔ یہ دنیا کی بہترین قدرتی بندرگاہ اور فلک بوس عمارتوں کا گنجان آباد شہر ہے۔

یہاں بہت بڑی گودی ہے۔ جزیروں اور خاکناؤں میں مچھیرے آباد ہیں ان کی

زندگی کا بیشتر حصہ سمندر ہی میں سے گزرتا ہے۔ ہانگ کانگ بحرالکاہل کے علاقوں میں بنکاری کا سب سے بڑا مرکز بھی ہے۔ آزاد بندرگاہ ہونے کے سبب سے یہ اہم تجارتی مرکز بھی ہے۔ اس کا شمار دنیا میں سب سے زیادہ ٹیکسٹائل، کھلونے، پلاسٹک کا سامان اور الیکٹرانکس پیدا کرنے والوں میں ہوتا ہے۔

اس وقت ہانگ کانگ دنیا میں سب سے زیادہ گنجان آباد علاقہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں کی آبادی کے تناسب کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں ایک مربع میل رقبے میں تقریباً 12 ہزار لوگ رہتے ہیں۔ یہاں رہائش کا مسئلہ نہایت سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ یہاں ایسے افراد بھی ہیں جو مستقل طور پر کشتیوں میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ہانگ کانگ کی زندگی کا ایک اہم پہلو جرائم سے متعلق بھی ہے۔ سمگلنگ، منشیات کا کاروبار اور قمار بازی، نائٹ کلب کے حوالے سے یہ جزیرہ بہت بدنام رہا ہے۔

1800ء کے دوران برطانوی آبادکاروں نے یہاں آ کر تجارت شروع کی۔ یہ تجارت زیادہ تر افیون پر مشتمل تھی۔ اگرچہ چین میں مانچو حکومت نے افیون کی تجارت غیر قانونی قرار دے دی تھی لیکن اس کے باوجود ایسٹ انڈیا کمپنی 1834ء سے کینٹن میں افیون برآمد کرنے کا نفع بخش کاروبار کر رہی تھی۔ 1839ء میں چین کے حکام نے کینٹن میں تمام غیر ملکیوں کے گھروں اور گوداموں کا محاصرہ کر لیا اور مطالبہ کیا کہ وہ افیون کا کاروبار کرنے والوں کو ان کے حوالے کریں۔ 6 ہفتے کے طویل محاصرے کے بعد انگریزوں نے 20 ہزار افیون سے بھرے ہوئے صندوق چین کے حکام کے حوالے کر دیئے۔ اس کے بعد انگریزوں نے ایک مضبوط مہم شروع کی کہ چین کو ایک ایسا تجارتی معاہدہ کرنے پر مجبور کیا جائے جس کے تحت وہ جزیرے کا انتظام برطانیہ کے حوالے کر دئے۔

اسی کشمکش کے دوران 26 جنوری 1841ء کو ہانگ کانگ پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ اسی دوران برطانیہ اور چین کے مابین جنگ افیون لڑی گئی۔ اس طرح افیون کے خلاف ہونے والی یہ پہلی جنگ 1842ء میں معاہدہ نانکنگ پر ختم ہوئی۔ اس معاہدہ کے تحت ہانگ کانگ پر انگریزوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ 19 اگست 1843ء کو اسے باضابطہ طور پر برطانوی کالونی قرار دے کر یہاں سر ہینڈری پوٹنگر کو پہلا برطانوی گورنر مقرر کیا گیا۔ 1861ء میں انگریزوں نے کولون

پر بھی قبضہ کرلیا۔

1898ء میں برطانیہ نے صوبہ آن تنگ کے جنوبی حصے اور بعض دوسرے جزائر بھی 99 برس کے لیے چین سے پٹے پر حاصل کر لیے اور اس طرح یہاں اپنی نوآبادی قائم کر لی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران 1941ء میں جاپان نے ہانگ کانگ پر قبضہ کرلیا اور 1945ء تک وہ اس کے حکمران رہے۔ مگر جنگ میں جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد انگریز پھر اس پر قابض ہو گئے۔

یکم جولائی 1997ء کو معاہدے کے مطابق ہانگ کانگ چین کے حوالے کر دیا گیا اور یہاں کا 28 واں اور آخری برطانوی گورنر کرس پیٹن بھی یہاں سے رخصت ہو گیا۔ چین کی طرف سے تنگ چی ہوا (Tung-Chee-Hwa) یہاں کے پہلے چیف ایگزیکٹو مقرر ہوئے۔

ناؤرو

(Nauru Island)

دنیا کا سب سے چھوٹا جزیرہ اور چھوٹی جمہوریہ

ناؤرو آسٹریلیا کے شمال مشرق میں بحرالکاہل میں ایک ننھا منا سا جزیرہ ہے۔ یہ سڈنی (آسٹریلیا) سے 2500 میل ہونولولو (ہوائی) سے 2600 میل اور ٹوکیو (جاپان) سے 3000 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ بحرالکاہل میں واقع خط استواء سے 26 میل جنوب کی طرف ایک ہی جزیرہ ہے۔ اس کا محیط 12 میل، لمبائی 4 میل اور چوڑائی 3 میل ہے۔ یہ ایک اونچا، مرجانی اور بیضوی شکل کا جزیرہ ہے۔ جزیرہ نہایت زرخیز، سرسبز، خوبصورت مناظر سے بھرپور اور چکنی مٹی سے بنا ہے۔

ناؤرو جزیرے کو 1798ء میں ایک انگریز جہازراں کیپٹن جان فیرن (John Faren) نے دریافت کیا اور اسے پلیزنٹ آئی لینڈ کا نام دیا۔ اس زمانے میں اس جزیرے کے باشندے باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ ناریل، جنگلی پھل، مچھلی اور پرندوں کے شکار پر ان کا گزارہ تھا۔ 1830ء کی دہائی کے دوران ناؤرو ویل مچھلی پکڑنے والے جہازوں کا اہم ذریعہ بن گیا۔ یہ جہاز زیادہ تر امریکہ سے آتے تھے۔ 1881ء میں اس جزیرے پر جرمنوں نے قبضہ کر لیا اور اسے ناؤرو (Naoero) کا نام دیا۔ جرمنوں نے یہاں فاسفیٹ کی کانیں دریافت کیں۔ اس کے بعد یہ جزیرہ 87 سال تک آسٹریلیا، برطانیہ اور

نیوزی لینڈ کے قبضے میں رہا۔ 31 جنوری 1968ء کو یہ جزیرہ آزاد ہوکر دنیا کی سب سے چھوٹی جمہوریہ بن گیا۔

2004ء کے ایک جائزے کے مطابق دنیا کی سب سے چھوٹی جمہوریہ ناؤرو فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا کا امیر ترین ملک تھا۔ اس کی فی کس آمدنی امریکہ، جاپان، کویت، متحدہ عرب امارات اور قطر سے زیادہ ہے۔ 10 ہزار کی آبادی پر مشتمل جزیرے کی دولت کا راز اعلیٰ درجے کی فاسفورس (فاسفیٹ) کی کانیں ہیں۔ فاسفیٹ، فاسفورک ایسڈ کا نمک ہوتا ہے جس سے کھاد، چینی کے برتن اور شیشہ وغیرہ بنایا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں اس کی مانگ ہے اور ناؤرو کی حکومت کو اس سے ہر سال کروڑوں ڈالر کی آمدن ہوتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں سال پہلے سمندری جاندار اس جزیرے میں دفن ہوتے رہے جن کی باقیات کی وجہ سے فاسفورس بنی۔

ناؤرو کے شہریوں پر کوئی ٹیکس لاگو نہیں۔ انہیں مفت طبی امداد، تعلیم، ٹرانسپورٹ اور ٹیلیفون کی سہولتیں میسر ہیں۔ ملک کا کوئی شہری جب شادی کرتا ہے تو حکومت کی طرف سے اسے ایک آراستہ مکان مفت ملتا ہے جس کی مرمت اور دیگر اخراجات حکومت کے ذمہ ہوتے ہیں۔ روزمرہ ضروریات کی اشیاء کی وہاں افراط ہے۔ اگرچہ پورے جزیرے کا چکر صرف 20 منٹ میں لگایا جاسکتا ہے پھر بھی ایک خاندان کے پاس تین تین چار چار گاڑیاں ہیں۔ اتنی امارت کے باوجود یہاں کے لوگ سادگی پسند ہیں اور فرش پر چٹائیوں پر سوتے ہیں۔

جزیرے پر دس قبائل آباد ہیں۔ ہر ایک کے رسم و رواج علیحدہ ہیں۔ کسی ایک قبیلہ کا فرد کسی دوسرے قبیلے کے رسم و رواج پر عمل نہیں کرسکتا۔ لوگ انتہائی خوش مزاج اور سخی ہیں جو کوئی کسی سے مانگے مثلاً کار، کشتی یا ریفریجریٹر اسے مفت دے دیا جاتا ہے۔ یہاں کی حکومت مستقبل سے باخبر ہے کہ فاسفیٹ کے ذخائر نے بالآخر ختم ہوجانا ہے۔ اسی لیے ناؤرو کی حکومت نے آسٹریلیا کی 52 منزلہ عمارت سمیت دنیا بھر میں جائیدادیں اور کاروبار قائم کر رکھے ہیں۔

سوئٹزرلینڈ کی طرح ٹیکس فری ریاست ہونے کی وجہ سے یہ ملک دنیا بھر کے سرمایہ داروں کے لیے جنت ہے۔ اس وقت ناؤرو کی فی کس آمدن 5 لاکھ امریکن ڈالر (تقریباً

3 کروڑ روپے) ہے۔ صدر جمہوریہ کا سربراہ مملکت، سربراہ حکومت، مسلح افواج کا کمانڈر انچیف اور تمام انتظامی اختیارات کا مالک ہے۔ ملک میں صرف ایک سیاسی جماعت ''ڈیموکریٹک پارٹی آف ناؤرو'' (DPN) کا وجود ہے۔ 2003ء میں ناؤرو میں صرف چین کا سفارت خانہ موجود تھا۔

❁ ❁ ❁

مقدس جاپانی جزیرہ

(Holy Japanese Island)

جہاں کی سرزمین جنت کے نظارے پیش کرتی ہے

یہ دنیا بہت حسین ہے کہیں سرسبز پہاڑ، سرسبز وادیاں، بل کھاتی ندیاں حسین نظارہ پیش کرتی ہیں اور کہیں سرسبز کھیت اور میدان نظر آتے ہیں۔ اس زمین پر سمندر بھی ہیں اور تپتے صحرا بھی لیکن ہر شے کی الگ خوبصورتی ہے۔ ان کے رنگ آنکھوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ دنیا میں ایک خوبصورت جنت نظیر مقام جاپان کا جزیرہ ''میاجیما'' ہے جو قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ مذہبی اعتبار سے بھی جاپانیوں کے لیے خاص اہمیت کا حامل ہے۔

اس دلفریب نظاروں کے حامل جزیرے تک پہنچنے کے لیے جاپان کے سانیو ساحل کی جانب سفر کرنا پڑتا ہے۔ جب یہ جزیرہ نظر آتا ہے تو آدمی کا دل چاہتا ہے کہ وہ یہ دلکش مناظر ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھوں میں سمو لے۔ چاروں طرف سبزہ اور کہیں کہیں نیلگوں پانی طبیعت میں سرشاری کی کیفیت اجاگر کر دیتا ہے۔ بلند و بالا چوٹیوں کے سائے میں بل کھاتی ندیاں حسن کا جادو بکھیرتی ہیں۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر سرسبز جنگلات انتہائی خوشنما دکھائی دیتے ہیں۔ قدرت کے ان حسین نظاروں میں گھرے جزیرے میاجیما کو مقدس جزیرے کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں جینے مرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جاپانی اعتقاد کے مطابق اس سرزمین پر جابجا دیوی دیوتا ہرنوں کا روپ دھارے سرگرداں رہتے ہیں۔

دھند سے لپٹی پہاڑی چوٹیوں کی اس سرزمین پر عام لوگوں کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ صدیاں گزرنے کے بعد معتقد لوگوں نے اس رسم میں تبدیلی کی۔ ہر آنے والے کے لیے یہاں موجود مقدس مزار تک پہنچنے سے پہلے ''دروازے اوٹوری'' سے گزرنے کی پابندی لگا دی۔ ان کے مطابق یہ عمل روح کو پاک کر دیتا ہے۔ یہ دروازہ پانی میں ایستادہ ہے۔ زائرین کی بڑھتی تعداد کے پیش نظر پانی میں لکڑی کی ایک گودی تعمیر کر دی گئی ہے تا کہ وہ اس رسم کی ادائیگی کر سکیں۔

میاجیما کے جزیرے میں یہ دروازہ یا گزرگاہ ایک عظیم نشان بن چکا ہے۔ 1875ء میں اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا شمار جاپان کے تین قابل دید مناظر میں کیا جاتا ہے۔ پانی میں اس مقدس اور قدیم دروازے کی موجودگی جاپان کے اس جزیرے کی اہمیت کو چار چاند لگانے کے لیے کافی ہے۔ جزیرے کے حسن میں ڈوبے مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے سیاح جب اس دروازے کو دیکھتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ یہ انہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

پانی کی لہروں پر سفر کرنے کے بعد سیاحوں کے قدم جاپانی عبادت گاہ کی جانب بڑھتے ہیں۔ جاپانی عقائد کے مطابق پانی کی دیوی ''اچی کی شیما'' اس عبادت گاہ میں رہتی تھی۔ چونکہ وہ اکیلی تھی شاید اسی لیے اس تنہا دیوی کی عبادت گاہ میں جوڑوں کو اکٹھے حاضری کی اجازت نہیں ہے۔ مرد و خواتین الگ الگ اپنی روح کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ بڑے بڑے ہالوں میں جلتی لالٹین عجب سرشاری کا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ عبادت گاہ میں داخلے کے لیے 50 فٹ کا دروازہ لگا ہے۔ یہ 1168ء میں بنایا گیا تھا اور اس وقت سے اسی حالت میں موجود ہے۔

عبادت گاہ کے علاوہ جزیرے کا سب سے خوبصورت پہاڑ ''میسن ماونٹین'' ہے۔ یہاں جانے والے افراد اس پہاڑ کے خوبصورت نظاروں سے ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چوٹی پر میپل لیف پارک کے گھنے جنگل تک پہنچنے کے لیے پگڈنڈی بنی ہوئی ہے۔ یہاں پر کیبل کار کا نظام بھی نصب ہے جس میں بیٹھ کر جزیرے کی سیر کی جا سکتی ہے۔ یہاں ایک پتھر پیالے کی شکل اختیار کر چکا ہے جس میں سمندری پانی موجود ہے۔ تیسری انوکھی چیز صنوبر کا

ایک درخت ہے جو سال کے مخصوص حصوں میں روشنیوں سے چمکتا ہے۔

اس جزیرے میں ایک عجیب وغریب شکل کی مخلوق موجود ہے جس کے پر بھی ہیں اور ناک بھی بہت لمبی ہے۔ یہ جنگل میں ادھر ادھر گھومتی دیکھی گئی ہے۔ کچھ عجوبوں کا تعلق ''کوبوڈیشی'' دور (774-835ء) سے ہے۔ وہ جاپان میں بدھ مت کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ وہ جزیرے پر 9ویں صدی میں وارد ہوئے۔ ایک آلوچے کا قدیم درخت ''شکوجونوام'' اس جگہ اگا تھا۔ جہاں کبھی اس عظیم بدھ بزرگ نے اپنا کچھ سامان دبایا تھا۔ اس درخت سے ایک کرامت منسوب ہے۔ جس کے مطابق اگر اس درخت پر موسم بہار میں دوہری پتیوں والا پھول نہ کھلے تو یہ بری علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔

''منڈالا روک'' ایک بہت دیو قامت پتھر ہے جس پر اس بزرگ نے اپنے ہاتھ سے بدھ مت کے متعلق چند اہم باتیں کندہ کی تھیں۔ سب سے آخری حیران کن چیز'' کی رونو ریکاڈو'' ہے یعنی ایسی آگ جو صدیوں سے جل رہی ہے۔ اس جگہ پر 1200 سال پہلے آگ جلائی گئی تھی جو اس کے بعد کبھی بجھی نہیں۔ یہاں کے مقامی باشندوں کا خیال ہے کہ اس آگ پر بنی چائے پینے والے کی تمام بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ پہاڑ سے اترتے ہوئے ایک جانب کئی ٹمپل اور پگوڈا بنے ہوئے ہیں جہاں مذہبی عبادت ادا کی جاتی ہیں۔ انہی کی وجہ سے یہ جزیرہ مقدس جزیرہ کہلاتا ہے۔

اس جزیرے کی ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کی ترقی سے بے نیاز ہے۔ یہاں پرانے روایتی طریقے اور رسم ورواج کو زندہ رکھا گیا ہے۔ یہاں کا روایتی رقص ''یوگاکو'' کہلاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا آرٹ ہے جو صدیوں قبل بھارت سے کوریا کے ذریعے جاپان تک پہنچا تھا۔ اس میں تھیٹر، لوک گیتوں، موسیقی اور لوک کہانیوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس میں حصہ لینے والے مخصوص لباس، ماسک، نیزوں اور تلواروں کے ساتھ مختلف کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

استنبول

(Istanbul)

ایک عظیم ثقافتی مرکز

استنبول پہلے قسطنطنیہ کہلاتا تھا۔اسے بازنطینی (Bazentine) سلطنت کے شہنشاہ کانسٹنٹائن اعظم (Constantine The Great) نے آباد کیا۔ بازنطینی حکمران جنہوں نے 660 قبل مسیح سے 330ء تک حکومت کی وہ اسے بازنطیم اور نیوروم بھی کہتے تھے۔ 330ء میں کانسٹنٹائن اعظم نے اسے مشرقی رومن یا بازنطینی سلطنت کے دارلحکومت کے لیے منتخب کیا اور اپنے نام پر قسطنطنیہ (Constaninople) رکھا۔

ابتداء میں اہل فارس (ایران) اور پھر 405 قبل مسیح میں اہل سپارٹا نے اس پر قبضہ کر لیا۔ تیسری صدی ق م میں یہ سکندر اعظم کی عملداری میں رہا اور پھر یہ صدیوں تک یونانی تہذیب کا مرکز رہا۔196ء میں رومی شہنشاہ سپٹی مس سیورز (Septimus Severus) نے اس شہر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ مسلمانوں نے سب سے پہلے امیر معاویہ کے عہد میں اس شہر کا محاصرہ کیا۔ اس کے بعد کئی اور ناکام محاصرے بھی ہوئے بالآخر مئی 1453ء میں سلطنت عثمانیہ کے حکمران سلطان محمد فاتح نے اسے تسخیر کیا۔ اس کے بعد یہاں پر عثمانی ترکوں کی حکومت قائم ہوئی۔ 1453ء سے نومبر 1922ء تک یہ شہر سلطنت عثمانیہ کا دارلخلافہ رہا۔

استنبول بحیرہ مارمورا میں رودبار باسفورس (Bosphorus) پر واقع ہے۔ نقشے میں یہ

شہر دو براعظموں ایشیا اور یورپ کے درمیان واقع ہے اور بحیرہ مارمورا اور بحیرہ اسود کے درمیان آبنائے باسفورس کے بائیں کنارے یورپی ساحل پر آباد ہے۔ شاخ زریں اسے دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے۔ قدیم شہر بائیں طرف اور جدید شہر دائیں طرف آباد ہے۔

اس شہر نے بازنطینی سلطنت کی بہاریں اور پھر زوال بھی دیکھے۔ آخری دور میں بازنطینی سلطنت صرف اس شہر اور چند نواحی علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ شہر آبنائے باسفورس کے کنارے سات پہاڑیوں پر بسایا گیا تھا اور دفاع کی غرض سے اس کے گرد تین فصلیں تعمیر کی گئی تھیں۔ قرون وسطیٰ کے یورپ کا یہ سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کی شکل محصور قلعے کی سی تھی جس کے دامن میں بے شمار شاندار محل، گنبد اور مینار تھے۔ 10ویں صدی عیسوی میں جب یہ شہر عروج پر تھا اس وقت اس کی آبادی دس لاکھ نفوس تھی۔

یہاں کی مشہور ترین یادگاروں میں آیا صوفیہ کا گرجا، شہنشاہوں کا مقدس محل، گھڑ دوڑ کا وسیع و عریض میدان اور باب زریں شامل تھے۔ اس کی تباہی سے قبل اس کی دولت اور علم و فن کا اندازہ کرنا انتہائی مشکل ہے لیکن سلطنت عثمانیہ کے قبضے میں آیا تو اس کی شان و شوکت بحال ہو گئی اور یہ بڑا یورپی مرکز شمار ہونے لگا۔ عثمانیوں کا دربار ''باب عالی'' کہلاتا تھا۔ ترکی کے انقلاب کے بعد 1923ء میں دارالحکومت انقرہ چلا گیا۔ 28 مارچ 1930ء کو اس کا نام تبدیل کر کے استنبول رکھا گیا۔ یہ تین الفاظ ''اس۔ تن۔ پولن'' کا مرکب ہے جس کا مطلب ہے ''اندرون شہر''۔

استنبول دو براعظموں ایشیا اور یورپ کا حد فاصل ہے۔ اس کی مساجد کے بلند ترین میناروں اور مشرقی طرز کے بازاروں نے اسے ایک ایشیائی شہر بنا دیا ہے حالانکہ یہ آدھے سے زائد یورپ میں واقع ہے۔ یہاں کے لوگ یورپی طرز کا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ یہاں کے بازاروں میں کوئی برقع پوش خاتون نظر نہیں آئے گی۔

آبنائے باسفورس بحیرہ مارمورا اور بحیرہ اسود کے درمیان ایک رودبار جو 18 میل لمبی اور آدھ میل سے 3 میل چوڑی ہے۔ 1841ء کے ایک معاہدے کی رو سے اس میں ماسوائے ترک جنگی جہازوں کے کوئی اور جنگی جہاز داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ 1918 میں یہاں سے فوجیں نکال کر اسے غیر فوجی علاقہ قرار دے دیا گیا مگر 1936ء میں ایک اور معاہدہ ہوا جس کی بنا پر

ترک حکومت کو اس کی قلعہ بندی کی اجازت مل گئی۔ اس آبنائے پر ایک معلق پل بنایا گیا ہے۔ اس پل کا پہلا مرحلہ 1973ء میں مکمل کیا گیا۔ یہ پل یورپ اور ایشیا کے سیکشنوں کو باہم ملاتا ہے۔

استنبول میں توپ کاپی سرائے مشہور مقام ہے۔ یہ سلطنت عثمانیہ کے حکمرانوں کی رہائش گاہ تھی۔ یہ ایک بہت وسیع وعریض باغ کے وسط میں بنی ہوئی ہے۔ اس میں خزانہ کی عمارت، تخت کا کمرہ، بغداد کے آثار کی نمائش گاہ کا کمرہ اور لائبریری اہم جگہیں ہیں۔ اس گنبد نما عمارت کا اندرونی حصہ بیل بوٹوں سے منقش ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک چھوٹا سا میوزیم بھی ہے جہاں حضور نبی کریمؐ کے تبرکات رکھے گئے ہیں۔

ڈولما باغیچے محل باسفورس کے ساحل پر واقع ہے جسے 1850ء اور 1858ء کے دوران تعمیر کیا گیا۔ یہ ترک فن تعمیر کا بے مثال نمونہ ہے۔ تخت کے کمرے میں عثمانی دور کا نفیس فرنیچر، قالین اور غالیچے پڑے ہیں۔ یہاں ترکی کے آخری خلیفہ عبدالمجید دوم رہتے تھے۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کی موت بھی یہیں واقع ہوئی تھی۔ آج کل یہ عمارت سرکاری مہمانوں کی رہائش کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ صدر ترکی بھی استنبول آمد پر یہیں قیام کرتے ہیں۔ آبنائے باسفورس کے کنارے تعمیر شدہ محلات میں سب سے زیادہ خوبصورت ''بائیلر بی محل'' (Beylerbeyi Palace) ہے۔ اس دیدہ زیب محل کی تعمیر 1865ء میں مکمل ہوئی۔ 1869ء میں فرانس کی ملکہ یوجینی نے دورہ ترکی کے دوران یہیں قیام کیا تھا۔ ایک اور سنکن محل (Sunken Palace) سینٹ حاجیہ صوفیہ کے قریب واقع ہے جسے 1400 سال پہلے شاہ جسٹینین نے تعمیر کرایا۔ اس محل کے 336 ستون اب تک اس کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔

❀ ❀ ❀

اینجل فالز

(Angel Falls)

دنیا کا بلند ترین آبشار

دنیا کا سب سے اونچا آبشار اینجل فالز ہے جہاں سے پھوٹنے والا پانی 3210 فٹ کی بلندی سے نیچے گرتا ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی دنیا کا منفرد ریکارڈ ہولڈر آبشار ہے کہ یہاں اونچائی سے گرنے والی پانی کی دھار کسی دوسری جگہ ٹکرائے بغیر سب سے نیچے آتی ہے۔ پانی کی یہ واحد جست 2648 فٹ اونچی ہے۔

مشرقی وینزویلا کے گھنے جنگل ''گران سبانا'' میں لاتعداد سطح مرتفع ہیں جن میں سے کئی تین کلومیٹر سے بھی زیادہ بلند ہیں۔ ان کی اوپر کی سطح ہموار ہے اور یہ نرالی اشکال کی ہیں۔ اینجل آبشار جنوب مشرقی وینزویلا کے گیانا سطح مرتفع کے علاقے میں چورون نامی دریا پر واقع ہے۔ عظیم الشان پہاڑی چوٹیوں کے اوپر بہنے والے دریا کے پانی کو نیچے گرنے میں 14 سیکنڈ کا وقت لگتا ہے۔

اپنی غیر معمولی بلندی کے علاوہ اینجل آبشار کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کا شمار قدرت کے ان عظیم مناظر میں ہوتا ہے جو حال ہی میں دریافت کیے گئے ہیں۔ اینجل آبشار کو 1935ء میں ایک امریکی ہوا باز اور سونے کی تلاش کرنے والے جیمز اینجل (James Angel) نے دریافت کیا۔ اس آبشار کے دریافت ہونے کی داستان بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اینجل

برسوں وسطی اور جنوبی امریکہ کے علاقے میں ایک ایسے دریا کی تلاش میں جہاز اڑاتا پھرا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس دریا کی تہہ میں کچے سونے کے ڈھیلے موجود ہیں۔ اس دریا کے متعلق جیمز اینجل کو ایک پرواز کے دوران سونے کے متلاشی ایک بوڑھے شخص نے بتایا تھا۔

ایک دن اینجل اپنا جہاز بلند سطح مرتفع ''ایلوان تیپو'' پر اڑا رہا تھا کہ اس کی نظر اس عظیم آبشار پر پڑی جس کو بعد میں اینجل کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اگرچہ اس حیران کن آبشار کے بارے میں بہت پہلے سے قصے کہانیاں مشہور تھیں لیکن پہلی بار 1910ء میں ارنسٹو سانچیز لاکروز نے اس کے بارے میں تحریر کیا تھا۔ 1937ء میں اینجل نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ سطح مرتفع کی چوٹی پر اپنے جہاز کو کریش لینڈنگ کروائی لیکن اس کے باوجود وہ اس آبشار تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ 1949ء تک اس آبشار تک پہنچنے کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ آخر کار امریکی مہم جوؤں کی ایک ٹیم آبشار کے دامن تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی اور اس علاقے کا سروے کیا اور اس بات کی تصدیق کی کہ یہ آبشار دنیا کا سب سے بڑا اور بلند ترین آبشار ہے۔

سطح مرتفع ایوان تیپو دیگر سطح مرتفع کی طرح دو ارب 50 کروڑ سال قبل وجود میں آئی۔ لاکھوں سال گزرنے اور پہاڑوں میں ٹوٹ پھوٹ ہونے کی وجہ سے اس سطح مرتفع پر جو مختلف کٹاؤ اور شگاف پیدا ہوئے۔ انہوں نے ایوان تیپو کی چوٹی کو ہموار کر دیا اور گران سبانا میں ہونے والی شدید بارشوں کا پانی اس سطح مرتفع پر رکنے لگا۔ اینجل آبشار کا پانی ایوان تیپو سے پھوٹ کر 197 فٹ بلند ہوتا ہے اور پھر پہاڑ کی اس چوٹی سے 295 فٹ نیچے جاتا ہے جو دریائے چورون کے اوپر ہے۔ پانی کا پہلا قطرہ جو بالکل سیدھا نیچے جاتا ہے وہ 2646 فٹ نیچے آتا ہے۔ یہ بلندی ایفل ٹاور سے دگنی ہے اور بقیہ آبشار 564 فٹ ہے اور یوں اس آبشار کی کل بلندی 3210 فٹ بنتی ہے۔

یہ آبشار اپنی ابتداء پر سے 500 فٹ چوڑا ہے اور اس کے اختتام پر ایک بہت بڑا تالاب بن جاتا ہے جو دریائے کارونی کے ایک معاون دریا چورون میں جا کر مل جاتا ہے۔ اس آبشار کے اردگرد دلکش اور خوبصورت قدرتی مناظر کی بھرمار ہے۔

❀ ❀ ❀

نیاگرا آبشار

(Niagra Falls)

دنیا کی سب سے خوبصورت اور شاندار آبشار

دنیا کی یہ سب سے خوبصورت، شاندار اور پرشور آبشار امریکہ میں واقع ہے۔ دریائے نیاگرا کے وسط میں جزیرہ گوٹ واقع ہے جس کی وجہ سے یہ آبشار دو حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ دریائے نیاگرا صرف 58 کلومیٹر (36 میل) لمبا ہے اور شمال کی طرف سے بہتا ہوا جھیل ایری کو جھیل اونٹیارو سے ملاتا ہے اور اس طرح کینیڈا اور امریکہ کے درمیان سرحد قائم کرتا ہے۔ یہ آبشار ان دونوں جھیلوں کے درمیانی راستہ سے شروع ہوتی ہے۔ دھند میں ڈوبا جزیرہ گوٹ ان جھیلوں کو دو آبشاروں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

ہارس شو آبشار اور کینیڈین آبشار۔ کینیڈین آبشار 48 میٹر (157 فٹ) بلند ہے اور اس کے پانی کی جھال 917 میٹر (3008 فٹ) چوڑی ہے۔ یہ جھال ایک آدھے دائرے کی شکل میں گرتی ہے۔ امریکن آبشار 51 میٹر (167 فٹ) بلند اور 323 میٹر (1060 فٹ) چوڑی ہے۔ دونوں ملکوں کی سرحد ہارس شو جزیرہ کے بالکل درمیان میں سے گزرتی ہے۔ جزیرہ گوٹ امریکہ کی ملکیت ہے۔ نیاگرا آبشار کا 6 فیصد پانی امریکن آبشار پر سے گزرتا ہے جبکہ 94 فیصد پانی ہارس شو آبشار پر سے گزرتا ہے۔ امریکن آبشار جس جگہ گرتی ہے وہاں ایک غار ہے جو ہواؤں کا غار کہلاتا ہے۔ یہ چٹانوں کا ایک 30 میٹر (98 فٹ) لمبا اور 23 میٹر (75 فٹ) چوڑا کمرہ ہے۔ یہ کمرہ پانی کے کٹاؤ نے پیدا کیا ہے۔ ان آبشاروں کے نیچے نیاگرا آبشار ڈھلوان

عمودی دیواروں میں سے تیزی سے گزرتی ہے اور ایک تالاب میں گرتی ہے۔

ایک منٹ کے مختصر سے وقفے میں ایک کروڑ 50 لاکھ کیوسک فٹ یعنی 4 لاکھ 67 ہزار ٹن سے زیادہ پانی اس آبشار کے دہانے سے طرح طرح کی ہولناک آوازیں پیدا کرتا ہوا گرتا ہے۔ سردیوں میں آبشار کے کچھ حصے جم جاتے ہیں اور دھوپ میں کسی عظیم الشان عمارت کے مرمریں ستون معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی عظمت، لمبائی اور چوڑائی کی بجائے ان خوشنما نظاروں کی بدولت ہے جو قدرت نے اسے بخش رکھے ہیں۔ آبشار نیاگرا سے تقریباً 40 لاکھ کلوواٹ بجلی بھی حاصل کی جاتی ہے۔ کینیڈا کے شہر نیاگرا میں ملکہ وکٹوریہ پارک ایسی جگہ ہے جہاں سے اس آبشار کا سب سے حسین منظر نظر آتا ہے۔ امریکہ کی طرف گوٹ جزیرے میں پروسپیکٹ پوائنٹ وہ جگہ ہے جہاں سے اس آبشار کا سب سے خوبصورت منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ نیویارک میں آبزرویشن ٹاور ایک ایسی جگہ ہے جو تقریباً 100 بلند ہے اور یہاں سے اس آبشار کے اردگرد کے مناظر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ کینیڈا کے وکٹوریہ پارک میں جھلملانے والی روشنیاں جب آبشار کے پانی پر پڑتی ہیں تو رات کو رنگ برنگی روشنیاں ہر سمت پھیل جاتی ہیں۔ 1829ء میں سام پیچ نام شخص نے اسے دوبار تیر کر عبور کیا۔ کئی لوگ نیاگرا آبشار پر مختلف کرتب دکھاتے ہیں۔ بلاڈن پہلا شخص تھا جس نے 60-1859ء میں اس آبشار کو ایک مضبوط رسے کے ذریعے دوبار عبور کیا۔ مرد اور عورتیں بڑے بڑے لکڑی کے ڈرموں اور موٹر گاڑیوں کے ٹائروں پر بیٹھ کر اس آبشار میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔ شمالی امریکہ کے ریڈانڈین قبائل بھی نیاگرا آبشار کے بارے میں علم رکھتے ہیں۔ فرانس کی ایک مہم جو ٹیم کے رکن رابرٹ ڈی لاسیلے نے پہلی بار اس آبشار کو دیکھا۔ اس ٹیم نے 1678ء میں نیاگرا آبشار دریافت کی۔ اس ٹیم میں فادر لوئس اینی پن بھی تھا جس نے دوسری بار علاقے کا دورہ کیا اور 1683ء میں اس آبشار کے متعلق لکھا۔ 18ویں صدی عیسوی میں نیاگرا آبشار کے اردگرد کے علاقے میں بے شمار تجارتی منڈیاں اور بہت سے فوجی قلعے تھے۔ 19ویں صدی عیسوی کے اوائل میں نیاگرا آبشار کے پانی سے بجلی پیدا کرنے کا کام لیا گیا اور یوں دنیا میں یہ پہلی آبشار تھی جو بجلی پیدا کرنے کا مرکز تھا۔

❀ ❀ ❀

اینگکر واٹ

(Angkor Wat)

ایک مندر ایک محل

جنوب مشرقی ایشیا کی تہذیب پر بھارتی ہندو تہذیب کا بہت گہرا اثر ہے۔ یہ اثر ہندومت اور بدھ مت کی شکل میں بہت نمایاں ہے۔ ان دو مذاہب کے اثر کی وجہ سے یہاں دو قسم کی مذہبی عمارتیں بنی ہیں۔ ہندو مقبرے جو اس انداز میں تعمیر کیے گیے ہیں کہ ان میں مختلف دیوتاؤں کے بت موجود ہیں یا پھر بدھ مت کی وہ عمارتیں جو ''اسٹوپا'' کہلاتی ہیں۔

اینگکر تہذیب 8ویں سے 14ویں صدی عیسوی کے دوران شمال مغربی کمبوڈیا میں پھلی پھولی۔ اس تہذیب کا دارلحکومت مشہور زمانہ اینگکر تھام (Angkor Thom) تھا۔ اب اس کے مندر کی باقیات کمبوڈیا کے موجودہ شہر سیم ریپ (Siem Reap) میں موجود ہیں۔ 820ء اور 1100ء کے دوران کمبوڈین شہنشاہوں نے سیم ریپ میں کئی شہر اور مندر تعمیر کرائے تھے۔ ان میں اینگکر تھام شہر سب سے عجیب و غریب تھا۔ یہ تقریباً 10 مربع کلومیٹر (4 مربع میل) رقبے پر پھیلا تھا اور لاکھوں لوگوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ یہ اس وقت کے کسی بھی یورپی شہر سے زیادہ عجیب و غریب تھا۔ اس شہر کے گرد ایک دیوار بھی تعمیر ہوئی جس کے پانچ دروازے تھے اور اس دیوار کے اندر کئی مندر (Temples) بھی بنائے گئے۔ ان مندروں میں اپنی تعمیر و ہیئت کے لحاظ سے اینگکر واٹ سب سے نمایاں تھا اور دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا

تھا۔

جنوب مشرقی ایشیا میں خاص طور پر ہندو مندر کائنات کے خلاصہ کے طور پر بنائے گئے۔ آہستہ آہستہ یہاں یہ روایت قائم ہوگئی کہ مندر کی عمارت پانچ میناروں پر مشتمل ہوتی۔ ایک پلیٹ فارم پر درمیان میں درگاہ کی عمارت بنائی جاتی اور چاروں کونوں پر چار مینار ہوتے۔ یہ طرز تعمیر اینگکر واٹ مندر میں بہت نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ مندر غالباً دنیا کی سب سے بڑی مذہبی عمارت ہے۔

اینگکر واٹ کمپلیکس کے اردگرد جو دیوار ہے اس کے چاروں طرف 1905 میٹر (625فٹ) چوڑی خندقیں کھدی ہوئی ہیں جو ہندو دیو مالائی تصور گہرے سمندر کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کی دیواریں جو 4275فٹ چوڑی اور 4905فٹ لمبی ایک مستطیل بناتی ہیں دنیا کے محیط میں واقع پہاڑوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ مغربی جانب سے جنگلے دار ایک سنگ بست راستہ خندق کو عبور کرتا ہوا مندر کے پہلے ایسے اندرونی احاطہ میں داخل ہوتا ہے جس کے تین طرف اندر جانے کا راستہ ہے۔ اندر جانے کا مرکزی راستہ رسومات کے انعقاد کا دروازہ یا ''گپورا'' ہے۔ اس میں تین پویلین ہیں جن پر مینار بنے ہوئے ہیں۔ اس راستے سے رسومات ادا کرنے والے لوگ دوسرے اندرونی احاطہ میں داخل ہوتے ہیں۔

تیسرے احاطہ میں ایک گیلری بھی ہے۔ یہ گیلری دو چبوتروں پر بنائی گئی ہے جن کے درمیان سرو کی شکل کا مرکزی مینار ہے اور یہی اینگکر واٹ کی سب سے اندرونی خانقاہ ہے۔ اس مینار میں ایک دیوتا کا بت تھا جو اب غائب ہو چکا ہے۔ روایت ہے کہ وہ سریاورمن دیوتا کا بت تھا جس کی پوجا دیوتا وشنو سمجھ کر کی جاتی تھی۔

اپنے منفرد اور متاثر کن طرز تعمیر ڈیزائن کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اپنی بے مثال سنگ تراشی اور اس میں جڑے قیمتی پتھروں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ یہ دلکش نقش و نگار کا کام اس انداز میں کیا گیا ہے کہ تمام ستونوں پر اور گیلریوں میں ہندو دیو مالائی تصور کو کہانیوں کی شکل میں ابھارا گیا ہے۔ جواہرات کو اس قدر مہارت اور کاریگری سے عمارت میں جڑا گیا ہے کہ مجسموں کی پاکیزگی اردگرد کے ماحول پر اثر انداز ہوئے بغیر قائم ہے۔

11ویں صدی کے دوران اینگکر تہذیب عروج پر تھی۔ اس کے بعد یہ زوال پذیر

ہونا شروع ہوئی جب ہمسایہ تھائی لینڈ کے حملے اور شاہی خاندان کے جھگڑے عروج پر پہنچ گئے۔ تھائی فوجوں نے 1431ء میں اینگکر تھام پر قبضہ کر لیا لیکن جلد ہی وہ حملہ آور یہاں سے چلے گئے اور یہ جگہ ویران ہو گئی۔ کافی عرصہ تک یہاں کوئی نہ آیا اور شہر کے اردگرد ایک گھنا جنگل اگ آیا۔ 1860ء میں ایک فرانسیسی جغرافیہ دان ہنری موہٹ (Henri Mouhot) نے اینگکر تھام کے کھنڈرات دریافت کیے۔

1860ء اور 1900ء کے دوران فرانسیسی اور کمبوڈین ماہرین آثار قدیمہ نے کئی مندروں کی مرمت کی۔ اینگکر واٹ کا مندر جو کہ اینگکر تھام کے اندر تھا۔ ایک مربع میل کے رقبے پر بنا ان سب میں نمایاں تھا اور اہرام کی طرز پر تھا۔ یہ مندر 11ویں صدی عیسوی میں ہندو خدا وشنو (Vishnu) کے اعزاز میں تعمیر کیا گیا۔ اینگکر واٹ کو بعدازاں کمبوڈیا کے اس بادشاہ سریاورمن کا مقبرہ بنا دیا گیا جس نے اس کی تعمیر کا حکم دیا تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اینگکر واٹ صرف ایک مندر ہی نہیں بلکہ بادشاہ کی رہائش گاہ اور مقبرہ بھی تھا۔ یہ مندر اور محل بیک وقت دو مقاصد پورے کرتا تھا۔

کانگریس لائبریری

(Congress Library)

دنیا کی سب سے بڑی لائبریری

لائبریری آف کانگریس امریکہ کے صدر مقام واشنگٹن میں واقع ہے۔کئی بلاکوں پر مشتمل یہ کرہ ارض کی سب سے بڑی اور عظیم الشان لائبریری ہے۔ جو بلاشبہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ،صدیوں کی سوچ،علم، تجربہ، مشاہدات اور تجسس کا نچوڑ اور گنجینہ ہے۔

قدیم یورپی ملکوں کے مقابلے میں امریکہ ایک نیا ملک ہے۔اسے یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں سے آنے والے تارکین وطن نے آباد کیا ہے۔ان میں بہت سے اپنی خوشی سے آئے تو بہت سے زبردستی غلام بنا کر لائے گئے۔اس ملک کی وسعت اور وسائل کی کثرت، زرعی و معدنی دولت یورپ کے تمام ملکوں سے زیادہ تھی۔اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے شروع میں ان لوگوں نے بڑی سخت محنت کی اور بڑی تکلیفیں اٹھائیں لیکن اس کے ساتھ علم کے فروغ کا کام بھی جاری رکھا کتابیں اس زمانے میں کم ہوتی تھیں۔لوگوں کے مطالعے کے ذوق کی تسکین کے لیے گشتی کتب خانے ہوتے تھے جو گھوم پھر کر لوگوں کے مطالعے کا ذوق پورا کرتے تھے۔

مشہور امریکی صدر ابراہام لنکن (دور صدارت 1861-1865ء) ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا جس جھونپڑے میں اس کا خاندان رہتا تھا اس کی چھت اتنی شکستہ تھی کہ جھونپڑے

کے اندر لیٹ کر آسمان کے تارے گنے جا سکتے تھے۔ ابراہام کو بھی کھیتوں میں کام پر لگا دیا گیا۔ اس نے ایک کسان کے پاس ایک کتاب دیکھی تو وہ اسے پڑھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ آخر اس نے کسان سے پڑھنے کے لیے وہ کتاب مانگ لی۔ کسان نے اسے وہ کتاب اس شرط پر دی کہ وہ اسے ایک رات میں ختم کر لے اور اس کے بدلے میں ایک دکان اس کے کھیت پر بلا معاوضہ کام کرے۔ ابراہام لنکن نے کتاب کے لیے یہ شرط پوری کر دی۔

اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آگے بڑھنے کے جذبے سے سرشار ایک نئی قوم کے اس بیٹے کو مطالعے کا کس قدر شوق تھا۔ اسی مطالعے اور سخت محنت نے اسے ایک دن امریکہ کا صدر بنا دیا۔ آج بھی اس کی تقریر پڑھ کر لوگ جھوم اٹھتے ہیں۔ اسی عظیم صدر کے ملک کا یہ عظیم ترین کتب خانہ لائبریری آف کانگرس کہلاتا ہے۔ امریکہ کی پارلیمنٹ ''کانگریس'' کہلاتی ہے۔ یہ لائبریری اراکین کانگریس کے لیے قائم ہوئی تھی۔ آج یہ کتابوں کے عظیم ذخیرے کے علاوہ امریکہ کی اپنی تاریخی یادداشتوں اور تحریری یادگاروں کا مرکز سمجھی جاتی ہے۔

آٹھ کروڑ 50 لاکھ کتب پر مشتمل اس لائبریری کے 23 کمروں کی الماریوں میں جس کے تختوں کی لمبائی 530 میل ہے۔ دنیا کی سب سے چھوٹی کتاب کے علاوہ دو کروڑ کتابیں، بے شمار نقشے، گلوبز، نیوز ریل، میوزک شفٹ، حکومت دستاویزات، اہم شخصیات کی تحریریں، قدیم زمانے کی متحرک فلمیں (موشن پکچرز) اور طباعت کے اولین نمونے رکھے ہوئے ہیں۔ اس لائبریری میں جتنی کتابیں، اشیا، دستاویزات جمع ہیں دنیا بھر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس میں اگر دنیا کی سب سے پرانی موشن پکچر موجود ہے تو دستاویزی فلمیں، ریکارڈز، موسیقی کی شیٹیں، چھپائی کے اولین نمونے، دنیا کے سب سے پہلے کاغذ کے ٹکڑے اور سب سے چھوٹی کتاب بھی موجود ہے۔

اس لائبریری میں روزانہ 31 ہزار سے زائد نئی کتابیں اور رسائل وغیرہ آتے ہیں۔ لائبریری کو دنیا بھر کے مصنفین اور علمی شخصیات اور ادارے بھی اپنی قلمی کاوشیں اور کتابیں وغیرہ بھیجتے رہتے ہیں۔ اس طرح بعض اوقات بڑا اہم تحریری مواد اور کاغذات یکایک لائبریری میں پہنچ جاتے ہیں۔ جیسا کہ لوگ جانتے ہیں کہ ابراہام لنکن کو دارلحکومت کے فورڈ تھیٹر

میں ایک ڈرامہ دیکھنے کے دوران قتل کیا گیا تھا۔ اس لائبریری میں لنکن کی اہم یادگار اشیا مثلاً اس کی سنہرے فریم والی عینک، گلاسوں کی دو جوڑیاں، ایک جیبی چاقو، ایک بٹوہ اور اس کے کوٹ کی جیب سے ملنے والا پانچ ڈالر کا ایک نوٹ اور چند خطوط بھی یہاں محفوظ ہیں۔

کانگرس لائبریری جو پورے کرہ ارض کا احاطہ کیے ہوئے ہے میں کتابوں کی تین چوتھائی تعداد 470 مختلف زبانوں پر مشتمل ہے جس میں عربی کی کتابوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہاں تبتی زبان میں جتنی کتابیں موجود ہیں اتنی خود تبت میں بھی موجود نہیں ہیں۔ یہاں پر روس کے زار شاہی دور کی جتنی تصاویر موجود ہیں اتنی خود روس میں بھی نہیں ہیں۔

لائبریری میں مطالعہ کے لیے 23 کشادہ کمرے ہیں جن میں ہر شخص پورے سکون کے ساتھ مطالعہ اور تحقیق کر سکتا ہے۔ اس لائبریری سے استفادہ کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ اس میں کتابوں وغیرہ کے علاوہ پرانے ماہر موسیقاروں کی بنائی ہوئی دھنوں کے نقشے، پرانی فلمیں اور ان میں استعمال ہونے والے لباس کے ڈیزائن وغیرہ بھی محفوظ ہیں۔ موسیقی کے شوقین لوگوں اور فلمیں بنانے والوں کے لیے یہ ایک بڑے اہم خزانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ 1987ء میں اداکار واٹراسٹون امریکی ڈرامہ سیریل کے لیے ابراہام لنکن پر ڈرامہ بنانے کی تیاری میں تھا۔ اسے لنکن کی بات چیت کے صحیح تلفظ کی ضرورت تھی۔ اس کا یہ مسئلہ لائبریری کی انتظامیہ نے حل کیا۔ انتظامیہ نے اسے اپنے محافظ خانے سے لنکن کی آواز میں اس کے بچپن کی بات چیت کا ریکارڈ سنایا جس سے اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔

1800ء میں جب امریکی کانگریس فلاڈلفیا سے واشنگٹن ڈی سی منتقل ہوئی تو اسے دستور سازی کے لیے کتابوں کی ضرورت پیش آئی تو لائبریری نے 5 ہزار ڈالر کی کتابیں خرید کر دیں تاکہ امریکی کانگریس کے اراکین ان کا مطالعہ کر سکیں۔ لیکن 1814ء میں برطانوی فوجوں نے اس کی سب سے بڑی عمارت کو آگ لگا دی جس سے اس کی تمام کتابیں جل گئیں۔ لائبریری کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے سابق امریکی صدر تھامس جیفرسن (عہد صدارت 1801ء-1809ء) نے اپنی 6387 ذاتی کتابیں اسے فروخت کیں۔ یہ بڑی قیمتی کتابیں تھیں جس کے باعث لائبریری کے نقصان کی تھوڑی بہت تلافی ہوئی۔

1851ء میں یہاں پھر آگ لگی اور کوئی دو تہائی کتابیں جل گئیں جن میں جیفرسن کی

بھی بہت سی کتابیں شامل تھیں۔ 1870ء میں کانگریس نے ایک قانون بنایا جس کے مطابق کتابیں، نقشے، تصاویر، اخبار، نقش و نگار اور موسیقی وغیرہ کے کاپی رائٹ (حق نقل) حاصل کرنے والوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ ان چیزوں کی دو دو کاپیاں لائبریری کو ارسال کریں۔ اس طرح اس میں اضافے کی رفتار تیز ہوگئی۔ بڑھتی ہوئی لائبریری کے لیے نئی عمارت تعمیر کرنے کا فیصلہ بھی ہوا جو 1897ء میں مکمل ہوئی۔ یہ عمارت فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

1930ء میں یہ عمارت بھی عطیات اور کتابوں سے بھر گئی چنانچہ 1935ء میں ایک اور وسیع عمارت تعمیر کی گئی۔ 1965ء میں یہ عمارت بھی اپنی تنگی کی شکایت کرنے لگی۔ چنانچہ نئی کتابوں کو عارضی طور پر واشنگٹن ڈی سی کے باہر کرایہ کے گوداموں میں رکھا گیا اور جیمز میڈیسن میموریل میں ایک بہت بڑی عمارت کی تعمیر شروع کی گئی جو 1980ء میں مکمل ہوئی۔ یہ عمارت حجم اور گنجائش میں پہلے کی دو عمارتوں سے بھی بڑی ہے اور تمام کتابیں وغیرہ اب اس میں جمع ہیں۔ اس لائبریری کی عمارت کو دنیا کی سب سے بڑی لائبریری عمارت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

لائبریری آف کانگریس میں 5ہزار افراد کام کرتے ہیں جن میں سے صرف 900 کانگریس کے ارکان اور حکام کے لیے تحقیق میں لگے رہتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا تحقیقی عملہ ہے۔ یہ عملہ ہر سال کانگریس کے ارکان کے چار لاکھ سے زائد سوالات وغیرہ کے جوابات مرتب کرتا ہے۔ اس کے دوسرے ملازمین جسمانی طور پر معذور 70لاکھ افراد میں یادداشتیں، ٹیپ اور مختلف قسم کا لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔ یہ افراد معذور اور نابینا افراد کے لیے علمی مواد، بریل کی کتابیں، ریکارڈ اور ٹیپ وغیرہ تیار کرتے ہیں۔ لائبریری میں جمع کتابوں، نقشوں اور دیگر اشیا مثلاً فلموں، تصاویر اور اخبارات وغیرہ کے تحفظ کے لیے بھی سینکڑوں افراد کام میں لگے رہتے ہیں۔ آگ سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک بڑی حفاظتی تدبیر یہ کی گئی ہے کہ تمام کتابوں وغیرہ کی مائیکروفلمیں بنا کر سرد خانوں میں محفوظ کی گئیں ہیں۔

لائبریری کی نایاب کتابوں میں جوہان گوٹن برگ کی 1400ء کی انجیل، حرکت پذیری (موونگ ٹائپ)، پہلی کتاب، 17ویں صدی کی ہومر کی ایلیڈ وغیرہ اور 17ویں صدی

سے لے کر موجودہ دور تک کے ایک ہزار 500 قلمی نسخے جن کی لمبائی چار انچ سے بھی کم ہے موجود ہیں۔ اسکاٹ لینڈ کے اولڈ کنگ کول کی کتاب جو چیونٹی کی جسامت سے بھی چھوٹی ہے اور جسے طاقتور خوردبین اور عدسے سے پڑھا جاتا ہے موجود ہے۔

امریکہ کی تاریخ سازی میں جن حضرات نے حصہ لیا ان کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی 11 ہزار تحریریں بھی موجود ہیں۔ ان تحریروں میں صدر جیفرسن کے ہاتھ کا امریکہ کی آزادی کے اعلان کا پہلا مسودہ بھی موجود ہے۔ نیز رائٹ برادران کی کیٹی ہاک شمالی کیرولینا کی پروازوں کی کئی تصاویر بھی موجود ہیں۔ لائبریری کی الماریوں میں چار ملین نقشے رکھے ہوئے ہیں۔ جن میں چاند کے نقشے، سمندر کی تہہ کے نقشے، زمین کی آخری سرحدوں کے نقشے، نیز وہ نقشے بھی یہاں موجود ہیں جو 1320ء سے 1350ء کے دوران ملاحوں اور جہاز رانوں نے کھالوں پر بنائے تھے۔

ریکارڈنگ کے شعبے میں اداکارہ سارہ بیرل ہارڈٹ کے نغموں کی ریکارڈنگ، 1904ء کی قیصر جرمنی ولہلم دوم کی آواز کی ریکارڈنگ، دوسری جنگ عظیم میں بحرالکاہل میں متعین امریکی جنرلوں کے کئی ہزار ٹیپ شدہ انٹرویوز اور سیاسی تقریروں کی ریکارڈنگ موجود ہے۔

برموڈا ٹرائینگل

(Bermuda Triangle)

پراسرار سمندری علاقہ جہاں 100 سے زائد بحری، فضائی جہاز غرق ہو چکے ہیں

برموڈا تکون (Bermuda Triangle) جسے شیطانی یا آسیبی تکون (Devil`s Triangle) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے ایک ایسا پراسرار سمندری علاقہ ہے جہاں اب تک 100 سے زائد بحری جہاز اور ہوائی جہاز غرق یا لاپتہ ہو چکے ہیں۔ اس جگہ فزکس کا کوئی قانون کام نہیں کرتا۔ برموڈا ٹرائینگل کے بارے میں لکھنے سے پہلے برموڈا جزائر کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔

برموڈا جزائر شمالی بحراوقیانوس میں شمالی کرولینا کے جنوب مشرق میں 650 میل کے فاصلے پر 300 جزیروں کا مجموعہ ہے۔ ان میں صرف 20 جزیرے آباد ہیں جن میں صرف چھ اہم ہیں۔ بڑا جزیرہ گریٹ برموڈا 23 کلومیٹر (14 میل) لمبا ہے۔ جبکہ دیگر جزائر میں سومرسٹ (Somerset)، آئرلینڈ، سینٹ جارج، سینٹ ڈیوڈ اور بوآز (Boaz) اہم جزیرے ہیں۔ تمام جزیرے مونگے اور مرجان سے بنے ہیں۔

برموڈا کا کل رقبہ 53 مربع کلومیٹر (20 مربع میل)۔ آبادی 63 ہزار نفوس اور دارلحکومت ہملٹن (Hamilton) ہے۔ برموڈا کو دریافت کرنے کا سہرا ہسپانوی جہاز راں جوآن ڈی برموڈیز کے سر ہے جو 1503ء میں یہاں آیا۔ اسی کے نام پر یہ برموڈا کہلایا۔ اس کے بعد

یہاں کوئی آبادی قائم نہ ہوئی۔ 1609ء میں سر جارج سومرز کی قیادت میں انگریز آباد کاروں کی ایک ٹیم یہاں وارد ہوئی۔ جلد ہی یہ برطانیہ کی کراؤن کالونی بن گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہاں امریکہ اور برطانیہ کے اہم بحری اڈے قائم تھے۔

برموڈا ٹرائینگل یا مثلث فلوریڈا کے جنوب مشرقی ساحل کے پاس ایک ایسا سمندری علاقہ ہے جہاں اب تک کئی بحری جہاز اور ہوائی جہاز گم ہو چکے ہیں اور جہاں دنیا کے حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اس مثلث نے 11 لاکھ 40 ہزار مربع کلومیٹر (4 لاکھ 40 ہزار مربع میل) کا علاقہ گھیر رکھا ہے۔ یہ سہ تکونی علاقہ مشہور ہے۔ اس کے ایک طرف برموڈا جزیرہ ہے۔ دوسری طرف۔ امریکہ کا شہر میامی اور تیسری طرف پورٹو ریکو واقع ہے۔ دراصل برموڈا مثلث کا نام کوئی نیا نہیں۔ اس پر برس ہا برس سے بحث ہو رہی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ 2006ء میں بھی سائنسدان یہاں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں کوئی ٹھوس شہادت فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

عام خیال یہ ہے کہ فزکس کا کوئی قانون یہاں کام نہیں کرتا اور یہاں ہر طرف عجیب وغریب روشنیوں کا ہجوم رہتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں کوئی چیز بچ کر نہیں نکل سکتی۔ ہوا میں پرواز کرنے والے طیارے اور بحری جہاز ایسے غائب ہوتے ہیں کہ ان کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں شیطانی قوتوں کی حکومت ہے۔ ان افواہوں اور واقعات پر کئی فلمیں بن چکی ہیں اور ناول بھی لکھے جا چکے ہیں۔ مثلاً ہیری پوٹر کی بعض مہمات بھی اس خطے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ''لارڈ آف دی رنگز'' نامی فلم کا مرکزی خیال بھی اس سے تعلق رکھتا ہے۔

یہاں ایک معنی خیز اور چونکا دینے والا مفروضہ مشہور ہے کہ برموڈا مثلث امام غائب حضرت مہدیؑ کی اقامت گاہ ہے اور یہاں موجود جزیرہ دراصل جزیرہ حضراء ہے جہاں حضرت ولی عصر اپنے ظہور تک پوشیدہ رہیں گے۔ اس عقیدے کے محرک شیخ زین الدین علی ابن فاصل نامی ایک بزرگ ہیں جو نجف (عراق) میں رہتے تھے انہوں نے غیبی احکامات کے بعد 690 ہجری میں جزیرہ اوقیانوس اطلس کا سفر کیا جو مراکش سے جزیرہ برموڈا تک تھا۔ شیخ زین الدین نے 40 روز تک جزیرے پر قیام کیا جہاں کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔

شیخ کے مطابق یہ وہ مسلمان تھے جو بنوامیہ کے مظالم سے تنگ آ کر اس جزیرے پر آ بسے تھے۔ 40 دن کے بعد سات کشتیاں غذائی سامان سے لدی پھندی جزیرہ خضراء سے جزیرہ برموڈا آئیں تو کشتی کے ناخدا نے شیخ زین الدین کا نام مع ولدین پکارا اور کہا کہ مجھے تمہارے بارے میں ہدایت کی گئی ہے کہ میں تمہیں لے کر جزیرہ خضرا پہنچوں۔ چنانچہ کشتی والے انہیں لے کر 16 دن کے سفر کے بعد جب سفید پانی پر پہنچے تو ناخدا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''اس سفید پانی نے جزیرے کا اس طرح احاطہ کر رکھا ہے کہ دشمنوں کی کوئی کشتی اس پانی پر نہیں گزر سکتی۔ اگر کوشش کریں گے تو وہ حضرت ولی عصر کی برکت سے یہیں غرق ہو جائے گی۔''

برموڈا مثلث میں اب تک جتنے بھی جہاز غائب ہوئے ان کا آخری پیغام بھی یہی موصول ہوا کہ ''اب ہم سفید پانی پر آ گئے ہیں۔'' اور اس کے بعد ایک ابدی خاموشی چھا گئی۔ اس مثلث کے بارے میں دانشوروں اور سائنسدانوں کی سرگردانی صرف بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں کے غائب ہو جانے سے متعلق ہی نہیں ہے بلکہ اب تک ہزاروں پائلٹوں، ملاحوں اور دوسرے بحری و ہوائی سفر کرنے والے مسافروں نے اس منطقے کو عبور کرنے کے موقع پر بہت سی حیرت انگیز اور مافوق الفطرت باتوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان پراسرار واقعات میں بھی یہ بات مشترکہ ہے کہ مسافر جب بھی اس ٹرائینگل کے قریب پہنچے ان کی گھڑیوں میں تعطل پیدا ہو گیا اور مشینوں نے اپنی حرکت بند کر دی جبکہ مشینری اور اس کا کنٹرول پائلٹوں اور ملاحوں کے اختیار میں نہیں رہا۔

موجودہ ریکارڈ کے مطابق پہلا بحری جہاز مارچ 1918ء میں لاپتہ ہوا۔ یہ ''Us Cyclops'' نامی امریکی بحری جہاز تھا۔ بعض کے نزدیک پہلا بحری جہاز 1952ء میں غرق ہوا۔ اس خطے کو برموڈا ٹرائینگل کا نام 1964ء میں دیا گیا جو اب تک چلا آ رہا ہے۔ لیکن عام لوگوں کو اصل دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب چارلس برلفیئر نے ''برموڈا ٹرائینگل'' نامی کتاب لکھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مشہور سیاح کرسٹوفر کولمبس نے جب 1492ء میں اس علاقے کا سفر کیا تو لکھا کہ اس سمندری خطے میں ایسی پراسرار قوت موجود ہے جو کہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

اب تک اس علاقے سے 200 سے زائد ایسے مافوق الفطرت واقعات وابستہ ہو

چکے ہیں۔ تاہم سب سے نمایاں واقعہ 5 دسمبر 1945ء کو ہوا جس میں امریکی بحریہ کے پانچ تارپیڈو بمبار طیارے یہاں پہنچ کر غائب ہو گئے۔ اُس واقعہ میں 14 افراد ہلاک ہو گئے۔ جہاز جب روانہ ہوئے تو موسم بہت سازگار تھا لیکن پھر اچانک خطرناک ہو گیا اور ہوابازوں کے لیے سمت تلاش کرنا مشکل ہو گیا۔ امریکی ماہرین نے ان جہازوں کو بہت تلاش کیا لیکن بے سود۔

ماہرین نے اس خطے میں عجیب وغریب اور پراسرار واقعات کی جو تاریخ مرتب کی ہے اس کا آغاز 1872ء سے ہوتا ہے۔ 1997ء تک 16 ایسے بڑے پراسرار واقعات ہو چکے تھے جن کی توجیہہ آج تک پیش نہیں کی جا سکی۔ مجموعی طور پر اب تک سو کے قریب بحری جہاز اور طیارے برموڈا ٹرائینگل کی نذر ہو چکے ہیں جس میں ایک ہزار جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ سائنسدانوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس علاقے میں پراسرار قسم کی شعاعیں پائی جاتی ہیں جو لمحوں میں بڑے بڑے بحری جہازوں کو غرق کر سکتی ہیں۔ خلائی سیاروں سے معلوم ہوا کہ یہاں بڑے بڑے سمندری طوفان آناً فاناً جنم لیتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جاتے ہیں۔

اس علاقے میں زلزلوں کی شرح بھی بہت زیادہ ہے۔ ایک تھیوری یہ بھی ہے کہ یہاں ہائیڈریٹس گیس غیر معمولی مقدار میں پائی جاتی ہے جو پانی کی کیت کو تبدیل کر دیتی ہے۔ ان سے جہاز چند ہی لمحوں میں اپنا نشان چھوڑے بغیر غرقاب ہو جاتے ہیں۔ امریکی جیولوجیکل سروے کی ٹیموں نے یہاں میتھین گیسوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ علاقہ 80 ڈگری پر واقع ہے جہاں قطب نما صحیح طور پر کام نہیں کرتا۔ قطب نما کو پڑھنے میں کم از کم 20 ڈگری کا فرق پیدا ہو جاتا ہے جس سے بحری اور فضائی جہازوں کے کپتان بھٹک جاتے ہیں۔ یہاں الیکٹرومیگنیٹک لہروں کی مقدار بھی زیادہ ہے جس سے بحری اور فضائی جہازوں کا مواصلاتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

برموڈا ٹرائینگل کے حوادث ممکن ہے ہزاروں لاکھوں سال سے جاری ہوں تاہم آخری 150 سال کے گزرے ہوئے واقعات بہت پیچیدہ اور اہم ہیں۔ یہ واقعات چند ایک نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ہیں۔ ان میں ایک اہم واقعہ یہ ہے۔ دسمبر 1872ء میں ''ماری سیلسٹ'' نامی بحری جہاز جو عرصہ دراز قبل اس مثلث سے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ بغیر کسی فنی

نقصان کے بالکل صحیح وسالم شکل میں اوقیانوس اطلس کے مقام پر نمودار ہوگیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس جہاز میں ہر چیز اپنی جگہ قرینے سے تھی۔ اس کا انجن بھی ٹھیک حالت میں تھا۔ پٹرول کافی مقدار میں موجود تھا۔ نلکے، تار، رسیاں سب درست حالت میں تھے۔ پانی کا ٹینک جوں کا توں بھرا ہوا تھا جو مسافروں کے لیے 6 ماہ کے لیے کافی تھا۔ جہاز پر کسی قسم کے حملے کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے طویل مدت تک یرغمال رکھنے کے بعد اس جہاز کو اب چھوڑ دیا گیا ہو۔ یہ سب کچھ تھا لیکن جہاز کے سینکڑوں مسافر غائب تھے۔ جہاز کے کپتان کا کیبن کھلا ہوا تھا۔ اس میں اطلاعات کا رجسٹر بھی موجود تھا۔ جس میں اس وقت تک کی تمام معلومات درج تھیں جب جہاز برموڈا ٹرائینگل کے پاس پہنچا تھا۔

کپتان کے کمرے میں کرنسی نوٹ، سکے، قیمتی جواہرات اور اہم کاغذات سب موجود تھے اور انہیں چھوا بھی نہیں گیا تھا۔ ایک بچے کا جہاز پر سلا ہوا ادھورا لباس بھی موجود تھا۔ مسافروں کے لیے میز پر کھانا بھی چنا ہوا تھا۔ گلاسوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ غذا کے سب برتن مختلف اشیاء سے بھرے ہوئے تھے۔ سٹور میں غذائی ذخیرہ موجود تھا جو 6 ماہ کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ غرض یہ کہ ہر چیز اپنی جگہ قرینے سے موجود تھی تاہم مسافروں کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اس جہاز کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی تحقیقات کے لیے برطانوی پولیس نے بڑے جتن کیے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغرساں برسوں اس کھوج میں مصروف رہے۔ جبکہ دیگر تحقیقاتی مراکز بھی بھرپور طور پر اسکاٹ لینڈ یارڈ کو مدد اور معاونت فراہم کرتے رہے لیکن کوئی سراغ نہ پا سکے۔

بہرحال...... افواہیں، کہانیاں، حقیقت اور اندازے جتنے بھی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کی 21 ویں صدی کی حیرت انگیز سائنسی ترقی کے باوجود برموڈا ٹرائینگل سائنسدانوں کے لیے ایک چیلنج ہے۔

پیٹروناس ٹاورز

(Petronas Towers)

2003ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت

ملائیشیا کی صنعتی ترقی کی علامت پیٹروناس ٹاورز کو 1996ء میں دنیا کی بلند ترین عمارت کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس سے قبل یہ اعزاز امریکہ کے پاس تھا۔ گزشتہ 100 سالوں میں پہلی بار یہ اعزاز امریکہ کے علاوہ کسی اور ملک کو حاصل ہوا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ملک ملائیشیا کی 1483 فٹ بلند یہ عمارت شکاگو کے سیئرز ٹاور سے بھی 33 فٹ بلند ہے۔

ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور کے قلب میں ایک سابق ریس ٹریک پر ملائیشیا کی قومی پڑولیم کارپوریشن کے تعمیر کردہ پیٹروناس ٹاورز اسلامی طرز تعمیر اوراس کی اقتصادی خوشحالی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ آٹھ ملین مربع فٹ زمین پر قائم ان ٹاورز میں دفاتر، شاپنگ سنٹرز اور تفریح کی جدید سہولیات فراہم کی گئی ہیں۔ یہاں کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں 4500 گاڑیاں کھڑی کرنے کی گنجائش ہے۔ ایک پٹرولیم میوزیم، ایک سمفنی ہال، ایک مسجد اور ایک ملٹی میڈیا کانفرنس سنٹر بھی اس عمارت کا حصہ ہیں۔

پیٹروناس ٹاورز ایک آٹھ کونوں والے ستارے کی شکل میں تیار بنیاد کے اوپر ستارے کی شکل میں ہی بلند ہوتے ہیں۔ اصل ابتدائی ڈیزائن میں ایک بارہ کونوں والے ستارے سے مشابہ شکل بنائی گئی تھی۔ ملائیشیا کے سابق وزیراعظم ڈاکٹر داتو سری مہاتیر محمد

جنہوں نے ان ٹاورز کی تعمیر اور ڈیزائن میں ذاتی دلچسپی لی ان کی تجویز پر اسے آٹھ کونوں والے ستارے میں تبدیل کر دیا گیا کیونکہ یہ ایک اسلامی علامت تھی اور ڈاکٹر مہاتیر محمد اس عمارت میں ملائیشیا کی خصوصی ثقافت کی جھلک دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

88 منزلہ دونوں ٹاورز کو 42ویں منزل پر ایک لچکدار سکائی برج کے ذریعے آپس میں ملایا گیا ہے۔ اس سکائی برج کے ذریعے ایک سے دوسرے ٹاور میں بآسانی پہنچا جا سکتا ہے۔ ان دونوں ٹاورز کو ''کائناتی ستون'' کا نام بھی دیا جاتا ہے جو نیچے سے دیکھیں تو آسمان کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ ٹاورز اسلامی فن تعمیر سے مخصوص جیومیٹری کے اصولوں کو استعمال کرتے ہوئے قوت اور وقار کی علامت کے طور پر ڈیزائن کیے گئے جن میں شیشے اور سٹیل کا کثرت سے استعمال کیا گیا۔ ان ٹاورز کے معمار اعلیٰ سیزر پیلی کے مطابق یہ ٹاورز محض ایک یادگار نہیں ہیں بلکہ زندہ عمارات ہیں جو ایک علامتی کردار ادا کرتی ہیں۔ ہم نے انہیں زندہ بنانے میں سخت محنت کی ہے۔

ان ٹاورز کی تکمیل 1996ء میں ہوئی اور 15 اپریل 1996ء کو یہ دنیا کی بلند ترین عمارت قرار پائے۔ 1997ء میں یہاں باقاعدہ کام اور کاروبار کا آغاز ہوا۔ پہلے ٹاور میں ملائیشیا کی مشہور پیٹرولیم کمپنی پیٹروناس کے دفاتر ہیں اور دوسرے ٹاور میں پیٹروناس کی ایسوسی ایٹ کمپنیوں کے دفاتر ہیں جبکہ باقی جگہ دیگر ملٹی نیشنل کمپنیوں کو لیز پر دی گئی ہے۔

اپریل 1996ء میں اس عمارت کا افتتاح ایک رنگارنگ قومی تقریب میں نہایت دھوم دھام سے کیا گیا۔ جس میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ افتتاح کے بعد وزیراعظم مہاتیر محمد نے خطاب کیا جنہوں نے ملائیشیا کو ایشیا کا ٹائیگر بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے خطاب کے بعد اس موقع کے لیے خاص طور پر لکھی گئی ملائشین شاعر صمد سعید کی نظم پڑھی گئی۔ جس کے کچھ مصرعوں کا مفہوم اس طرح ہے کہ جہاں ہزاروں گھوڑے دوڑتے تھے اور جنگل کی ہوائیں سیٹیاں بجاتی تھیں۔ وہاں اس قوم کے اتحاد اور محنت کی علامت دونوں خوبصورت جڑواں مینار کھڑے ہیں جو آسمان کا جوبن ہیں۔

پیٹروناس ٹاورز کو 15 اپریل 1996ء سے 17 اکتوبر 2003ء تک دنیا کی بلند ترین عمارت کا اعزاز حاصل رہا۔ لیکن پھر تائیوان میں 1676 فٹ بلند ''تائی پیہ 101'' (فنانشل

سنٹر) بلند ترین عمارت بن گیا۔ پیٹرو ناس ٹاورز کے بارے میں چند دلچسپ حقائق بھی ہیں۔
ہالی وڈ کی ایک مقبول فلم (Entrapment) میں ان ٹاورز کی عکس بندی سے انہیں مزید عالمی شہرت ملی۔

ان جڑواں ٹاورز میں 36.910 ٹن سٹیل استعمال کیا گیا جن کا مجموعی وزن تین ہزار ہاتھیوں کے وزن سے زیادہ ہے۔ دونوں ٹاورز میں 32 ہزار کھڑکیاں ہیں۔ جنہیں صرف ایک دفعہ صاف کرنے میں پورا ایک مہینہ لگ جاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

شاہ فیصل مسجد

(King Faisal Mosque)

دنیا کی عظیم ترین مساجد میں سے ایک

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں مارگلہ کی خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں واقع شاہ فیصل مسجد جو ایک صحرائی خیمے کی طرز پر تعمیر کی گئی ہے برصغیر کی سب سے بڑی اور دنیا کی چند عظیم ترین مساجد میں سے ایک ہے۔ فیصل مسجد اپنے وسیع سائز اور منفرد طرز تعمیر کی بدولت پوری اسلامی دنیا میں مشہور ہے۔

مسجد کا نام سعودی عرب اور دنیائے اسلام کے عظیم فرمانروا شاہ فیصل بن عبدالعزیز شہیدؒ کی یاد میں رکھا گیا۔ جنہوں نے 130 ملین سعودی ریال کی رقم فراہم کی اور اسے سعودی عرب کی طرف سے پاکستانی عوام کے لیے ایک تحفہ قرار دیا۔ مسجد کا سنگ بنیاد 12 اکتوبر 1976ء کو سعودی فرمانروا شاہ خالد بن عبدالعزیز مرحوم نے رکھا۔ یاد رہے کہ مسجد کا منصوبہ شاہ فیصل شہید کا تھا جنہیں 25 مارچ 1975ء کو ان کے بھتیجے نے ریاض میں گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔

1976ء میں اس کی تعمیر کا آغاز ہوا اور 10 سال بعد 1986ء میں مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ مسجد کے لیے مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں 20 لاکھ مربع فٹ کا رقبہ مخصوص کیا گیا۔ صحن اور برآمدے کو ملا کر لگ بھگ 7 لاکھ نمازیوں کی گنجائش موجود ہے۔ اس مسجد کا ڈیزائن بنانے کے لیے 5 رکنی بورڈ تشکیل دیا گیا تھا۔ ایک بین الاقوامی مقابلے کے ذریعے ترکی کے

ماہر تعمیرات ''وحدات دلوکے'' کا بنایا ہوا ڈیزائن منتخب کیا گیا۔ وحدات کا ڈیزائن نہ صرف جدت اور انفرادیت کا حامل تھا بلکہ اس میں اسلامی تاریخ اور مسلم طرز تعمیر کی جھلک بھی پوری طرح موجود ہے۔

اس منصوبے کی تعمیر کے دوران وحدات دلوکے نے ایک بار یہاں کا دورہ کرنے والے طلباء کے سامنے اپنے ڈیزائن کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں نے کعبہ کی سپرٹ، تناسب اور جیومیٹری کو ایک بالکل تجریدی انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ مسجد کے چار پرشکوہ بلند و بالا مینار چہار اطراف سے دور ہی سے نظر آتے ہیں۔ ان چاروں میناروں کے انتہائی سروں کو تصوراتی لکیروں کے ذریعے آپس میں ملایا جائے تو یہ کعبہ کے چار بلند ترین کونوں کی مناسبت سے کعبہ سے مشابہت اختیار کر لیتی ہے۔''

مساجد کے روایتی انداز تعمیر کے برعکس فیصل مسجد میں کوئی گنبد نہیں ہے بلکہ اس کا مرکزی ہال ایک ہشت پہلو کنکریٹ کے شیل کی طرح ہے جو ایک صحرائی خیمہ سے مشابہت رکھتا ہے۔ درمیان سے اس مرکزی ہال کی اونچائی 131 فٹ (40 میٹر) ہے جسے کنکریٹ کے چار عظیم الجثہ ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے۔ اس کی اوپری سطح پر سفید ماربل لگایا گیا ہے اور داخلی ڈیزائن موزیک سے مزین ہے۔ درمیان میں ترک انداز کا حامل ایک بہت بڑا اور نہایت شاندار سنہرا فانوس لگایا گیا ہے جس کا وزن تقریباً ساڑھے سات ٹن ہے اور اس میں ایک ہزار بلب روشن ہوتے ہیں جبکہ اس ہال کی چھت پر باہر کی طرف ایک عظیم سنہری چاند نصب ہے۔

مرکزی عبادت گاہ کے اوپر ایک 150 فٹ قطر کا عالیشان گنبد ہے اور چوکور ہال 214x140 فٹ کے رقبے پر محیط ہے۔ مرکزی ہال میں 20 ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔ 4 میناروں میں سے ہر مینار کی بلندی 300 فٹ (90 میٹر) ہے جو چار کونوں والے تارے کی طرح بلند ہوتے ہیں اور چاروں طرف سے دیکھنے والوں کو خیمے کی طرح کی ایک تکون بنتی نظر آتی ہے جو پوری مسجد کے ڈیزائن کا مرکزی خیال ہے۔ مسجد کا داخلی دروازہ مشرقی سمت میں ہے جس کے آگے صحن اور اس کے بعد وسیع برآمدہ ہے۔

مسجد میں خواتین کے لیے علیحدہ گیلری ہے۔ مسجد کے احاطے میں ایک آڈیٹوریم،

مرکزی صحن کے نیچے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، سیڑھیوں کے پاس بڑا کتب خانہ اور عجائب خانہ بھی ہے۔ یہ مسجد صرف اپنے بیرونی ڈھانچے اور وسعت کی وجہ سے ہی متاثر کن نہیں بلکہ اس کی داخلی تزئین و آرائش بھی قابل داد ہے۔ مسجد میں آویزاں خطاطی کے خوبصورت نمونے اور دیواروں پر رنگدار ٹائلوں سے بنائے گئے قرآنی نقوش جمالیاتی ذوق کے ساتھ ساتھ روحانی سکون کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

اکاشی کیکیو برِج

(Akashi-Kaikyo Bridge)

دنیا کا طویل ترین پل

جاپان میں اکاشی کیکیو برج اس وقت دنیا کا طویل ترین سپنشن پل ہے جو کوبے (Kobe) شہر کو ''اواجی شیما'' (Awaji) جزیرے سے ملاتا ہے۔ 1998ء میں جاپانی انجینئروں نے یہ پل تعمیر کر کے برج انجینئرنگ میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔ اس پل کی تعمیر مکمل ہونے سے قبل سب سے طویل سپنشن برج کا اعزاز ڈنمارک کے گریٹ بیلٹ ایسٹ برج کو حاصل تھا جس سے یہ پل 366 میٹر لمبا ہے۔ جبکہ دنیا کے دوسرے طویل ترین پل ہمبر برج (انگلینڈ) سے اس کی لمبائی 580 میٹر زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ یہ پل امریکہ کے گولڈن گیٹ برج سے بھی 710 میٹر زیادہ ہے۔ اس پل کی لمبائی 3991 میٹرز ہے۔

اکاشی کیکیو پل صرف طویل ہی نہیں بلکہ سب سے اونچا پل بھی ہے۔ اس کی دو ٹاوروں کی اونچائی 928 فٹ ہے۔ ان کی اونچائی ایفل ٹاور کے برابر ہے۔ اکاشی اسٹریٹ جاپان میں ایک مصروف بندرگاہ ہے چنانچہ جاپانی انجینئروں کے لیے ضروری تھا کہ وہ اس پل کو اس طرح ڈیزائن کریں جس سے یہاں جہازوں کی آمدورفت متاثر نہ ہو۔ انہیں موسم کی شدت کا بھی احساس تھا۔ یاد رہے کہ جاپان کا موسم زمین پر سخت ترین موسموں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں کی آبی گزرگاہ پر نہایت تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ یہاں سالانہ 57 انچ بارش پڑتی

ہے۔ تقریباً ہر سال یہاں سمندری اور زمینی طوفان اور زلزلے آتے رہتے ہیں۔

جاپانی انجینئروں نے اس پل کو ایک خاص تکنیک کے ذریعے مضبوط بنایا جسے ٹرس (Truss) کہتے ہیں۔ اس تکنیک کے مطابق پل میں مختلف آہنی تکونوں کا ایک نیٹ ورک بنایا گیا ہے جس سے اگرچہ پل کی لچک کم ہونے سے یہ ٹھوس اور سخت ہو جاتا ہے لیکن تکونوں کے اس نیٹ ورک سے ہوا آر پار گزر سکتی ہے۔ اس سے ہوا کے دباؤ کا بخوبی مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماہرین نے ہر ٹاور میں 20 ٹیونڈ ماس ڈیمپرز (TMD) لگائے ہیں جو ہوا کو جذب کر کے اس کی شدت کو کم کر دیتے ہیں۔ یہ TMD مخالف سمت میں جھولنے لگتے ہیں۔ اس ڈیزائن کی وجہ سے یہ پل 180 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ہواؤں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

اس پل کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بڑے سے بڑے زلزلے کو برداشت کر سکتا ہے۔ پل سے 150 کلومیٹر دور اگر ریکٹر سکیل پر 8.5 درجے کا زلزلہ آ جائے تو اسے بھی یہ پل برداشت کر سکتا ہے۔ پل کی اس صلاحیت کا مظاہرہ 17 جنوری 1995ء کو اس وقت ہوا جب اس علاقے میں ایک شدید ترین زلزلہ آیا تھا۔ اس وقت یہ پل ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ اس زلزلے سے پل کے کچھ حصے متاثر ہوئے تاہم اس کا بنیادی ڈھانچہ، اینکر، ستون اور ٹاور وغیرہ بالکل محفوظ رہے۔

اس زلزلے کے باعث پل کی تعمیر ایک ماہ کے لیے روک دی گئی۔ اس ایک مہینے کے نقصان کو اگلے تین سالوں میں زیادہ محنت کر کے پورا کر لیا گیا اور اس طرح پروگرام کے مطابق پل کا افتتاح کر دیا گیا۔ زلزلے سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس کی لمبائی میں تقریباً تین فٹ کا اضافہ ہو گیا۔ پل کی تعمیر دس سال تک جاری رہی۔ تعمیر کے دوران اگرچہ ایک دو حادثات پیش آئے جن میں چھ افراد زخمی ہوئے لیکن سیفٹی کے اعلیٰ معیار کے باعث کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔

5 اپریل 1998ء کو جاپان کے ولی عہد اور شہزادی سیاکو نے سرکاری طور پر ایک تقریب میں اس پل کا افتتاح کیا اور اس موقع پر 1500 مہمانوں نے اس پل کے اوپر چل کر اس پر سفر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس پل کے بارے میں چند دلچسپ حقائق بھی ہیں۔ مثلاً اس

میں 3 لاکھ لمبی کیبل استعمال کی گئی ہے جسے اس دنیا کے گرد سات دفعہ لپیٹا جا سکتا ہے۔

اس پل کے ڈیزائن میں اس کی لمبائی 12825 فٹ رکھی گئی تھی لیکن 17 جنوری 1995ء کو آنے والے زلزلے کے باعث اس کی لمبائی میں تین فٹ کا اضافہ ہو گیا۔ اس پل کے تین عالمی ریکارڈ ہیں۔ یعنی سب سے لمبا پل، سب سے اونچا پل اور سب سے مہنگا پل۔ اس کی تعمیر پر 4.3 بلین ڈالر کی لاگت آئی جو اب تک دنیا میں کسی بھی پل کی سب سے بڑی لاگت ہے۔ اپریل 2006ء میں اس طویل ترین سپنشن برج کو دنیا کے سات نئے عجائبات میں شامل کر لیا گیا۔

❁ ❁ ❁

پتھر کے زمانے کا گاؤں

(Stone Age Village)

دوبئی کے نزدیک تعمیر کیا گیا حیرت انگیز گاؤں

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب نئی نئی ایجادات دیکھ کر انسان دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ جاتا ہے ایسے میں ایک پتھر کے زمانے کا گاؤں بسانا بھی ایک دلچسپ اور حیرت انگیز بات ہے۔ دوبئی کے ایک شخص علی السعید ابراہیم نے گزرے ہوئے وقت کو نئے انداز میں ڈھالنے کی کوشش کی اور ''ہتا'' کے مقام پر ایک ایسا چھوٹا سا گاؤں تعمیر کیا جس میں پتھر اور لکڑی کے علاوہ کوئی دوسرا میٹریل استعمال نہیں کیا گیا۔

علی ابراہیم جو کہ دوبئی سول ڈیفنس کے سابقہ ڈائریکٹر تھے۔ انہیں دوبئی کے سابق حکمران شیخ راشد بن سعید المکتوم نے شہر سے باہر پتھریلے علاقے میں ایک وسیع اراضی دی تھی۔ پہاڑیوں میں گھری یہ جگہ بہت منفرد تھی۔ علی ابراہیم کا ارادہ تھا کہ یہاں شجر کاری اور کھیتی باڑی کی جائے۔ انہیں یہ زمین 1980ء میں حاکم دوبئی نے دی تھی۔ ایک روز وہ گاڑی میں بیٹھے اپنی اراضی کی جانب رواں دواں تھے کہ اچانک گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ انہوں نے گاڑی سے اتر کر دیکھا تو یہ سب ایک پتھر کی وجہ سے ہوا تھا۔ انہوں نے وہ پتھر پھینکنے کے لیے اٹھایا تو ہاتھ میں لیتے ہی انہیں اس کی خوبصورتی نے اس قدر متاثر کیا کہ ان کے ذہن میں ایک عجیب نقشہ گھوم گیا۔

پتھر کا گاؤں یا فارم ہاؤس بنانے کے پیچھے یہی خیال کارفرما تھا۔ انہی دنوں انہیں پتہ چلا کہ اس زمین پر کسی قسم کی پیداوار ممکن نہیں کیونکہ زیرزمین پانی کی سطح پر پہنچنے کے لیے 800 فٹ کھدائی کرنا پڑتی۔ زمین بالکل زرخیز نہیں تھی۔ چنانچہ اس جگہ پر پتھر کا گاؤں بسانے کا ارادہ مزید پختہ ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے اس قدیم زمانے کے گاؤں کے لیے ''ارم'' نام تجویز کیا اور پھر اس پر عمل کرنے کے لیے کوششوں کا آغاز کر دیا۔ پہلے پہل سول انجینئروں نے پتھر کو نامناسب میٹریل قرار دیا۔ لیکن علی ابراہیم کے ایک ایرانی دوست نے مشورہ دیا کہ ایرانی طرزِ تعمیر میں پتھر استعمال ہوتے ہیں۔ پھر ایک رات تقریباً گیارہ بجے تجرباتی طور پر پتھروں سے دیوار کی تعمیر کا آغاز ہوا اور اس کے بعد ایک گھر کا نقشہ تیار کیا گیا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔

اب اس پتھر کے گاؤں میں اس قدر خوبصورت اشیاء تعمیر کی جا چکی ہیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ مختلف مجسمے، زندگی کی عکاسی کرتے مناظر وغیرہ کو پتھروں کے ذریعے زمین پر بنایا گیا ہے۔ اسی طرح پتھروں کی راہداریاں اور فرش تعمیر کیے گئے ہیں۔ اس تعمیری نمونے کی خاصیت یہ بھی ہے کہ کسی بھی جگہ لوہا یا سٹیل استعمال نہیں کیا گیا۔ ماضی کی بہترین عکاسی کے لیے صرف پتھر اور لکڑی استعمال کی گئی ہے۔

علی سعید ابراہیم نے اس گاؤں کی تعمیر کا آغاز 1990ء کے شروع میں کیا اور اب تک اس پر 10 ملین درہم خرچ ہو چکے ہیں اور اس تعمیری کام میں 300 ٹن مختلف انواع کے پتھر استعمال کیے جا چکے ہیں۔ اکثر پتھر ہتا اور اس کے گردونواح کے علاقوں سے حاصل کیے گئے لیکن انفرادیت پیدا کرنے کے لیے دنیا کے بہت سے علاقوں سے خاص پتھر لائے گئے۔ ان میں نیاگرا فالز، دریائے رائن، یورپ اور افریقہ کے پتھر شامل ہیں لیکن انہیں اس انداز میں نصب کیا گیا ہے کہ ساری دنیا ایک سی نظر آئے۔

پتھروں سے ایک دنیا بسانا اپنے انداز میں خاصا مختلف ہے۔ جو لوگ اس جگہ کو پہلی مرتبہ دیکھتے ہیں وہ حیرانی و پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہاں جگہ جگہ چوپالیں بنائی گئی ہیں جہاں بیٹھ کر لوگ ستاتے ہیں اور پرانے زمانے کے قصے کہانیاں سنا کر عہد رفتہ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

وینس ۔ دی گرینڈ کینال

(Venus-The Grand Canal)

نپولین نے اسے یورپ کا ڈرائنگ روم قرار دیا

اٹلی کا شہر وینس قدیم و جدید طرز معاشرت کے حسین امتزاج کا حامل ایک ایسا مقام ہے جو بحری تجارت کی وجہ سے پورے یورپ میں ہمیشہ نہایت اہم رہا ہے۔ اٹلی کے شمال مشرقی علاقے میں زمین سے دو میل کے فاصلے پر ایڈریاٹک کی ایک جھیل میں شہر وینس سمندر سے ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مغرب کا کوئی اور شہر اتنا منفرد نہیں ہے اس لیے کہ یہاں آرٹ اور فن تعمیر کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں کہ اسے فنون کا ایک نادر خزینہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

جب وینس کا ذکر ہو تو دی گرینڈ کینال کا نقشہ سامنے آتا ہے جہاں 13 ویں سے 18 ویں صدی عیسوی کی سنگ مرمر اور ماربل سے مزین جاذب نظر عمارتوں کے درمیان بہتا نیلگوں پانی اس حسین مقام کی رومانویت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ تاریخ کے مطابق جب نپولین بونا پارٹ یہاں آیا تو اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اسے یورپ کا ڈرائنگ روم قرار دیا۔ موسم سیاحوں کے جنون پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ چاہے گرمی ہو یا سردی بارشیں ہوں یا سخت کہر یورپ سمیت پوری دنیا کے سیاح جن میں اکثریت رومانوی جوڑوں پر مشتمل ہوتی ہے اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

وینس کی تاریخ 5ویں اور چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوئی جب اطالوی باشندوں نے غیر ملکی حملہ آوروں سے بچنے کے لیے یہاں سے بھاگ کر جھیل کے ہموار جزیروں پر آباد ہونا شروع کیا۔ انہوں نے پانی کے اوپر لکڑی کے گھر بنا کر رہائش اختیار کی۔ ابتداء میں وینس قدیم رومی سلطنت کے مشرقی حصے کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن بحیرہ روم کے ممالک سے تجارت کی وجہ سے وینس نے دولت اور شہرت حاصل کر لی اور انہوں نے اپنی ایک الگ ریاست قائم کر لی جس کی اپنی ایک منتخب حکومت تھی۔

وینس میں ملاح صدیوں پرانے روایتی لباس زیب تن کیے اپنی کشتیوں میں سوار لوگوں کو اطراف میں ایستادہ دلکش عمارتوں کا نظارہ کراتے ہیں۔ یہ کشتیاں آٹھ مختلف اقسام کی لچکدار لکڑیوں سے بنائی جاتی ہیں جن میں کھڑے ہو کر نظارہ کرنے کے خصوصی انتظامات کیے جاتے ہیں۔ جب 18ویں صدی میں یہاں فیری (Ferry) چلائی گئیں تو ان کشتیوں کی تعداد 14ہزار تھی جو اب کم ہو کر صرف 500رہ گئی ہیں۔ کشتی رانوں کی صدیوں پرانی رسم (Sponzalizo De Mar) بہت مشہور ہے جس میں ملاح سونے کا سکہ جھیل میں ڈال کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

وینس کا مرکزی مقام شہر کا بڑا چوک ''پائزا سان فارکو'' ہے۔ اس کے مشرق میں 11ویں صدی میں قائم ہونے والا سینٹ مارک کا گرجا اور سکوائر ہے جس کی تمام منزلوں کو جدید ماربل سے یوں آراستہ کیا ہے کہ نظر نہیں ٹھہرتی۔ یہ عمارت عنبر کی طرح شفاف اور ہاتھی دانت کی طرح نفیس ہے۔

سینٹ مارک کی عمارت زمانہ قدیم کے آزاد دولت مند اور پرشکوہ وینس کی ایک علامت ہے۔ 9ویں صدی عیسوی میں اہل وینس یونانی سینٹ تھیوڈور سے نجات حاصل کر کے سینٹ مارک کی تعلیمات کو اپنانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ سینٹ مارک کے تبرکات کو اسکندریہ سے چوری کر کے وینس لے آئے اور یہاں اُن کے لیے ایک گرجا تعمیر کیا۔ یہ گرجا ایک دفعہ آگ لگنے سے خاکستر ہو گیا اور سینٹ مارک کی موجودہ عمارت یونانی طرز کے مطابق 1063ء سے لے کر 1094ء کے دوران بنائی گئی۔ سینٹ مارک کو الہ دین کے غار سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ سینٹ مارک کا مینار گرجے سے ہٹ کر کھڑا ہے۔ اس مینار کی چوٹی سے ہی دوربین

کے موجد گلیلیو نے وینس کے تاجروں کو اپنی دوربین کا کمال دکھایا تھا۔

سینٹ مارک کے عقب میں 15ویں صدی میں نصب کیا جانے والا قدآور گھڑیال ہے جس میں لگی ہوئی کانسی کی دو سوئیاں ان نظاروں کے سحر میں کھو جانے والوں کو ہر ایک گھنٹے بعد اپنی مخصوص آواز سے وقت کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ سینٹ کے برابر میں ڈاگ پیلس ہے جو سب سے پہلے 814ء میں تعمیر ہوا لیکن جب سینٹ مارک کو آگ لگی تو یہ عمارت بھی نذرِ آتش ہو گئی تھی۔ 14ویں صدی عیسوی میں اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

16ویں صدی میں تعمیر ہونے والی ''Cadoro'' ایک مصروف ترین جگہ ہے جہاں ایک آرٹ گیلری قائم ہے یہاں آویزاں تصاویر میں اس علاقے کی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک میوزیم مختلف ادوار کے بادشاہوں کے نوادرات پر مشتمل ہے۔ اس کے سامنے Plazzo,Dario کی عمارت ہے جو پوری کی پوری مختلف رنگوں کے ماربل سے بنائی گئی ہے۔

موجودہ دور میں وینس کا شمار اُن تاریخی شہروں میں ہوتا ہے جو بہت کم تباہی سے دوچار ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہاں گاڑیوں اور کاروں کا شور اور دھواں نہیں ہے۔ لوگ پیدل سفر کرتے ہیں یا کشتی اور موٹر بوٹ استعمال کرتے ہیں لیکن سمندر جو اب تک اس شہر کی حفاظت کرتا آیا ہے۔ اب اس کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ وینس آہستہ آہستہ ڈوب رہا ہے۔ یہ شہر ہر 10 سال کے بعد دو انچ نیچے چلا جاتا ہے۔ وینس کو بچانے کے لیے اقوامِ متحدہ نے ایک بین الاقوامی مہم شروع کی ہے۔

دمشق

(Damascus)

دنیا کا سب سے قدیم ترین شہر

مشرق وسطیٰ کے اہم ملک شام کا دارالحکومت دمشق دنیا کا سب سے پرانا مستقل طور پر آباد شہر کہلاتا ہے۔ سطح سمندر سے 2260 فٹ کی بلندی پر واقع اس شہر کے چاروں طرف باغات اور مرغزار ہیں جن کے گرد پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ باہر سے آنے والے سیاحوں کو پہاڑیوں کے دامن میں سبزہ پوش شہر کا نظارہ بڑا دلکش اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔

دمشق اس قدر قدیم ہے کہ جس کا ذکر انجیل مقدس میں بھی آیا ہے۔ مورخین کے مطابق دمشق کا قیام معلوم تاریخ سے بھی پہلے عمل میں آیا تھا۔ قدیم تاریخ دان اسے ''مدینۃ القدس'' (پاک بابرکت و پاکیزگی کا شہر) بھی کہتے تھے۔ یہاں حضورؐ کی عظیم نواسی حضرت زینبؓ کا مزار، پہلے اموی خلیفہ امیر معاویہ کا مزار، عظیم فاتح سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، مشہور صوفی بزرگ محی الدین بن عربی وغیرہ کی قبریں ہیں۔

دمشق کو 732ق م میں آشوریوں نے تباہ کیا۔ 323ق م میں یہ سکندر اعظم کے ایک جرنیل کے قبضہ میں چلا گیا۔ 64ق م میں اسے سلطنت روما کا حصہ بنا لیا گیا۔ اس شہر پر بازنطینی بھی قابض رہے۔ 635ء میں خلافت فاروقیؓ میں مسلمانوں نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ایک دفعہ یہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن پھر اسے تسخیر کرلیا گیا۔ 661ء سے 750ء تک دمشق

اموی خلفاء کا صدر مقام رہا۔ سب سے پہلے امیر معاویہ نے اسے اسلامی سلطنت کا دارالخلافہ بنایا۔ امویوں کے بعد جب عباسی برسراقتدار آئے تو انہوں نے دمشق کی بجائے بغداد کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ یہاں صلیبی جنگیں بھی لڑی گئیں۔

1260ء میں اس پر ہلاکو خان نے قبضہ کیا۔ ایک سو سال بعد اسے تیمور لنگ نے فتح کیا۔ 1516ء میں عثمانی ترک اس پر قابض ہوئے تو انہوں نے اسے اپنے صوبے شام کا دارالخلافہ بنایا۔ 1918ء میں انگریز جنرل ایلن بائی نے اسے ترکوں سے چھینا۔ 1927ء میں فرانسیسی فوجیں اس میں داخل ہو گئیں جس کے بعد دروزوں نے بغاوت کر دی۔ یہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران اتحادیوں کا ہیڈ کوارٹر رہا۔ جون 1941ء میں برطانوی اور فرانسیسی فوجیں اس میں داخل ہو گئیں۔

دمشق میں بہت سے قابل دید اور یادگار مقامات ہیں۔ اعظم محل امیر السعد پاشا الاعظم کی رہائش تھا۔ اس کی تعمیر 1749ء اور 1761ء کے دوران ہوئی۔ 1925ء میں جزوی طور پر یہ محل تباہ ہو گیا لیکن 1934ء میں اس کی سابقہ شان وشوکت کو بحال کر دیا گیا۔ یہ محل ساسانی فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ آج کل یہ محل شامی لوک کہانیوں کی عکاسی کرتا ہے۔

بیت سینٹ انانیہ (Saint Annania House) قدیم روایات کے مطابق وہ گھر ہے جہاں معجزانہ طور پر حضرت عیسیٰؑ کے حواری سینٹ پال کی بینائی بحال ہو گئی تھی۔ شہر کے اس پہلے زیر زمین گرجے کو فرانسیسی راہب نے تعمیر کرایا۔

اس کی دیواروں پر انجیل کی آیات کندہ ہیں۔ دمشق کی اموی مسجد بھی اہم مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ مسجد اس مقام پر تعمیر کی گئی جہاں آج سے چار ہزار سال قبل عظیم آرامی دیوتا کا مندر ہوا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مندر جیوپیٹر کے رومی مندر میں تبدیل ہو گیا۔ 8ویں صدی عیسوی میں اسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ مسجد عمدہ پچی کاری اور صناعی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس مسجد کی تصویر اتارنا منع ہے۔

مسجد سلیمانیہ جو کہ ایک شاندار اور تاریخ مسجد ہے 1554ء میں قدیم اسود اور ابیض محل کی بنیادوں پر تعمیر کی گئی۔ اس کے دو مینار اور بڑا گنبد عثمانی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ دمشق کے ملی عجائب گھر کی عمارت بھی بڑی قدیم ہے۔

اسے 244ء میں تعمیر کیا گیا۔ بارہ سال کے بعد اسے اہل فارس نے تباہ کر دیا۔ امریکی ماہر آثار قدیمہ نے اس کے ریت میں دبے ہوئے آثار کو دریافت کیا۔ اس عجائب گھر کی سب سے اہم چیز یہودیوں کا مشہور آتش کدہ ہے۔

ریوڈی جنیرو

(Rio De Janeiro)

خوبصورت ساحلوں اور حسین شاموں کا شہر

برازیل کے وسیع و عریض جنگلوں کے شمال میں کوہ شوگر لوف سے بحراوقیانوس کے چمکتے دمکتے تفریحی ساحلوں تک پھیلے ''سیرا ڈومار'' کے نیم پہاڑی سلسلے پر آباد ریوڈی جنیرو دنیا کے انتہائی دلکش مقامات میں سے ایک ہے۔ یہاں ہر سال کارنیوال نامی تہوار منایا جاتا ہے۔ اسے مقامی لوگ غموں کا بوجھ ہلکا کرنے کا تہوار کہتے ہیں۔ اس میں لوگ ضرورت سے زیادہ اچھلتے، کودتے اور ڈانس کرتے ہیں۔

ریوڈی جنیرو کو پرتگالی جہاز رانوں نے جنوری 1560ء میں دریا کے دہانے پر آباد کیا اور اسے ''ریوڈو زنیرو'' (Rio Duh Zhaneeroh) کا نام دیا جس کا مطلب ''جنوری کا دریا'' ہے۔ پرتگیزی جہاز رانوں نے ایک خلیج کو دریا کا دہانہ سمجھ کر بستی آباد کی جو بعد میں آہستہ آہستہ ایک بہت بڑے شہر کی صورت اختیار کر گئی۔ 1822ء سے 1960ء تک برازیل اور پھر ریوڈی جنیرو ریاست کا دارالحکومت بننے والے اس شہر نے اپنی جغرافیائی حیثیت کی بدولت بہت جلد بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور اس کی یہ وجہ شہرت اب بھی برقرار ہے۔ شہر کا رقبہ 675 مربع کلومیٹر (452 مربع میل) ہے۔

1960ء میں جنگلوں کو صاف کر کے برازیلیا کا شہر آباد کیا گیا۔ چنانچہ دارالحکومت برازیلیا منتقلی کے باوجود اس کی شان و شوکت کسی طرح بھی کم نہیں ہوئی۔ اس کی ساحلی تفریح

گاہیں دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے زبردست کشش رکھتی ہیں جہاں کے خوبصورت دن اور رنگین شامیں بہت مشہور ہیں۔ 1763ء میں یہ وائسرائے کی نشست گاہ (Seat) بنا۔ اس کی بندرگاہ کو 1807ء میں وسعت دی گئی۔ 7 ستمبر 1822ء کو یہ اس وقت برازیل کا دارالحکومت قرار دیا گیا جب برازیل کو آزادی نصیب ہوئی۔

اس شہر کی بین الاقوامی شہرت کی ایک وجہ یہاں منعقد ہونے والا سالانہ تہوار کارنیوال (Carñewal) ہے جو بین الاقوامی رنگین مزاجوں کو ہر سال کھینچ لاتا ہے۔ عیش و عشرت، رنگ رلیوں اور موج مستی کا یہ سب سے بڑا میلہ ہوتا ہے۔ اس میں 20 لاکھ کے قریب افراد شرکت کرتے ہیں جن میں تقریباً 8 لاکھ سیاح ہوتے ہیں۔ میلے کے دوران 16 میل تک سڑکوں پر سر ہی سر نظر آتے ہیں۔

ریو ڈی جنیرو کی اقتصادی خوشحالی چینی، ہیرے اور سونے کی تجارت میں فروغ کے بعد شروع ہوئی۔ اس شہر کے خوبصورت راستوں کے اردگرد گنے کی فصل کو عمدگی سے کاٹا گیا ہے۔ یہاں کی زندگی بہت مصروف ہے۔ ہوٹلنگ اور سیاحت لوگوں کے اہم پیشے ہیں۔ اس کے علاوہ انٹرنیشنل کمپنیوں کے دفاتر بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد علمی، ادبی اور ثقافتی ادارے ہیں۔

ریو ڈی جنیرو محض اپنے خوبصورت ساحلوں کی وجہ سے ہی معروف نہیں بلکہ اپنے شاہ خرچ اور تقریبات کے شوقین باشندوں کی وجہ سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ یہ شہر کسی زمانے میں دو حصوں میں منقسم تھا۔ اس کا جنوبی حصہ ایک فاصلے پر تھا جس کے درمیان پہاڑی ٹیلوں کا ایک چھوٹا سلسلہ تھا، جسے بعد میں تین سرنگوں کے ذریعے ملا دیا گیا، جبکہ جنوبی حصے کے حوالے سے یہ بھی مشہور ہے کہ یہاں کے رہنے والے سورج کو پوجتے تھے۔

جب نپولین نے پرنس ریجنٹ ڈوم جواؤ اور شاہی دربار سے منسلک ایک ہزار افراد کو برازیل میں دھکیل دیا تو ریو ڈی جنیرو پوری پرتگالی سلطنت کا حقیقی پایہ تخت بن گیا۔ 1560ء میں جب پرتگالی یہاں آئے تو انہوں نے فرانسیسیوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔ انہوں نے کافی، کپاس اور ربر کی تجارت کو وسعت دی اور شہر تیزی سے پھیل گیا۔

❀ ❀ ❀

ماؤنٹ کلمنجارو

(Mount Kilamanjaro)

براعظم افریقہ کا سب سے بلند پہاڑ

ماؤنٹ کلمنجارو شمالی ٹانگا نیکا (تنزانیہ) میں شیرا سطح مرتفع کے کنارے ایک آتش فشاں کون (Conc) کی شکل میں اٹھا ہوا ہے۔ اس کی سرحد کینفیا سے بھی ملتی ہے۔ اسے سب سے پہلے 1848ء میں ایک جرمن عیسائی مبلغ جانسن رب مین نے دریافت کیا۔ اس نے جب اپنی رپورٹ میں یہ انکشاف کیا کہ اس نے خط استواء کے نزدیک برف سے ڈھکا ہوا ایک پہاڑ دریافت کیا ہے تو یورپ کے قدامت پسند لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور کہا کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔

ماؤنٹ کلمنجارو کی بلندی 19340 فٹ (5895 میٹر) ہے۔ اس کی چوٹی یورپ کی چوٹی کوہ ایلپس اور امریکہ کی چوٹی روکنیز سے بھی بلند ہے۔ کلمنجارو مشرق سے مغرب تک 80 کلومیٹر (50 میل) کے فاصلے میں پھیلا ہوا اونچے پہاڑوں کا ایک کٹا ہوا سلسلہ ہے۔ اس کے تین مرکزی آتش فشانی دہانے ہیں لیکن یہ دہانے درحقیقت ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔ سب سے نیا اور لمبا آتش فشانی دہانہ ''کیبو'' 7 میل تک پھیل کر موانزنی (بلندی 5350 میٹر) سے جا ملتا ہے۔ پہاڑ کا بقیہ حصہ کلمنجارو کی چوٹی ہے۔ تیسرا آتش فشانی دہانہ ''شیرا'' (بلندی 12387 فٹ) ایک قدیم آتش فشاں پہاڑ کا ایک بچا کھچا حصہ ہے۔

''کیبو'' بہت ہموار، برف سے ڈھکا ہوا ایک گول گنبد نظر آتا ہے لیکن اس کے دامن میں بے پناہ لاوا چھپا ہوا ہے۔ یہ لاوا اس کی جنوبی سمت میں ایک میل کے فاصلے میں موجود ہے اور 300 میٹر (984 فٹ) گہرا ہے۔ اس آتش فشاں کے کنارے پر افریقہ کی چوٹی یورو پوائنٹ ہے۔ اس آتش فشاں کے جنوب میں ایک چھوٹی مخروطی وادی ہے جو راکھ سے بھری ہوئی ہے۔ آتش فشانی دہانہ سے باہر کیبو کے جنوب مغربی ڈھلوانوں پر 4260 میٹر (14000 فٹ) میں گلیشیئر پھیلے ہوئے ہیں۔

کلمنجارو کی جنوبی ڈھلوانیں جو قدرتی پانی کی فراہمی کی وجہ سے بہت زرخیز ہیں تنزانیہ کے مشہور قبائل ''چھاگا'' کا وطن ہے۔ یہ لوگ مویشی پالتے ہیں اور کافی وکیلوں کی کاشت کرتے ہیں۔ اگرچہ اس علاقے میں کافی بارش ہوتی ہے۔ اس کے باوجود چھاگا قبائل نے خشک موسم میں اپنی فصلوں کو سیراب کرنے کے لیے بند بنا رکھے ہیں اور ان کے ذریعہ آبپاشی کا ایک دلچسپ نظام بنایا ہے۔ اسی وجہ سے مشرقی افریقہ میں سب سے زیادہ کافی اسی علاقے میں پیدا ہوتی ہے۔

ماؤنٹ کلمنجارو کے نشیب و فراز کا حسن بکھرا پڑا ہے۔ ان نشیب و فراز کے نچلے حصوں میں چھاگا قبائل نے اپنے فارم بنا رکھے ہیں جبکہ اوپر کے حصے بادلوں سے ڈھکے جنگلات پر مبنی ہیں جن میں بے شمار جانور پائے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ بندر ہیں جن کے جسم کی کھال سیاہ اور سفید اور خوب لمبی ہوتی ہے۔ وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ تک بہت لمبی لمبی چھلانگیں لگاتے ہیں اور اپنی لمبی کھال کو ایک پیراشوٹ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

کلمنجارو کا ایک نایاب جانور ایبٹ ڈیوکر ہے۔ یہ جانور صرف تنزانیہ کے شمالی جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ سرخی مائل براؤن رنگ کا یہ جانور 30 انچ تک لمبا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ جانور صرف رات کو ہی دیکھ سکتا ہے اس لیے یہ بہت کم کسی کو نظر آتا ہے۔

❁ ❁ ❁

وکٹوریہ آبشار

(Victoria Falls)

افریقہ کا سب سے عظیم الشان آبشار

دریائے زمبیزی پر واقع وکٹوریہ آبشار براعظم افریقہ کی سب سے عظیم آبشار ہے۔ یہ آبشار ایک قابل دید نظارہ پیش کرتی ہے۔ صرف اینجل فالز اور نیاگرا ہی اس کی شان و شوکت کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ 3500 کلومیٹر (2175 میل) لمبا دریائے زمبیزی افریقہ کا چوتھا بڑا دریا ہے۔ یہ زمبیا کے شمال مغرب سے نکلتا ہے اور انگولا و زمبیا سے گزرتا ہوا جنوب کی جانب بہتا ہے۔ پھر یہ دریا خم کھا کر مشرق کی جانب مڑتا ہے اور اچانک وکٹوریہ آبشار کے درمیانی حصے پر گرتا ہے۔

وکٹوریہ آبشار کی اونچائی 256 فٹ (78 میٹر) تک ہے۔ دریائے زمبیزی (Zambezi) جو اس آبشار کا منبع ہے آبشار کے مقام پر ایک میل کے قریب چوڑا ہے۔ 1855ء میں برطانیہ کے مشہور سیاح ڈیوڈ لیونگ سٹون نے اسے دریافت کیا اور اپنی ملکہ کے اعزاز میں اس کا نام وکٹوریہ آبشار رکھا۔ افریقہ کے اصلی باشندے اس آبشار کو دیوتا مانتے اس کی پوجا کرتے اور جانوروں کو اس کی بھینٹ چڑھاتے تھے۔ اس علاقے کے لوگوں نے اس آبشار کو ''Smoke That Thunders'' کا نام بھی دیا۔ آبشار پر ایک چھوٹا ہائیڈرو الیکٹرک پلانٹ بھی لگایا گیا جو چھوٹے پیمانے پر بجلی پیدا کرتا ہے۔

وکٹوریہ آبشار کے تیزی سے گرنے سے جو دھند پیدا ہوتی ہے اُسے بادلوں کی شکل

میں 60 کلومیٹر (37 میل) کے فاصلے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے آبشار کے قریب جائیں ایک ایسی بھیانک گونج کی آواز کانوں میں پڑتی ہے کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں۔ وکٹوریہ آبشار کے پانی کو دیگر آبشاروں کے پانی کی طرح کسی تالاب میں جمع نہیں کیا جاتا بلکہ ایک گہری اور تنگ زمین کی درز میں ڈالا جاتا ہے جو دریائے زمبیزی کے ساتھ ساتھ 5533 فٹ تک وسیع ہو جاتی ہے اور یہی اس دریا کا سب سے چوڑا حصہ ہے۔ اس درز یا غار کی گہرائی 354 فٹ اور چوڑائی 79 سے 240 فٹ تک ہے۔ اس آبشار میں سب سے زیادہ پانی مارچ اور مئی کے درمیان گرتا ہے۔ یہاں پانی کے گرنے کی رفتار 33176 مکعب فٹ فی سیکنڈ تک ہوتی ہے اور یوں پانی گرنے کی سالانہ اوسط رفتار 38846 مکعب فٹ فی سیکنڈ ہے۔

مقامی قبیلے ''کالولولازی'' اپنی زبان میں اس آبشار کو ''موسی یوتویانا'' پکارتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں ''Smoke That Thunders'' (گرجدار دھواں)۔ آبشار سے پیدا ہونے والی دھند جب سرد ہوا کے ساتھ ملتی ہے تو آبشار کے اوپر بڑے بڑے بادل بن جاتے ہیں۔ یہ بادل تقریباً ایک ہزار فٹ تک بلند ہوتے ہیں۔ اس کہر میں حسین قوس وقزح بنتی ہے اور ہر نئے چاند پر دلکش ہلال نما قوس وقزح کا عکس دھند میں نظر آتا ہے۔ پانی کی جھال بے شمار حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہاڑی چوٹی کا وہ کنارہ جو آبشار کی جانب ہے وہاں مشہور و معروف بارش کا جنگل ہے۔ یہ جنگل آبشار کی بوچھاڑ کی وجہ سے سارا سال ہرا بھرا رہتا ہے اور بہت گھنا جنگل ہے۔ وکٹوریہ آبشار جہاں ختم ہوتی ہے وہ برج کی شکل کا ایک تنگ راستہ ہے۔ یہ تنگ راستہ مشرقی جانب سے 512 میٹر (1680 فٹ) ہے۔ 64 میٹر چوڑا اور 118 میٹر لمبا یہ برج نما راستہ پورے دریائے زمبیزی کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ یہاں سے دریا 45 میل تک نشیب میں جاتا ہے اور بھول بھلیوں کی طرح مختلف راستوں سے گزرتا ہوا زمبیزی کی مشہور عظیم گھاٹی بناتا ہے۔

آبشار کے نزدیک آبی گھاٹی پر 200 میٹر (656 فٹ) لمبا پل 1905ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس پل کے بننے سے آبشار کا نظارہ بہت خوبصورت ہے۔ جب اس پل پر سے ریل گاڑیاں گزرتی ہیں تو ان پر آبشار کی ٹھنڈی پھوار پڑتی ہے۔

❁ ❁ ❁

جیجو آئی لینڈ

(Jijo Islands)

جزیرہ نما کوریا کا جنت نظیر علاقہ

جزیرہ نما کوریا کا ایک حسین علاقہ جیجو آئی لینڈ اس خطۂ ارض کے سینے پر دمکتا ہوا ایک ایسا ہیرا ہے جسے بلاشبہ اس کی بے پناہ خوبصورتی کی وجہ سے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس جزیرے کا نیم بارانی موسم، جھیلیں اور چشمے، انتہائی لذیذ اور روایتی کھانے اور اس کی ثقافت اسے کوریا کے دیگر علاقوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس جزیرے پر موجود آتش فشاں پہاڑ "Hall Asan" بھی اس حسین خطے کی ایک اہم یادگار ہے۔ یہ آتش فشاں 1950 میٹر بلند ہے اور یہ جمہوریہ کوریا کے بلند ترین پہاڑ پر واقع ہے۔ موسم بہار میں اس علاقے کی سیر سیاحوں پر ایک سحر سا طاری کر دیتی ہے۔ اس وقت یہ وادی رنگا رنگ پھولوں سے ڈھک جاتی ہے۔

جزیرہ جیجو صرف قدرتی حسن کی دولت سے مالا مال نہیں ہے بلکہ یہاں فائیو اسٹار ہوٹل بھی ہیں۔ اس جزیرے پر صرف کلب، کیسینو اور عالمی معیار کے ریسٹورنٹ ہی نہیں بلکہ اس کے ساحل بھی اتنے خوبصورت ہیں کہ یہاں ہر لحظہ سمندری لہریں ٹکراتی رہتی ہیں۔ جیجو کے قریب یوڈو آئی لینڈ ہے۔ "UDO" کے معنی مقامی زبان میں "گائے" کے ہیں۔ یہاں بڑے پیمانے پر "فش فارمنگ" کی جاتی ہے۔ اس جزیرے کی غوطہ خور خواتین بھی سیاحوں کی

دلچسپی کا باعث ہیں۔ اس جزیرے پر ایک بلند و بالا پہاڑ بھی ہے۔ اس پہاڑ پر سے اس کے پڑوسی جزیرے جیجو کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

جیجو کے مشہور و معروف آبشار کا نظارہ بھی سیاحوں پر جادو طاری کر دیتا ہے۔ اس آبشار کی تین دھاریں الگ الگ سمندر میں گرتی ہیں اور یہ نظارہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جزیرے کے حوالے سے کوریا میں کئی دیومالائی کہانیاں بھی مشہور ہیں۔ اس علاقے میں ایک قدیم اور قدرتی غار بھی موجود ہے جس میں گوتم بدھ کا مجسمہ بھی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ مجسمہ گوریو دور (918ء-1392ء) میں بنایا گیا تھا۔ 5 میٹر بلند یہ چٹان بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ہائیڈ پارک

(Hyde Park)

لندن کا مشہور زمانہ پارک جہاں آزادانہ تقریریں کی جاسکتی ہیں

برطانیہ کے دارالحکومت لندن کے وسط میں کنسنگٹن گارڈن (Kensington Gardon) سے منسلک ہائیڈ پارک 615 ایکڑ (249 ہیکٹر) رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ پارک 1536ء میں برطانیہ کے شاہ ہنری ہشتم نے راہب ویسٹ منسٹر ایبے سے حاصل کیا جو بادشاہ کے لیے شکارگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ شاہ چارلس اول نے ہائیڈ پارک کو کنسنگٹن گارڈن سے الگ کر دیا اور 1637ء میں عام لوگوں کے لیے کھول دیا۔

موجودہ پارک کا خاکہ آرکیٹکٹ انجینئر ڈیکیمو برٹون (Decimu Burton) نے 1825ء میں تیار کیا تھا۔ شاہ جارج دوم (عہد حکومت 60-1727ء) کی ملکہ کیرولین نے 1730ء میں پارک کے اندر ایک جھیل تعمیر کرائی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ 19 ویں صدی میں ہائیڈ پارک جلسے جلوسوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ 1872ء میں لندن میں ہونے والے فسادات کے دوران پولیس نے جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کر دی تو ہائیڈ پارک سپیکر کارنر کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ یہاں ایک سپیکر کارنر ہے جہاں پر آزادانہ تقریریں کی جاسکتی ہیں۔ ان تقاریر پر کسی مقرر کو گرفتار نہیں کیا سکتا۔ حتیٰ کہ ملکہ برطانیہ اور وزیراعظم کے خلاف تقریر کرنے پر بھی قانون حرکت میں نہیں آتا۔

چینل ٹنل

(Channel Tunel)

سمندر کی تہہ کے نیچے قائم ریلوے سرنگ

چینل ٹنل برطانیہ اور فرانس کو انگلش چینل کے نیچے ایک 32 میل لمبی ریل سرنگ ملاتی ہے۔ جب دونوں ممالک نے فیصلہ کیا کہ برطانیہ اور فرانس کو ملانے کے لیے ایک سرنگ سمندر کی تہہ میں تیار کی جائے تو انجینئروں کے سامنے یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ نہ صرف یہ کہ انہیں دنیا کی طویل ترین سرنگوں میں سے ایک سرنگ تیار کرنی تھی بلکہ یہ بھی کہ اتنی لمبی سرنگ میں مسافر محفوظ رہیں گے۔ اس وقت سرنگوں میں آگ لگنے کے واقعات عام تھے۔ چنانچہ اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا کہ سرنگ کے ساتھ ایمرجنسی حالات میں باہر نکلنے کا بھی ایک راستہ تیار کیا گیا۔

یہ دنیا کی دوسری سب سے بڑی ریل ٹنل ہے جو 1994ء میں مکمل ہوئی۔ سب سے زیادہ طویل سرنگ جاپان میں سیکن ٹنل کے نام سے موجود ہے۔ چینل ٹنل کو "یوروٹنل" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تین سرنگیں ہیں۔ دو ٹیوبز بڑے اور مکمل سائز کی ہیں جہاں سے ریل ٹریفک گزرتی ہے۔ جبکہ ان دونوں ریل ٹیوبز کے درمیان ایک چھوٹی سروس ٹنل ہے جو ایمرجنسی میں باہر نکلنے کے لیے ہے۔ سرنگ میں کئی ایک ایسے دوراہے بھی بنائے گئے ہیں جہاں سے ٹرینیں ایک ٹریک سے دوسرے ٹریک پر راستہ تبدیل کر سکتی ہیں۔

چینل ٹنل کا منصوبہ ایک بہت مہنگا منصوبہ تھا۔ جس کے لیے خصوصی طور پر تیار کردہ ٹنل بورنگ مشینوں کو انگلش چینل سے سینکڑوں فٹ نیچے یہ طویل سرنگ کھودنے میں تین سال لگے۔ برطانیہ اور فرانس کے درمیان ایک مستقل راستہ بنانے کا منصوبہ متعدد بار پیش ہوا۔ نپولین بوناپارٹ کے دورِ حکومت میں 1802ء میں ایک سرنگ کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں ہوا کی گزرگاہ کے لیے چمنیاں بنائی جاتیں اور اسے گیس لیمپوں کے ذریعے روشن کرنے کا مشورہ دیا گیا لیکن اس وقت تکنیکی اعتبار سے یہ ڈیزائن ممکن نہ تھا۔ 1880ء کی دہائی میں ٹنل کے کچھ حصے بنائے گئے لیکن برطانوی فوج کے اس خدشے اور اعتراض کی بنا پر کہ اس کے ذریعے برطانیہ پر بیرونی حملہ آسان ہو جائے گا حکومت نے یہ منصوبہ ترک کر دیا۔

1974ء میں دوبارہ یہ منصوبہ شروع ہوا لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔ اس کے بعد جب برطانیہ ''کامن مارکیٹ'' (سابقہ نام۔ یورپی یونین) میں شامل ہوا تو ایک مستقل رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ 1986ء میں برطانیہ اور فرانس کے ایک مشترکہ کنسورشیم ''یوروٹنل'' کو اس کی تعمیر کا ٹھیکہ دے دیا گیا کہ وہ گاڑیوں کی ترسیل کے لیے ایک ریل شٹل سروس اور ایک مسافر ٹرین کے لیے دو سرنگیں تیار کرے۔ چنانچہ 1994ء میں یہ منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

سمندر کی تہ سے تقریباً 150 فٹ نیچے واقع چینل ٹنل 20ویں صدی میں انجینئرنگ کا اہم ترین کارنامہ ہے۔ جب یہ منصوبہ شروع کیا گیا تو اس وقت یہ دنیا کا سب سے مہنگا تعمیراتی منصوبہ تھا جس کی تکمیل پر 21 بلین ڈالر لاگت آئی۔ یہ اخراجات گولڈن گیٹ برج کی تعمیر پر ہونے والے اخراجات سے 700 گنا زیادہ تھے۔ اس چینل کی تعمیر کے لیے جو بورنگ مشینیں استعمال ہوئیں وہ خود فٹ بال کے دو گراؤنڈز کی لمبائی سے زیادہ تھیں اور روزانہ 250 فٹ بورنگ کر سکتی تھیں۔

چینل ٹنل 50 کلومیٹر لمبی ہے جس میں سے 39 کلومیٹر سرنگ سمندر کی تہہ کے نیچے ہے۔ پہلے پانچ سالوں میں یہاں سے گزرنے والی ٹرینوں سے 28 ملین مسافروں نے سفر کیا اور 12 ملین ٹن سے زیادہ سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا گیا۔ آج اس ٹنل میں سے ٹرینیں 100 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتی ہیں جنہیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک

سرنگ پار کرنے میں صرف 20 منٹ لگتے ہیں۔

اس چینل کے افتتاح کے صرف ایک سال بعد ہی یہاں پہلا حادثہ پیش آیا۔ جب فرانس سے آنے والی ٹرین میں آگ لگ گئی اور 31 مسافر یہاں پھنس گئے لیکن سروس (ایمرجنسی) ٹنل کی وجہ سے تمام لوگ بحفاظت یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

رانی کوٹ

(Ranikot Fort)

دنیا کا سب سے بڑا قلعہ

وطن عزیز پاکستان دنیا کے اس خطہ ارض میں واقع ہے جو تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے مالا مال ہے۔ آثار قدیمہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہاں ایسی قوم آباد رہی ہے جو صنعت و حرفت اور مختلف فنون میں مہارت رکھتی تھی۔ یہاں بہت سی ایسی قدیم عمارتیں موجود ہیں جن کی مثال دیگر خطوں میں ملنا مشکل ہے۔ رانی کوٹ کا قلعہ بھی ایک ایسی ہی ایک تاریخی عمارت ہے۔

رانی کوٹ کا قلعہ رقبے کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا قلعہ ہے جس کی چار دیواری 24 کلومیٹر طویل ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک منفرد عمارت ہے۔ اس بات کی باقاعدہ تصدیق کی جا چکی ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا قلعہ رانی کوٹ قلعہ ہے۔ اس کے جواب میں کسی بھی ملک کی طرف سے دعویٰ نہیں کیا گیا۔ 24 کلومیٹر لمبی دیواروں کا حامل یہ قلعہ فنِ تعمیر کے اعتبار سے بھی ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ساری دیواریں انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ نہیں ہیں بلکہ بعض جگہوں پر چٹانوں کو تراش کر دیواروں کا کام لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ شاید دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد عمارت ہے جہاں پہاڑیوں کو اس کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ کام ماہرین فن اور سنگ تراشوں نے اتنی خوبصورتی سے کیا ہے کہ پہلی نظر میں اندازہ

ہی نہیں ہوتا کہ یہ چٹانیں ہیں یا اینٹ سے چنی ہوئی دیواریں ہیں۔

بہت سے دوسرے قلعوں کی طرح یہ بھی پہاڑیوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ عام طور پر اسے سلسلہ کوہ کیرتھر کا حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ رانی کوٹ ''توز'' کے پہاڑی سلسلے میں واقع ہے اور انہیں پہاڑوں کو کاٹ کر ان سے قلعے کی دیواروں کا کام لیا گیا ہے۔ اس کی دیوار کو دیوار چین کے بعد دنیا کی سب سے لمبی دیوار کہا جاتا ہے۔ رانی کوٹ ''سن'' کے قصبے سے 30 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ قلعہ 324 قبل مسیح میں بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر میں ڈھائی ہزار مزدوروں نے حصہ لیا۔

بین الاقوامی ماہرین کے مطابق یہ قلعہ دور قدیم کے جنگجو قبائل نے تعمیر کیا تھا جو یہاں آباد ہوئے اور انہوں نے بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ کے لیے تعمیر کیا۔ یہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کا ذکر ہے۔ بعض روایات کے مطابق یہ قلعہ تالپور حکمرانوں نے تعمیر کروایا لیکن تاریخی حوالوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ قلعے کے اندر مزید چھوٹے قلعے ہیں جن کے نام ''میری'' اور شہر گڑھ'' ہیں۔ ممکن ہے کہ تالپور میروں نے یہ دونوں قلعے تعمیر کروائے ہوں کیونکہ رانی کوٹ کی دیواروں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تالپور دور سے پہلے کا بنا ہوا ہے۔

رانی کوٹ نیم پہاڑی علاقے میں بنا ہے اور اس کے چار بڑے دروازے ہیں۔ مغربی سمت میں موہن دروازہ، شمالی مغربی سمت میں امری دروازہ، جنوب کی طرف شہپر دروازہ واقع ہیں۔ جبکہ قصبہ ''سن'' کی طرف سے آنے والے راستے سے جس کے ذریعے قلعے میں داخل ہو سکتے ہیں سن گیٹ کہلاتا ہے۔ یہ دروازے صرف دیوار میں گزرگاہوں کے طور پر محفوظ ہیں اور اصل گیٹ اب موجود نہیں ہیں۔ قلعے کی دیوار میں خلا ہے اور دونوں جانب پتھر لگے ہوئے ہیں جو گیٹ کی حد بندی ظاہر کرتے ہیں۔

اس قلعے کے نام رانی کوٹ کے متعلق بھی کئی کہانیاں مشہور ہیں۔ سندھی زبان میں ''رانی'' ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی کا کوئی چشمہ زیرزمین چلتا ہوا آگے کسی دوسری جگہ پر جا کر نکلے۔ اسی وجہ سے اس قلعے کا نام رانی کوٹ پڑ گیا کہ یہاں ایک ندی ہے جو کافی فاصلے تک زیرزمین چلتی ہے۔ یہ بات قرین قیاس بھی ہے۔ قلعے کے اندر ایک پورا گاؤں آباد

ہے جس کی آبادی تقریباً 500 ہے۔ یہ لوگ گلہ بانی اور زراعت کے پیشے سے منسلک ہیں اور آبپاشی کے لیے اسی ندی کا پانی استعمال کرتے ہیں۔ اس نام کے متعلق دوسری روایت یہ ہے کہ تالپور عہد میں بعض غداروں کی وجہ سے یہ قلعہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا تو لوگوں نے اس کا نام ''رن کوٹ'' رکھ دیا۔ سندھی زبان میں ''رن کوٹ'' اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر قتل کر دیا گیا ہو۔

نامبا

(Namba)

دنیا کا انتہائی قدیم ترین قبیلہ

کرۂ ارض ابھی تک رازوں میں چھپی ہوئی ایک حقیقت ہے۔ اس کے کونے کونے میں ایسے انسان رہتے ہیں جو مہذب دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ دنیا کے نقشے پر نظر ڈالیں تو آسٹریلیا کے جنوب میں تقریباً 70 چھوٹے چھوٹے جزیروں کا مجموعہ پھیلا ہوا ہے۔ اس مجموعے کو ''نیو ہیبر یڈز'' (New Hebrides) کہتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بحرالکاہل میں جاپانیوں کی یلغار روکنے کے لیے اتحادیوں نے ان جزائر پر قبضہ کر لیا۔ اب یہ جزائر برطانیہ اور فرانس کے زیر قبضہ ہیں۔

مالیکولا (Malekula) یہاں کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یہ 60 میل لمبا اور 25 میل چوڑا ہے۔ آبادی صرف 1200 نفوس ہے۔ لوگ مذہباً عیسائی ہیں مگر ان میں سے کچھ کسی مذہب کے پیروکار نہیں بلکہ مٹتی ہوئی تہذیب اور رسم و رواج کے پابند ہیں۔ یہ نامبا قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں جو دنیا کا قدیم ترین قبیلہ ہے۔ ان کی تعداد تقریباً 250 ہے۔ ان میں آدھے جزیرے کے بالائی اور آدھے زیریں علاقے میں آباد ہیں۔ پہلے یہ مردم خور تھے مگر جنگ عظیم دوم کے دوران جب اتحادی یہاں قابض ہوئے تو انہوں نے آدم خوری کے خلاف سخت اقدامات کیے۔ 1940ء کے بعد جو جو شخص مردم خوری کا مرتکب ہوتا اسے موت کی سزا دی

جاتی۔

ناما قبیلے کے لوگ جن علاقوں میں آباد ہیں ان تک پہنچنے کے راستے نہایت دشوار گزار ہیں۔ جگہ جگہ پہاڑی ڈھلوانین ہیں۔ آئے دن کی بارش سے راستے دلدل اور کیچڑ بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں تک بہت کم لوگ پہنچ سکے۔ 2004ء میں ایک برطانوی خاتون سیاح الزبتھ نے ناما قبیلے کا دورہ کیا تو وہ یہاں کے رسم ورواج دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پہلے یہ مادر زاد برہنہ رہتے تھے مگر اب دوسرے لوگوں کی آمدرفت اور میل ملاپ سے انہوں نے ستر پوشی شروع کی ہے۔ اس مقصد کے لیے انجیر کے پتوں، کیلے کی چھال اور ریشوں سے چھوٹی چھوٹی جھالریں تیار کر کے کمر کے گرد باندھتے ہیں۔ عورتوں کے سر پر بھی اسی قسم کی ایک لمبی اور گھنی جھالر لپٹی ہوتی ہے جس سے برقعے کا کام لیا جاتا ہے۔

اس قبیلے میں بھابھی کا رشتہ احترام کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ عورت اپنے شوہر کے بھائیوں کے سامنے ننگے چہرے کے ساتھ نہیں آتی۔ ناک کی ہڈی میں سوراخ کر کے سؤر کا دانت ڈال لینا یہاں کے مردوں کا پسندیدہ فیشن ہے۔ کیونکہ یہاں سؤر بکثرت پائے جاتے ہیں۔ قبیلے میں کسی فرد کی امارت اور مرتبے کا اندازہ سؤروں کے ریوڑ سے لگایا جاتا ہے۔ ان میں اکثر لوگ کرنسی (پونڈ و آسٹریلوی ڈالر وغیرہ) سے واقف ہیں مگر اس کے باوجود لین دین اور اہم سودے مقامی کرنسی جنگلی سؤر کے لمبے دانتوں سے کرتے ہیں۔ اس کرنسی کے حصول کے لیے تقریباً ہر شخص چند سؤر ضرور پالتا ہے۔ نر سؤر ایک سال کا ہوتا ہے تو اس کے اگلے چار دانت توڑ ڈالتے ہیں تاکہ نئے دانت گول اور ٹیڑھے نکل سکیں۔ دانت جتنے ٹیڑھے ہوں گے اتنے ہی بیش قیمت ہوں گے۔

ناما قبیلے کا عقیدہ ہے کہ آباؤ اجداد کی روحیں جنگل کے دوسرے عناصر اور بدروحوں کے ساتھ مل کر حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے سکتی ہیں۔ اس لیے یہ وقتاً فوقتاً رسوم ادا کر کے انہیں خوش کرتے ہیں۔ ان میں جو لوگ روحوں کو بلانے یا ان سے حسب منشا کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں مقدس یا زہریلا آدمی کہتے ہیں۔ تاہم کوئی بھی زہریلا آدمی خواہ کتنی پوشیدہ قوتوں کا مالک کیوں نہ ہو قبیلے کی روایات اور اصولوں کا احترام کرتا ہے۔

بچہ جب سات آٹھ برس کا ہو جائے تو اس کا خوف اور ڈر دور کرنے کے لیے ایک

رسم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے آبادی سے باہر جہاں اونچے اور گھنے درختوں کے جھنڈ ہوں تین چار بچوں کے ہاتھ پیر باندھ کر شام کے وقت انہیں یہاں ڈال دیا جاتا ہے۔ جنگل کا سناٹا اور دہشت اس قدر خوفناک ہوتی ہے کہ بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ آدھی رات کے قریب بچوں کے رشتہ دار اور قبیلے والے ہاتھوں میں خشک بانس کی مشعلیں لیے ناچتے گاتے اور شور مچاتے ہوئے آتے ہیں اور خوب ادھم مچاتے ہیں۔ جنگل کے اندھیرے اور سناٹے میں یہ ساری رسم نہایت ہولناک معلوم ہوتی ہے۔ بچے خوف کے مارے سہم جاتے ہیں اور صبح کے قریب ان بچوں کے ہاتھ پیر کھول دیئے جاتے ہیں اور رسم ختم ہو جاتی ہے۔

نامبا کے ہاں عورت کی خوبصورتی اور وفاداری کا معیار دنیا بھر سے انوکھا ہے جس عورت کا ایک اگلا دانت ٹوٹا ہوا ہو وہ نہایت وفاشعار اور خوبصورت سمجھی جاتی ہے۔ مرد شادی کے لیے ایسی ہی عورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس قدر و منزلت کو حاصل کرنے کے لیے عورتیں اپنا دانت تڑوانے کے لیے بخوشی تیار ہو جاتی ہیں۔ کوئی شخص مر جائے تو ایک طویل رسم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بچے کی موت کو یہ لوگ طبعی امر تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ کسی دشمن یا زہریلے آدمی نے شرارت کی ہے۔

مرنے والے کا سوگ منانے کے لیے اپنے چہرے اور جسم پر سفید راکھ مل لیتے ہیں۔ لاش کا سر کاٹ کر دھڑ آبادی سے باہر میدان میں ایک ماتمی چبوترے پر رکھ دیتے ہیں جو ایک سال تک گھاس پھوس سے خوب اچھی طرح ڈھکا ہوا پڑا رہتا ہے۔ سر پر سرخ مٹی اور مختلف نباتاتی ریشوں کا لیپ کر دیتے ہیں۔ چند دن بعد مٹی خشک ہو جاتی ہے اور اس پر مرنیوالے کے چہرے کے نقوش ابھر آتے ہیں۔ پھر مٹی کے اس پتلے کو ایک بانس پر نصب کر دیتے ہیں۔ سال ختم ہونے میں 10 دن باقی رہ جاتے ہیں تو سب قبیلے والے میدان میں ماتمی چبوترے کے گرد جمع ہوتے ہیں اور دس دن تک جی بھر کر ناچتے ہیں اور ماتمی گیت گاتے ہیں۔ آخری دن دھڑ کو گھاس پھوس سے نکالتے اور مٹی کے چہرے کے ساتھ جوڑ کر بانس پر لٹکا دیتے ہیں۔ اب اس پر گوناگوں نقوش، لکیریں اور دائرے وغیرہ بنائے جاتے ہیں جن سے مرنے والے کے معاشرتی مقام اور مرتبے کا پتہ چلتا ہے۔

اگلے مرحلے میں مٹی کے پتلے اور دھڑ کو بانس پر اٹھائے صبح سویرے جلوس نکلتا ہے

جو سارے گاؤں کا چکر لگاتا ہے اور دوپہر کے قریب میدان میں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ مرد میدان میں بیٹھ جاتے ہیں۔ عورتوں کو میدان میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پوری رسم کے بعد سؤر کی قربانی دی جاتی ہے اور گوشت گاؤں بھر میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ یوں تجہیز و تکفین کی رسم ختم ہو جاتی ہے۔ مٹی کا پتلا زندگی بھر خاندان والوں کے پاس بطور یادگار محفوظ رہتا ہے۔

❀ ❀ ❀

ڈزنی لینڈ

(Disney Land)

حیرت، تجسس اور پراسراریت سے بھرپور دنیا

ڈزنی لینڈ (Disnney Land) کا بانی والٹ ایلیس ڈزنی ایک ایسا شخص جو ایک چھوٹی چوہیا کے اچھوتے خیال سے جتنا مشہور ہوا اتنا ہی امیر بھی ہوا۔ شکاگو (امریکہ) میں پیدا ہونے والے والٹ ڈزنی کا تعلق ایک غریب اور مفلس گھرانے سے تھا اور کبھی تو اسے دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہ ہوتی تھی مگر آج دنیا کے شمالی سرے سے جنوبی سرے تک کون ہوگا جو والٹ ڈزنی کی کارٹون فلموں کو شوق سے نہ دیکھتا ہو۔

والٹ ڈزنی نے 1928ء میں چلتے پھرتے اور بولتے کارٹون بنائے اور مکی ماؤس نامی کارٹون متعارف کرایا۔ اس کارٹون کی پس پردہ آواز خود ڈزنی کی تھی۔ ''مکی ماؤس'' جلد ہی پوری دنیا میں مقبول ہوگیا۔ 1937ء میں والٹ ڈزنی نے ہالی وڈ (کیلی فورنیا) میں ایک ''والٹ ڈزنی اسٹوڈیو'' بنایا۔ جس میں اس نے ''سفید برف اور سات بونے'' نامی کارٹون فلم بنائی۔ والٹ ڈزنی اسٹوڈیوز کی حدود میں لوگوں کو تفریح کی ایک ایسی دنیا نظر آتی ہے جہاں قدم قدم پر حیرت، تجسس اور پراسراریت کا ایک ایسا ماحول ملتا ہے جسے والٹ ڈزنی کی کارٹون اور فیچر فلموں کا ہی خاصا سمجھا جاتا ہے۔

والٹ ڈزنی اسٹوڈیوز میں مہمانوں کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے ہالی

وڈ کی تاریخ کی متعدد عظیم فلموں میں استعمال ہونے والی اشیاء بھی موجود ہیں۔ یہاں پر ہالی وڈ کی کئی مشہور عمارتوں اور دنیا کے کئی مشہور مقامات کی ہو بہو نقل بھی ایک نئے انداز سے بنائی گئی ہے۔ 135 ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے ڈزنی ایم جی ایم اسٹوڈیوز میں داخل ہوں تو سب سے پہلے والٹ ڈزنی کے مشہور ترین کردار مکی ماؤس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر نظر پڑتی ہے۔ مکی ماؤس کا یہ چہرہ دراصل مختلف رنگوں کے پھولوں کو ایک خاص ترتیب سے اگانے کے بعد وجود میں لایا گیا ہے۔ مکی کا پھولوں سے بنا یہ چہرہ اسٹوڈیوز کے مرکزی دروازے سے کچھ پہلے موجود ایک چھوٹے سے باغ کے عین وسط میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سے آگے اسٹوڈیوز کے مرکزی دروازے ہیں جس پر ہالی وڈ کے بہترین سیٹ ڈیزائنر نے کمال مہارت کے ساتھ آرٹ کا ایسا کام کیا ہے جو آنکھوں کو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔

گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد پام کے درختوں کی ایک طویل قطار ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اس وقت واقعی کیلی فورنیا میں ہیں۔ کیونکہ پام کا درخت ریاست کیلی فورنیا کا نشان بھی ہے۔ درختوں کی اس قطار کے اختتام پر چینی تھیٹر کی عمارت ہے جو اپنے امریکی دوستوں کے لیے خود چینی کاریگروں نے تیار کی۔ پام کے درختوں کی قطار کے اختتام پر واقع چینی تھیٹر کی عمارت کے سامنے سے مہمان اسٹوڈیوز کی طرف سے فراہم کردہ ٹرام میں سوار ہوتے ہیں۔ ٹرام ڈزنی کے مہمان بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور خواتین و حضرات کو لے کر اپنے کبھی نہ بھلائے جانے والے سفر کا آغاز کرتی ہے۔ چینی تھیٹر کی عمارت سے جب ٹرام آگے بڑھتی ہے تو اس کے مسافر اسٹوڈیو کے ایک ایسے علاقے کو دیکھتے ہیں جو ایک بہت بڑے بازار کی مانند دکھائی دیتا ہے۔ پھر ٹرام کے دونوں اطراف میں واقع مختلف قسم کی دکانوں کے درمیان سے ایک سڑک گزرتی ہے جسے ہالی وڈ بلے وارڈ کہا جاتا ہے۔ اس علاقے میں روشنیوں کا انتظام اس قدر شاندار ہے کہ اگر غروب آفتاب کے بعد یہاں آئیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خوابوں کی دنیا میں آ گئے ہیں۔ یہاں آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور انسان سحر زدہ حالت میں یہ سب کچھ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

ہالی وڈ بلے وارڈ سے ٹرام اپنے مسافروں کو لے کر آگے بڑھتی ہے تو اس کی اگلی منزل ''تھیٹر آف دی اسٹارز'' ہے۔ یہاں دنیا کا معروف ترین کارٹون کردار مکی ماؤس اپنے

بہت سے کارٹون ساتھیوں کے ساتھ مل کر مختلف نوعیت کے دلچسپ، سنسنی خیز اور انوکھے تفریحی پروگرام پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ قریب ہی ہالی وڈ کے ماضی اور حال سے تعلق رکھنے والے بہت سے فلمی اداکاروں کے ڈپلی کیٹ کچھ اس قدر بھرپور انداز میں اداکاری کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو ان کے اصل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سارے اداکار اصل نہیں ہوتے۔

ستاروں کے تھیٹر کے ہنگاموں اور دلچسپیوں سے لطف اندوز ہو کر مہمان اگلی منزل کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ ٹرام مہمانوں کو لیکر ایک دوسرے راستے سے ایک بار پھر ہالی وڈ بلے وارڈ آتی ہے اور بغیر رکے چینی تھیٹر کی عمارت کے عقبی حصے میں آجاتی ہے۔ یہ وہی عمارت ہے جہاں سے ٹرام کے ذریعے سفر کا آغاز ہوا تھا۔ یہاں ٹرام کے مسافر ایک جگہ ڈزنی کے کرداروں کو گیلے سیمنٹ کی تہہ پر اپنے ہاتھوں کے نقوش ثبت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ تقریب دراصل ہالی وڈ کی تاریخ کی ایک بہت ہی پرانی روایت کی یادگار ہے۔ اس روایت کے تحت ہالی وڈ کے تمام نامور فنکاروں کو گیلے سیمٹ پر اپنے ہاتھوں کے نقوش ثبت کرنا لازمی ہوتا تھا۔ اس مقام کو ''ہالی وڈ پلازہ'' کہا جاتا ہے۔ یہاں سے مہمان چاہیں تو ٹرام سے باہر نکل کر چینی تھیٹر کی عمارت کے اندر بھی جا سکتے ہیں۔ اس عمارت میں ہالی وڈ کی فلموں سے تعلق رکھنے والی بے شمار یادگار اشیا رکھی ہیں۔ جن میں دنیا کی کامیاب ترین فلم ''وزرڈ آف اووز'' کی ہیروئن کے جوتے، فنکاروں کے کپڑے اور مکی ماؤس کی لیموزین کار شامل ہیں۔ کار کی لمبائی 40 فٹ ہے اور اس کار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے لمبی کار ہے۔

''عظیم فلمی سفر'' کے اگلے مرحلے میں ٹرام ایک ایسے علاقے میں داخل ہوتی ہے جہاں اصل پتھروں کو تراش کر مصنوعی طور پر ایک چٹیل علاقے کا منظر تخلیق کیا گیا ہے۔ اس علاقے کو ''ہالی وڈ ہلز'' کہتے ہیں۔ اس پورے علاقے کا ماحول نیم تاریک دکھائی دیتا ہے۔ مسافروں سے بھری ٹرام جب دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرتی ہے تو اچانک ایک بڑا سا انسانی ڈھانچہ ایک زبردست آواز کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس اچانک افتاد سے مسافر چونک جاتے ہیں اور چوکس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد جوں جوں ٹرام آگے بڑھتی ہے

ویسے ویسے مہمان مختلف مشہور فلموں کے خوفناک کرداروں کوٹرام کے اردگرد جھاڑیوں اور پہاڑوں سے برآمد ہوتے دیکھتے ہیں۔ ان کرداروں میں ڈریکولا، جیسن اور فریڈی سب ہی شامل ہوتے ہیں۔ دراصل یہ سارے فلمی جسم یہاں مختلف نوعیت کی مشینوں کے ذریعے حرکت کرتے ہیں۔ چونکہ یہ بہت ہی غیر متوقع طور پر برآمد ہوتے ہیں لہٰذا مسافر بدحواس ہو جاتے ہیں۔

اس خوفناک اور پراسرار ماحول اور علاقے کے بعد ٹرام کے مسافر خود کو ایک ایسے علاقے میں پاتے ہیں جو ایک چھوٹے سے دیہات کی مانند لگتا ہے۔ مسافر دیکھتے ہیں کہ دیہات کی بہت سی دکانوں کے درمیان ایک چھوٹا سا بنک بھی ہے۔ اس بنک میں چند ڈاکو کسی مجرمانہ سرگرمی میں مشغول ہیں۔ ڈاکو بینک کی بڑی سی تجوری کے دروازے کو ایک چھوٹے بم کی مدد سے تباہ کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں بینک کی کھڑکیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ ٹرام کا ڈرائیور کوشش کرتا ہے کہ ڈاکوؤں کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی ٹرام کو وہاں سے بحفاظت نکال کر لے جائے لیکن اس کے ایسا کرنے سے قبل ڈاکو ٹرام کو دیکھ لیتے ہیں اور ٹرام تک پہنچ کر اس کے مسافروں کو اغواء کر کے ایک ایسے علاقے میں لے جاتے ہیں جو ایک اور دیہات کی طرح لگتا ہے۔ یہاں ایک ڈاکو ٹرام کے ڈرائیور اور مسافروں کے گائیڈ کو گولی سے قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن خوش قسمتی سے ڈرائیور اپنی جان بچا کر راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس صورتحال سے ڈاکو پریشان ہوتے ہیں کہ ڈرائیور ان کی مخبری کر سکتا ہے لہٰذا وہ ٹرام کو ایک ہولناک مندر میں لے جاتے ہیں۔ یہ حصہ دراصل مشہور فلم ''ریڈرز آف دی لوسٹ آرک'' کے ایک منظر کی یاد دلاتا ہے۔ اس مندر میں مسافر دیکھتے ہیں کہ ایک بلند چبوترے پر زر و جواہر سے بھرا ایک تابوت رکھا ہوا ہے اور اس کے قریب ہی ایک انسانی لاش بھی پڑی ہے۔ یہ کسی ایسے شخص کی لاش ہے جس نے اس تابوت کے خزانے کو چرانے کی کوشش کی تھی لیکن اس تابوت کی محافظ پراسرار قوتوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ٹرام کے اغواء کنندگان کا ایک ساتھی خزانے کا تابوت دیکھ کر لالچ کا شکار ہو جاتا ہے اور بغیر کچھ سوچے سمجھے چبوترے پر چڑھ جاتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ خزانے کو ہاتھ لگائے چبوترے کے عقب سے دھوئیں کا ایک دبیز بادل بلند ہوتا ہے اور اس شخص کو نگل لیتا ہے۔ اپنے ساتھی کا

یہ انجام دیکھ کر باقی ڈاکو بدحواس ہو کر راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی وقت ٹرام کا ڈرائیور جو قریب ہی کہیں چھپا بیٹھا ہوتا ہے دوڑتا ہوا آتا ہے۔ مسافر خوش ہو جاتے ہیں کہ ٹرام کا ڈرائیور ہی وہ واحد شخص ہے جو ان سب کو اس خوفناک ماحول سے نکالے گا۔ ڈرائیور کے نشست سنبھالتے ہی ٹرام حرکت میں آتی ہے اور کسی نئی منزل کی سمت رواں دواں ہو جاتی ہے۔ ٹرام جب اس دہشت ناک ماحول سے باہر نکلتی ہے تو کچھ ہی دیر کے سفر کے بعد مسافر ڈزنی کے مشہور کردار مکی ماؤس کو دور سے اپنے استقبال کے لیے کھڑے دیکھتے ہیں۔

غرض اس طرح کے کئی ڈرامائی مناظر مسافروں کو دکھائے جاتے ہیں اور ٹرام کے مسافر اس انوکھی، دلچسپ و عجیب، پراسرار دنیا سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جزائر کک

(Cook Islands)

بحرالکاہل پر تیرتے شفاف موتی

جنوبی بحرالکاہل میں 8 بڑے اور 7 چھوٹے پولی نیشن جزائر کا مجموعہ کوک جزائر (Cook Islands) ہے۔ ان جزائر کو بحرالکاہل کے سینے پر تیرتے ہوئے خوبصورت موتیوں سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ چھوٹے بڑے یہ 15 جزیرے بحرالکاہل میں لگ بھگ 20لاکھ مربع کلومیٹر کے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ جزیرے آک لینڈ (نیوزی لینڈ) کے شمال مشرق میں 2600 کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ ان جزائر کا کل رقبہ 290 مربع کلومیٹر (112 مربع میل) اور آبادی صرف 20 ہزار کے لگ بھگ ہے۔

بڑے جزیروں میں آٹیو (Atiu)، منگایا (Mangaia)، ماکے (Mauke)، مٹیارو (Mitiaro)، مانوئے (Manuae)، ٹاکوٹیا (Takutea)، رارو ٹونگا (Rarotonga) اور آئٹوٹا کی (Aitutaki) ہیں۔ اس منفرد اور حیران کن اعداد و شمار رکھنے والے بہشت نما خطے کی اپنی حکومت اور زبان ہے البتہ ہر جزیرے کی ثقافت دوسرے سے یکسر مختلف ہے جو صدیوں سے رائج ہے۔ دنیا بھر میں اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے باعث یہ خطہ سیر و سیاحت کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔ یہاں سالانہ دو لاکھ سیاح آتے ہیں۔

بڑے جزیرے آئٹوٹا کی کا نقشہ زمین پر کچھ اس طرح بنا ہوا ہے جیسے کوئی جیومیٹری

کی مثلث، تین اطراف سے اٹھی ہوئی سمندری چٹانوں کے درمیان بنا یہ خوبصورت ساحلی علاقہ سطح سمندر سے 4 ہزار میٹر بلندی پر واقع ہے۔ آئیٹوٹا کی جزیرے کا پانی اتنا صاف و شفاف ہے جس میں کھڑے ہو کر آپ اپنے پاؤں کی انگلیاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ جزیرے کی سفید چمکیلی ریت جب سورج کی روشنی پڑنے سے چمکتی ہے تو یہ منظر کسی زمین کے بجائے چاند کا کوئی ٹکڑا سا محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح چاندنی راتوں میں اس کے دلکش ساحل اپنی خوبصورتی کے لحاظ سے دنیا کی حسین ترین جگہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ ساحل پر قدرتی طور پر لگے ہوئے پام کے درخت ایسا دلکش منظر پیش کرتے ہیں کہ لوگ یہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ساحل پر کھڑے لوگوں کو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پانی اور زمین ایک ہی سطح پر ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ دور جا کے گہرے بادل پانی میں ڈوبتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

ان جزائر میں بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں جو یہاں کی خوبصورتی اور رومانویت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ عام طور پر موسم خوشگوار رہتا ہے۔ بادل چھائے رہتے ہیں۔ نہ زیادہ گرمی پڑتی ہے اور نہ ہی شدید سردی۔ یہ مقام سیاحت کے حوالے سے جنت نظیر خطے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مقامی حکومت نے یہاں سیاحت کو صنعت کا درجہ دے رکھا ہے۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر چھوٹے چھوٹے باغات بنائے گئے ہیں جنہیں بہت خوبصورت پھولوں اور پودوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ بلند عمارتیں، ریسٹورنٹ اور ہوٹل تعمیر کیے گئے ہیں۔

تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ جزائر آج سے دو ہزار سال قبل ہونے والی زمینی تبدیلی کے باعث وجود میں آئے تھے۔ ان جزائر کی سیاحت سب سے پہلے ہسپانوی اور پرتگالی جہاز رانوں نے کی۔ 1773ء میں برطانوی بحری کپتان جیمز کک نے ان جزائر کو دریافت کیا اور انہیں ''Harvey Islands'' کا نام دیا۔

1823ء میں انگریز مشنری جان ولیمز جو کہ لندن مشنری سوسائٹی کا نمائندہ تھا رارو ٹونگا میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پہنچا۔ 1888ء میں کک جزائر کو برطانیہ نے حاصل کر کے اپنا زیر حفاظت علاقہ قرار دیا اور ان جزائر کو کیپٹن جیمز کک کے اعزاز میں کک جزائر کا نام دیا۔ 1901ء میں یہ جزائر نیوزی لینڈ میں شامل کر دیئے گئے۔

جزائر کک کے مغرب کی جانب ٹونگا (Tonga) اور ساموآ (Samoa) جبکہ مشرق کی

جانب تاہیتی (Tahiti) کے جزیرے ہیں۔ کک جزائر میں پہلا جدید انٹرنیشنل ائیرپورٹ 1970ء میں بنایا گیا تھا۔ آج کل نیوزی لینڈ حکومت ان جزائر سے پانی کے راستے فیری اور دیگر بحری ٹرانسپورٹ چلانے کے ایک بڑے منصوبے پر کام کر رہی ہے۔ یہ منصوبہ مکمل ہونے سے ان جزائر پر آنے والوں کے لیے نہ صرف کک آئی لینڈ بلکہ قریبی ممالک تک بھی رسائی ممکن ہو جائے گی۔

بالی

(Bali)

جزائر شرق الہند (انڈونیشیا) کا ایک خوبصورت جزیرہ

بالی جزیرہ معاشرتی اور ثقافتی اعتبار سے انڈونیشیا کا ایک اہم ترین جزیرہ ہے۔ دنیا میں اگر کسی مقام کو درحقیقت جنت کا نمونہ کہا جا سکتا ہے تو وہ ننھا منا جزیرہ بالی ہے جو جاوا (Java) کے مشرقی کنارے پر پانی سے گھرا ایک چھوٹا اور تنگ قطعہ زمین ہے۔ ہم جنت کے بارے میں جن فطری مناظر کے حسن اور خوبیوں کا ذکر کتابوں میں پڑھتے ہیں اُن میں سے بہت سی چیزیں اس ننھے سے جزیرہ میں موجود ہیں۔ اس کی زرخیز زمین اور چمکیلے سبز جنگلات نے ایسا ماحول پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے یہاں کی تہذیب وتمدن ثقافت و آداب ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ 2243 مربع میل رقبے پر مشتمل جزیرہ بالی اپنے صحت مندانہ حسن اور اعلیٰ ثقافت جس میں موسیقی، ناچ گانا، ڈرامہ اور تعمیر کا فن شامل ہے خاص شہرت رکھتا ہے۔ یہاں بہت سے آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ کی وادی جو جزیرے کے جنوب میں ہے بڑی زرخیز ہے۔ یہاں کے جنگلات میں شیر اور ہرن بکثرت ملتے ہیں۔

مسلم اکثریتی ملک انڈونیشیا میں بالی اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ یہاں ہندو مذہب کو تحفظ دیا گیا ہے۔ تقریباً 7ویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے آباد کار اپنے ساتھ ہندوازم بھی لے کر آئے تھے جبکہ بقیہ سارے انڈونیشیا میں 16ویں صدی عیسوی میں اسلام کا غلبہ ہو چکا تھا۔ 10ویں سے 15ویں صدی تک بالی پر جاوا کے حکمران قابض

رہے۔ 17ویں صدی کے اوائل میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس جزیرہ کے ساتھ تجارت شروع کی۔ چند سال انگریز بھی اس پر قابض رہے۔ تقریباً ایک سو سال سے زائد عرصے تک پرتگالیوں کا عمل دخل رہا۔ 1950ء میں یہ علاقہ آزاد ہوا اور اب انڈونیشیا کا ایک صوبہ ہے۔

بالی کے لوگ جس ہندو ازم کے پیروکار ہیں اس پر زیادہ اثر بدھ مت کا ہے۔ یہاں مصوری، موسیقی اور رقص، روزمرہ زندگی اور مذہبی رسومات سے وابستہ ہیں۔ بالی کو ہزار مندروں کا جزیرہ بھی کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہاں 10 ہزار مندر ہیں۔ آتش فشاں پہاڑ ''اگانگ'' 3142 میٹر (10308 فٹ) اونچا ہے اور بالی کا بلند ترین مقام بھی یہی ہے۔ بالی کے باشندوں کے نزدیک یہ پہاڑ دنیا کا مرکز ہے۔ اس جگہ بالی کا سب سے مقدس مندر ''پورا بیساکھی'' ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے ہر ایک حصہ ہندوؤں کے مقدس دیوتاؤں ''وشنو''، ''سیوا'' اور ''برہما'' کی خوبیوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ان مندروں میں لوگ اپنے مذہبی تہوار جوش وخروش سے مناتے ہیں سال میں جن موقعوں پر تقریبات منعقد کی جاتی ہیں ان میں بدروحوں کو بھگانے کی تقریب، آباؤ اجداد کی روحوں کو ثواب پہنچانے کے لیے دعاؤں کا دن، چاول کی دیوی اور دیگر تمام دیوتاؤں کی سالگرہ کے دن شامل ہیں۔ اس موقع پر دعوتیں کی جاتی ہیں اور رقص ہوتے ہیں۔

بالی کا ہر گاؤں خود کفیل بستی ہے جو سب ایک دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ ہر گاؤں میں ایک انجمن ہے جو مندروں کی دیکھ بھال کرتی اور مختلف تہواروں اور مذہبی رسوم کا انعقاد کرتی ہے۔ بالی کے رقص بہت شاندار ہیں۔ اُن کا سب سے مقبول رقص لیگانگ ہے۔ شوخ لباس، چمکیلا زیور اور گہرا میک اپ کیے تین لڑکیاں اپنی آنکھوں اور جسم کی حرکات وسکنات سے رقص کے دوران ایک ظالم بادشاہ کی کہانی سناتی ہیں جو ایک شہزادی پر ظلم کرتا ہے۔

بالی کے لوگ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت بھی بہت مشہور ہیں۔ ان میں اچھے مصور، لکڑی پر نقش ونگار بنانے والے، پتھر اور ہاتھی دانت کا کام کرنے والے اور جواہرات جڑنے والے موجود ہیں۔ انہیں خوبیوں کی بنا پر ہر سال سینکڑوں سیاح بالی کے قدرتی حسن کو دیکھنے یہاں آتے ہیں۔

❁ ❁ ❁

تبت

(Tibet)

دنیا کی چھت کہلانے والا علاقہ

تبت جنوب وسطی ایشیا کا بلند ترین علاقہ ہے اسے ''دنیا کی چھت'' Roof of the World بھی کہا جاتا ہے۔ یہ برف سے ڈھکے پہاڑوں اور دنیا کے بلند ترین سطح مرتفع پر مشتمل ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ جنوبی تبت سے بلندی کی طرف جاتا ہے۔ (Ka-Erh) کا علاقہ جو کہ مغربی تبت میں ہے دنیا کا بلند ترین علاقہ (Town) خیال کیا جاتا ہے۔ جس کی سطح سمندر سے بلندی 15 ہزار فٹ (4570 میٹر) ہے۔

تبت کے شمال مشرق میں چین، مشرق میں سکم، بھوٹان، نیپال اور بھارت جبکہ مغرب میں کشمیر کا ضلع لداخ ہے۔ یہ سارا علاقہ بلند پہاڑوں اور ایک سرد اور برفیلے سطح مرتفع پر مشتمل ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں کوہ ہمالیہ ہے۔ یہ ایک بلند سطح مرتفع ہے جہاں سے ایشیا کے بڑے دریا نکلتے ہیں جو چین اور پاک و ہند کی طرف آتے ہیں ان میں برہم پترا بنگلہ دیش سے ہو کر خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ تبت میں اسے ''تسانگپو'' کہتے ہیں۔ اس دریا کے شمال میں کئی نمکین جھیلیں ہیں۔ دریائے سندھ، میکانگ، سالوین اور یانگ ژی دریا بھی تبت کی طرف سے آتے ہیں۔

تبت کے علاقے میں وسیع سبزے کے میدان اور جنگلات بھی پھیلے ہیں۔ اس

علاقے میں بارش کم ہوتی ہے۔ اسی لیے کھیتی باڑی صرف دریاؤں کے کناروں کے قریب ہوتی ہے جہاں پھل، جو اور سبزیاں کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں تقریباً 5 ہزار مختلف قسم کے پودے اور درخت اُگے ہیں۔ یاک (Yalk) یہاں کا پالتو جانور ہے۔ اس کے علاوہ ہرن، ٹائیگر، ریچھ، بندر، پانڈا اور گھوڑے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں سینکڑوں جھیلیں اور ندیاں قدرت کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں۔

تبت کا کل رقبہ 12 لاکھ 21 ہزار 600 مربع کلومیٹر (4,71,662 مربع میل) اور آبادی تقریباً 20 لاکھ کے قریب ہے جن میں 96 فیصد تبتی اور باقی چینی ہیں۔ تبت کی تجارت پہلے ہندوستان کے ساتھ تھی مگر جب سے اس پر چین کا قبضہ ہوا ہے یہ تجارت بند ہو گئی ہے۔ 1957ء میں چین نے یہاں ایک سڑک تعمیر کرائی جو چین اور تبت کو ملاتی ہے۔ تبت کا دارالحکومت لہاسہ (Lhasa) ہے۔

7ویں صدی عیسوی کے دوران تبت ایک طاقتور بادشاہت کی شکل میں تھا۔ بھارت کی طرف سے بدھ مت کو یہاں فروغ حاصل ہوا اور لہاسہ شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ 17ویں صدی میں دلائی لامہ تبت کا حکمران بن گیا۔ 18ویں صدی کے شروع میں یہ چین کے کنٹرول میں چلا گیا۔ یہ علاقہ کئی دفعہ چین کے قبضہ میں آیا اور کئی بار آزاد ہوا۔ منگول بھی اس پر قابض رہے۔ 18ویں صدی میں پہلی بار ہندوستان کی برطانوی حکومت نے تبت کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی مگر 1792ء کی گورکھا جنگ کے باعث انگریز اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ 19ویں صدی میں تبت، لداخ (کشمیر) میں شامل کر دیا گیا۔ 1890ء میں سکم نے برطانیہ کے ساتھ الحاق کر لیا۔ 1893ء میں انگریزوں نے وہاں اپنا تجارتی مرکز قائم کیا لیکن تبت کے لوگ اس کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ آخر 1904ء میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کی سربراہی میں پہلا برطانوی فوجی مشن لہاسہ پہنچا۔ جس نے تبتیوں کے ساتھ ایک معاہدہ طے کیا اور انگریز وہاں ایک تجارتی مرکز قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

1906-07ء میں برطانیہ نے تبت پر چین کی اجارہ داری قبول کر لی۔ 1912ء میں تبت نے چین کی مانچو حکومت سے آزادی حاصل کر لی۔ 1913-14ء کی شملہ کانفرنس میں تبت کا ایک حصہ چین کو دے دیا گیا اور باقی آزاد رہا لیکن چین نے اسے قبول نہ کیا۔ مئی 1951ء

کے معاہدہ کی رو سے اسے آزاد کردیا گیا۔ مارچ 1959ء میں تبت کے لوگوں نے چین کے خلاف بغاوت کردی جسے سختی سے دبا دیا گیا اور دلائی لامہ بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوا لیکن پنچن لامہ نے چینی حکومت کو تسلیم کرلیا۔ 1962ء میں میکموہن لائن (1914ء) کی غلط حد بندی کے باعث چین بھارت جنگ ہوئی جس میں بھارت کو بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

تبت ایک روایتی مذہبی بادشاہت بھی ہے جس کا بادشاہ دلائی لامہ کہلاتا ہے۔ چینی کنٹرول سے پہلے تبت پر بدھ راہبوں کی ایک مضبوط حکمرانی قائم تھی۔ دلائی لامہ (Dalai Lama) بدھ مت کا سردار کاہن ہے جو کرہ ارض پر خدا کا مجسم اوتار خیال کیا جاتا ہے۔ تبتی روایت کے مطابق جس وقت کوئی لاما فوت ہونے لگتا ہے تو وہ اپنی وفات سے قبل یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ آئندہ جنم میں کس گھرانے میں پیدا ہوگا۔ ان ہدایات کے پیش نظر اہل تبت بیان کردہ خاندان کے نوزائیدہ بچے کو متوفی دلائی لامہ کی مسند اقتدار پر لا بٹھاتے ہیں۔

بوڈاپسٹ

(Budapest)

دریائے ڈینیوب کے کنارے آباد دو شہروں کا حسین ملاپ

مشرقی یورپ کے ملک ہنگری کا دارلحکومت بوڈاپسٹ دنیا کا حسین ترین شہر ہے۔ یہ یورپ کا دوسرا بڑا شہر ہے جس کی خوبصورتی کا شہرہ چار سو پھیلا ہے۔ 525 مربع کلومیٹر (203 مربع میل) پر مشتمل یہ شہر دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ اس دریا کے مغربی کنارے پر بوڈا کا شہر آباد ہوا اور مشرقی کنارے پر پسٹ، ان دونوں کو ملا کر بوڈاپسٹ کہا جاتا ہے۔ دونوں شہروں کو 1872ء میں آسٹرو ہنگرین شہنشاہ فرانز جوزف کے عہد میں متحد کر کے بوڈاپسٹ کا نام دیا گیا۔

19ویں صدی عیسوی میں دریائے ڈینیوب پر تعمیر کیا گیا خوبصورت پل دونوں حصوں کو آپس میں ملاتا ہے۔ یہ پل بھی ایک شاہکار تعمیر کے طور پر مشہور ہے۔ بوڈاپسٹ کے 20 لاکھ شہری مغرب کی سرمایہ کاری کی بدولت خوشحال اور آسودہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر یورپی سرمایہ کار یہاں آ کر وسیع پیمانے پر نجی کاروبار کرتے ہیں جس کی وجہ کھلی بلیک مارکیٹ ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سے خوبصورت اور حسین لڑکیاں یورپ اور امریکہ کو جسم فروشی کے لیے سپلائی کی جاتی ہیں جو وہاں سے وسیع زرمبادلہ یہاں بھیجتی ہیں۔ اس سلسلے میں بوڈاپسٹ میں ایک وسیع نیٹ ورک قائم ہے۔

بوڈاپسٹ ایک بہت بڑا صنعتی اور ثقافتی شہر بھی ہے۔ یہاں گوتھ (Goths) طرز تعمیر کی بے شمار عمارتیں ہیں۔ بوڈا شہر سرسبز پہاڑیوں پر آباد ہے اور پسٹ کا علاقہ ہموار میدان ہے۔ 1980ء کی دہائی میں ہنگری مشرقی یورپ کا پہلا ملک تھا جس نے کمیونسٹ بلاک سے علیحدگی اختیار کی اور کثیر جماعتی جمہوریت کی طرف سفر کا آغاز کرتے ہوئے ترقی کی منازل طے کیں۔ بوڈا کا قلعہ سب سے اہم مقام ہے جو بڑے بڑے درختوں سے گھری ہوئی ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں بنایا گیا۔ یہ 13ویں صدی کی ایک عظیم یادگار ہے۔ اہم عمارتوں میں رائل پیلس بہت خوبصورت جگہ ہے۔ یہ پیلس ہنگری کی ملکہ ماریہ تھریسیا (80-1740ء) کے لیے تعمیر کیا گیا تھا جو اب ہنگری کی قومی یک جہتی کی علامت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ محل کی منقش چھت اور در و دیوار پر خوبصورت فن پارے بنائے گئے ہیں۔ آج کل اس میں ایک بڑی لائبریری اور میوزیم کے علاوہ کئی قومی ادارے قائم ہیں۔

1242ء میں جب منگولوں نے پسٹ کو تباہ و برباد کیا تو مقامی حکمران بیلا چہارم نے اس کے شہریوں کو بوڈا کے مضبوط قلعہ بند شہر میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ 1490ء میں میتھیو اول کی موت کے بعد بوڈا غیر محفوظ ہو گیا کیونکہ عثمانی ترک یہاں آ چکے تھے۔ وہ 1541ء سے 1680ء تک یہاں قابض رہے۔ 1680ء میں رومن شہنشاہ لیوپولڈ اول نے اسے آزاد کرایا۔ 1703ء کے بعد بوڈا اور پسٹ کو آزاد شہروں کی حیثیت دے دی گئی۔ 1919ء میں یہاں اشتراکی حکومت قائم ہوئی۔ 1920ء میں بوڈاپسٹ کو آزاد ہنگری کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران 1944ء میں جرمن فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا لیکن صرف چار ماہ بعد ہی روسی فوجیں یہاں قابض ہو گئیں۔ جنوری 1949ء میں یہاں جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ اگست 1949ء میں کیمونسٹوں نے روسی فوج کی مدد سے اقتدار سنبھال لیا۔

❁ ❁ ❁

اریزونا

(Arizona)

دنیا میں ایک منفرد مجسمہ نما جنگل

امریکہ میں واقع مشہور زمانہ مجسمہ نما جنگل اریزونا دور سے دیکھنے میں جنگل نظر نہیں آتا۔ اریزونا کے شمال مشرقی اونچے میدان اور سطح مرتفع پر واقع 146 مربع میل رقبے پر مشتمل اس جنگل میں کوئی درخت اور سبزہ نظر نہیں آتا۔ یہاں جو ''ایکاڈکا'' پودے نظر آتے ہیں وہ کیکٹس یا پھر ایک قسم کا سفید پھول والا سوسن نما پودا لگا ہے جو دھوپ کی تیز شعاعوں کو برداشت کر لیتے اور زندہ رہتے ہیں۔

درحقیقت یہ مجسمہ نما جنگل کسی زمانے میں ایک ہرا بھرا جنگل ہوتا تھا۔ 20 کروڑ سال پہلے یہ اونچا بنجر صحرا اور ایک بہت وسیع نشیبی میدان تھا جو سرسبز درختوں، جھاڑیوں اور بیلوں سے اٹا پڑا تھا اور اس کے اطراف میں پہاڑیوں پر صنوبر کے درخت لہلہاتے تھے۔ صدیاں گزرتی گئیں۔ مختلف قدرتی آفات کے نتیجے میں یہ درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ پھر سیلاب کے تندوتیز دھارے ان درختوں کو بہا کر اس نشیبی میدان کے درمیان لے آئے۔

جو شخص بھی ایک مرتبہ اس مجسمہ نما جنگل میں داخل ہوتا ہے وہ اس منفرد مظاہر قدرت سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ مختلف معدنیات پر مشتمل سخت چٹانیں جن کے اطراف میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے درخت پڑے ہیں جنہوں نے مجسمہ نما لکڑی کی شکل اختیار کر لی

ہے۔ یہ دیو پیکر تنوں کی جسامت سے لے کر چھوٹے ٹکڑوں تک کی شکل میں ہیں اور یہ انوکھے ملے جلے ٹکڑے ہر رنگ میں چمکتے نظر آتے ہیں۔ نارنجی، سرخ، زرد رنگ کے یہ مجسمہ نما درخت عجیب بہار دکھاتے ہیں۔

اصل میں یہ سارا علاقہ چھ جنگلات پر مشتمل ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خوبصورت رین بو فارسٹ ہے۔ جہاں زیادہ تر تنے 98 فٹ لمبے ہیں اور ان تنوں میں قوس و قزح کے سات رنگ نظر آتے ہیں۔ یہ تنے جہاں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں ان مقامات پر نظر ڈالیں تو یوں لگتا ہے جیسے یہ کوئی قدیم انڈین گاؤں ہے جس کے مکان ان مجسمہ نما لکڑی کے ٹکڑوں سے بنائے گئے ہیں۔ اس علاقہ کی ایک اور دلچسپ چیز ایگٹی کا پل ہے۔ ایک 98 فٹ لمبے تنہا تنے سے یہ پل بنا ہوا ہے۔ اس پل کے دونوں سرے ریت کے پتھر میں دفن ہیں۔

اس مجسمہ نما جنگل کے شمالی سرے پر رنگین صحرا ہے۔ یہ ایریزونا کا ایک اور منفرد قدرتی منظر ہے۔ یہاں متعدد اور مختلف رنگوں کے پتھر اور مٹی سے بنی پیچیدہ تہوں کے درمیان بکھرے ہوئے ہیں۔ جیسے جیسے سورج اپنا رخ تبدیل کرتا ہے۔ اس رنگین صحرا کے رنگ اور اشکال میں بھی تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اپنے عجیب و غریب حسن کی وجہ سے یہ مجسمہ نما جنگل اور رنگین صحرا قدرت کے حسین ترین مناظر میں سے ایک ہیں۔

تائی پیہہ۔ 101

(Tai Pei 101)

2006ء میں دنیا کی بلند ترین عمارت

موجودہ دور میں دنیا کی بلند ترین عمارت کا اعزاز تائیوان کے دارلحکومت تائی پیہہ میں واقع بلڈنگ ''تائی پیہہ 101'' کو حاصل ہے۔ اس عمارت کا افتتاح 13 نومبر 2003ء کو تائیوان کے صدر چن شوئی بیان نے کیا۔ اس کی بلندی 508 میٹر (1668 فٹ) ہے اور اس کی 101 منزلیں ہیں۔ اسی لیے اسے ''تائی پیہہ 101'' کا نام دیا گیا۔ اس سے قبل ملائیشیا کے ''پیٹروناس ٹاورز'' کو بلند ترین عمارت کا اعزاز حاصل تھا۔

دور سے دیکھیں تو یہ عمارت شیشے اور اسٹیل سے بنی بانس کا ایک درخت محسوس ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بانس کی بیرونی سطح گول ہوتی ہے اور یہ چوکور ہے۔ اس عمارت میں دنیا کی سب سے تیز رفتار لفٹیں لگائی گئیں ہیں جو ایک منٹ میں 1010 میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہیں اور 5ویں منزل سے 89 منزل پر 39 سیکنڈ میں پہنچا سکتی ہیں۔ ایک ارب 80 کروڑ ڈالر کی لاگت سے تعمیر ہونے والی اس بلند ترین عمارت کی افتتاحی تقریب میں ایک طرف ایک اوپیرا گروپ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور دوسری طرف تائیوان کے صدر چن شوئی بیان، تائی پیہہ کے میئر فیتہ کاٹ کر عمارت کی افتتاحی رسم ادا کر رہے تھے۔

''تائی پیہہ 101'' ملائیشیا کے پیٹروناس ٹاورز سے 56 میٹر زیادہ بلند ہے۔ مغربی

ذرائع ابلاغ کے دعوے کے مطابق تائی پیہ 101 دنیا کا بلند ترین ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ یہ اعزاز ٹورنٹو (کینیڈا) کے سی این ٹاور کو حاصل ہے۔ تاہم تائی پیہ کے اس تعمیراتی شاہکار کو دنیا کی بلند ترین عمارت کا درجہ ضرور حاصل ہے کیونکہ عمارت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ اس میں منزلیں ہوں یا اسے رہائشی، تجارتی یا صنعتی مقاصد کے لیے بنایا گیا ہو۔ بانس نما اس عمارت کی ملکیت تائی پیہ فنانشل سینٹر کارپوریشن کے پاس ہے۔

چینی باشندے بانس کو بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ مضبوط اور لچکدار ہونے کے علاوہ اندر سے کھوکھلا بھی ہوتا ہے اور چینی فلسفہ کے مطابق ہمیں بھی اندر سے نرم اور رحمدل ہونا چاہیے۔ عمارت کے مالکان کا دعویٰ ہے کہ عمارت اس انداز سے ڈیزائن کی گئی ہے کو برس ہا برس تک زلزلے کے جھٹکوں سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ ایک محفوظ ترین عمارت ہے۔ کنکریٹ کے 380 ستون اسے سہارا فراہم کر رہے ہیں جس میں سے ہر ستون کو زمین کے اندر 80 میٹر کی گہرائی تک اتارا گیا ہے۔ 92ویں منزل سے ایک بہت بڑا دھاتی گولا جھول رہا ہے جس کا وزن 606 میٹرک ٹن ہے اور اسے طلائی رنگ دیا گیا ہے۔ اس ''ڈیمپر'' کا مقصد شدید سمندری طوفان یا طوفانی ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے عمارت کو محفوظ رکھنا ہے۔

❁ ❁ ❁

برج العرب

(Burj Al-Arab)

دنیا کا بلند ترین ہوٹل

دوبئی کا سیون سٹار ہوٹل ''برج العرب'' جو کہ ساحل سمندر پر واقع ہے اپنے جدید طرز تعمیر اور ڈیزائن کی وجہ سے دنیا کے تمام بڑے بڑے ہوٹلوں سے مختلف ہے۔ اس کی تین منزلیں سمندر کے اندر ہیں اور اس ہوٹل کی بلندی 180 میٹر ہے۔ یوں برج العرب دنیا کا بلند ترین ہوٹل ہے۔ یہ ہوٹل ساحل سمندر پر 280 فٹ کے مصنوعی جزیرے پر تعمیر کیا گیا ہے۔

برج العرب 27 منزلہ ہوٹل ہے اور اس کی ہر منزل پر 27 کمرے ہیں۔ آخری منزل بے حد خوبصورت منظر پیش کرتی ہے۔ یہ ہوٹل دوبئی کے ہر کونے سے دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر جبل علی کی طرف جاتے ہوئے سب سے پہلی نظر برج العرب پر ہی پڑتی ہے۔ برج العرب کی بادبان نما عمارت سمندر کے نیلے پانیوں کے بیچ سینہ تانے ہوئے عقاب کی مانند کھڑی ہے۔ یہاں چمن زار کے دائیں جانب زرد رنگ کے پہاڑوں کے نیچے پرانی طرز کا پراسرار دروازہ ہے۔ جس پر انگریزی حروف میں ''World Wild Wadi'' لکھا ہوا ہے۔ اس میں سوز و واٹر پارک کی مانند جھولے، سلائیڈز، پانی کے کھیل اور فوارے ہیں۔

ہوٹل کی لابی میں رقص کرتے ہوئے فوارے ہیں۔ یہ سب فوارے کمپیوٹرائزڈ ہیں جو میوزک کے ساتھ ساتھ ناچتے ہیں۔ ایک فوارے سے نکلنے والی پانی کی دھار دوسرے

خاموش فوارے میں اس قدر پابندی کے ساتھ گرتی ہے کہ مجال ہے پانی کا ایک قطرہ بھی فوارے کے سوراخ سے باہر گرے۔ ہر فوارے میں سے نکلنے والی دھار ہر مرتبہ رنگ بدلتی ہے۔ رات کے وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بے شمار رنگین آبی پریاں محو رقص ہوں۔ ان فواروں کے ساتھ ساتھ دونوں جانب سیڑھیاں ہیں جن پر دیدہ زیب قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر سفید موٹا شیشہ ہے جس کے پیچھے پانی میں خوبصورت اور رنگین مچھلیاں تیرتی ہیں۔

برج دبئی

(Burj-Dubai)

دنیا کا نواں عجوبہ

دنیا میں بلند ترین عمارت تعمیر کرنے کا امتیاز حاصل کرنے کی دوڑ ابھی ختم نہیں ہوئی لیکن تعمیراتی دنیا میں اس حوالے سے ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ زیادہ دیر کسی عمارت کے پاس یہ اعزاز نہیں رہتا۔ ایک ایسی ہی عمارت دبئی میں زیر تعمیر ہے جسے ''برج دبئی'' کا نام دیا گیا۔ اس کی اصل اونچائی ابھی ایک راز ہے لیکن توقع کی جا رہی ہے کہ یہ کم از کم 705 میٹر (2313 فٹ) بلند ہو گی۔

یہ حقیقت ہے کہ دبئی کے عرب شیخ حکمرانوں نے چند عشروں میں اس شہر کو تجارتی، معاشرتی اور تعمیراتی لحاظ سے نہ صرف مشرق وسطیٰ بلکہ دنیا کا ایک بڑا مرکز بنا دیا ہے۔ یہاں کئی شاندار تعمیراتی منصوبے پایہ تکمیل تک پہنچے ہیں مثلاً 11 کلومیٹر لمبی دبئی لنگر گاہ (Marina) جو انسان کی بنائی ہوئی سب سے بڑی لنگر گاہ ہے۔ ''جزیرہ پام'' (Palm) جو انسان کے ہاتھوں بنایا ہوا سب سے بڑا جزیرہ ہے اور دنیا کا سب سے بڑا اور پہلا سیون سٹار ہوٹل برج العرب۔ اب دبئی کے تاج میں ایک اور قیمتی ہیرے کا اضافہ ہونے والا ہے یعنی برج دبئی۔ یہ عمارت ابھی زیر تعمیر ہے لیکن 2008ء میں مکمل ہونے کے بعد یقیناً دنیا کا نواں عجوبہ شمار ہو گی۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ برج دبئی کے تعمیر کنندہ اس بات کو خفیہ رکھے ہوئے ہیں کہ اس

کی بلندی کتنی ہوگی مگر ایک بات واضح ہے کہ 2008ء میں مکمل ہونے کے بعد یہ دنیا کی بلند ترین عمارت ہوگی۔ حتیٰ کے زمین پر موجود بلند ترین تعمیراتی ڈھانچہ امریکی قصبے ویل (ساؤتھ ڈکوٹا) میں موجود ٹرانسمیشن ٹاور بھی اس سے پست ہوگا جس کی اونچائی 619 میٹر (2063 فٹ) ہے۔ مزید براں اس کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ گہرائی میں کھودی جائیں گی تاکہ نئی منازل بنانے کی ضرورت ہو تو بنائی جا سکیں۔

ماہرین نے برج دبئ کی بلندی کے سلسلے میں مختلف اندازے لگائے ہیں۔ یہ عمارت کم از کم 705 میٹر (2313 فٹ) اور زیادہ سے زیادہ 900 میٹر (3000 فٹ) اونچی ہوگی۔ برج دبئ کثیر الاستعمال عمارت کے مرکز کے طور پر ڈیزائن کیا گیا ہے جس میں کمرشل، رہائشی، شاپنگ، تفریح کی سہولیات بڑے پیمانے پر دستیاب ہوں گی۔ اس پورے منصوبے کا تخمینہ 8 ارب امریکی ڈالر لگایا گیا ہے۔

آدھا میل اونچی یہ عمارت شیشے، المونیم، کنکریٹ، سیمنٹ، فولاد اور سٹیل کے ذریعے بنائی جائے گی۔ برج دبئ کا کل رقبہ 5 لاکھ مربع میٹر ہوگا۔ یہ تعمیراتی منصوبہ شہر کی سب سے مشہور سڑک شارع زید پر زیر تکمیل ہے۔ اس منصوبے کے تحت ایسا علاقہ بھی تعمیر کیا جائے گا جہاں قدیم عربوں کی رہائشی، معاشی اور ثقافتی زندگی کی جھلکیاں سیاحوں کی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ برج دبئ کے ڈویلپرز ''عمار پراپرٹیز'' کے خیال میں اس عمارت کی تعمیر سے ایک بار پھر مشرق وسطیٰ کے پاس یہ اعزاز آ جائے گا جہاں 38 صدیوں تک مصر کے عظیم جیزا اہرام کی شکل میں اپنے وقت کا بلند ترین تعمیراتی ڈھانچہ موجود رہا ہے۔ برج دبئ میں قائم ہوٹل کے پاس نیچے کی 37 منزلیں ہوں گی۔ 45ویں سے 108ویں منزل تک 64 منزلوں میں 700 پرائیوٹ اپارٹمنٹ ہوں گے۔ باقی منزلوں پر تجارتی دفاتر اور سوئٹس ہوں گے۔ سب سے بلندی پر مواصلاتی آلات بھی لگائے جائیں گے۔

برج دبئ کی تعمیر کا ٹھیکہ لینے میں سات عالمی کمپنیوں نے دلچسپی ظاہر کی ان میں بن لادن گروپ بھی شامل تھا لیکن سام سنگ، بیکس اور عرب ٹیک پر مشتمل ایک کنسورشیم نے ٹھیکہ حاصل کر لیا۔ برج دبئ کا خاکہ شکاگو کے ایک ادارے سکڈ مور اوونکس اینڈ میرل ایل ایل پی نے تیار کیا۔ عمارت کا خاکہ بناتے ہوئے مشرق وسطیٰ کے تاریخی و تہذیبی اثرات بھی مدنظر

رکھے گئے۔ ٹاور کی بنیاد اور اس کے خطوط (جیومیٹری) علاقے میں ملنے والے ایک صحرائی پھول کی چھ پنکھڑیوں جیسے ہیں۔ درمیان سے ابھرتے ٹاور کا منظر بڑا دلکش نظر آتا ہے۔ 160 منازل والی یہ عمارت بنیادی ڈھانچے کے گرد مرحلہ وار تعمیر کی جائے گی۔

بلندی پر چونکہ ہوا بہت طاقت سے چلتی ہے۔ اس کی قوت کم سے کم کرنے کے لیے انجینئروں نے برج دبئی کا مخصوص خاکہ تیار کیا ہے۔ دراصل ہوا بلند عمارت سے ٹکراتے ہی اس کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ تب مرغولے جنم لیتے ہیں جن کے باعث زمین پر بھی تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ چونکہ برج دبئی اوپر سے لمبوترا اور نیچے سے چوڑا ہے لہٰذا اس پر ہوا کے اثر انداز ہونے کا امکان کم سے کم ہو گیا ہے اور وہ مرغولے بھی نہیں بنا سکے گی۔

❁ ❁ ❁

کتابیات وحوالہ جات

1- انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا (Encyclopedia Britanica)

2- دنیا کے سات عجائبات (Seven Vendors of the world)

3- دنیا کے قدیم عجائبات (غلام السیدین قریشی)

4- تعمیراتی معجزے (راشد بخاری)

5- انسائیکلوپیڈیا انکارٹا (Encyclopedia Encarta)

6- ورلڈ بک (World Book)